تین عالمی جنگوں کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومتِ دجال کا قیام، جدید سامراجی
اصطلاحات اور انسانی تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے ظلم و بربریت پر لکھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

دجال

# دجال

جلد اوّل

اسرار عالم

مصنف: اسرار عالم

نائن الیون کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومت دجال کا قیام
، جدید سامراجی اصلاحات اور انسانی تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی امیزش سے ظلم و
بربریت پر لکھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

# دجّال

جلد اوّل

مصنف

اسرار عالم

**ادارہ تحقیقات**

فسٹ فلور یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

فون: 03334380927

Copyrighted material

Copyright © Author
حق اشاعت محفوظ ہے

# دجال

مصنف: اسرار عالم

DAJJAAL

By Asrar Alam

طبع اول: اگست ۲۰۰۰ء

Published by
DAR -AL- ILM, NEW DELHI

قیمت: [redacted] روپے

Distributor
Danish Book Distributors
17/3/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Patauli House,
Darya Ganj, New Delhi-110002 Ph: 3289265

## مصنف کی تصنیف

- اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا واحد علاج
- عالم اسلام کی موجودہ صورت حال
- ایٹمی قوت کی حامل مسلم حکومتوں کا تحفظ اور ان کا طریقہ
- عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال
- عالم اسلام کی دفاعی صورت حال
- جہاد
- عالم اسلام کی تعلیمی صورت حال
- یاجوج وماجوج کا ایک نیا روپ
- عالم اسلام کی گمبھیر مقصدی صورت حال

# فہرست: دجال جلد اول


پیش لفظ ۸

مقدمہ ۹

**باب اول** ضرورت عجالہ ۱۱

پہلا سبب: سلامتی کونسل ۱۱

دوسرا سبب: عیسائی یہودیت کے تخریبی عزائم ۴۱

تیسرا سبب: یہودی تخریبی عزائم ۷۳

چوتھا سبب: عالم اسلام پر ہمہ جہت حملہ ۷۹

پانچواں سبب: آئمہ مضلین کا تسلط ۸۵

**باب دوم** ستارہ وصلیب ۱۲۷

حصہ اول: یہودیت ۱۲۸

■ حضرت مسیح کی آمد ۱۲۸

■ دجال کا ظہور ۱۳۳

■ حضرت مسیح کے ذریعہ اقامت نظام عدل ۱۳۶

حصہ دوم: عیسائیت ۱۴۲

■ حضرت مسیح کی آمد ۱۴۲

■ دجال کا ظہور ۱۴۸

■ خاتمۂ دجال اور اقامت نظام عدل ۱۵۳

حصہ سوم: حادثہ، سازش اور المیہ ۱۶۴

**باب سوم** حقیقت دجال ۱۷۷

تین حقائق ۱۷۸

■ حقیقت اول : اللہ تعالیٰ اور کائنات ۱۷۹
پہلا مدرج : عالم اصل ۱۷۹
دوسرا مدرج : عالم بریۃ ۱۸۲
تیسرا مدرج : عالم عصر ۱۸۳
چوتھا مدرج : عالم اشیاء ۱۸۶
■ حقیقت دوم: ابلیس اور شیاطین ۱۹۰
● مخزن نور ۱۹۰
● مخزن نار ۱۹۰
● مخزن ارض ۱۹۰
● الملک ۱۹۱
● الجن ۱۹۱
● الآدم ۱۹۱
● الملائکۃ ۱۹۶
● انواع نور ۲۰۰
● بابل کے دو ملک ۲۰۰
● دجال کے ساتھ دو فرشتے ۲۰۱
● انواع نار ۲۰۳
● ابلیس ۲۰۶
● الشیطان ۲۲۱
● ذریۃ الشیطان ۲۲۴
● قبیلۃ الشیطان ۲۲۵
● جنود ابلیس ۲۲۵
● وآخرین منہم ۲۲۶

- شیاطین جن ۲۲۶
- شیاطین انس ۲۲۸
- ذریات شیطان ۲۲۸
- قرین شیطان ۲۲۹
- اخوان شیطان ۲۲۹
- حشود شیطان ۲۳۰
- پادشاہ بادشاہ ۲۳۰
- شیطان کبیر ۲۳۱
- شیاطین مجاہد ۲۳۱

■ حقیقت سوم : معرکہ خیر و شر ۲۳۳
- آغاز ۲۳۳
- طینت ۲۳۹
- عداوت کائنات کی حقیقت ۲۵۱
- عالم خلق ۲۵۲

باب چہارم معرکہ خیر و شر کی تاریخ
- مرحلہ اول : آدم قدیم ۲۶۱
- مرحلہ دوم : آدم و حوا ۲۶۲
- مرحلہ سوم : آدم و حوا و ابلیس ۲۸۰
- پہلا دور : آدم کے دو بیٹوں کا دور ۲۸۰
- پہلا عصر عداوت قاتل ۲۸۱
- دوسرا عصر عداوت قاتل ۲۸۳
- دوسرا دور : حضرت شیث علیہ السلام ۲۸۸
- تیسرا دور : حضرت ادریس علیہ السلام ۲۹۰

■ مرحلہ چہارم : ابلیس کا مخلوق البشری دیوہیکل حیوانی قوتوں

کے ذریعہ حملہ اور ارضی جنگ ۲۹۳

● حضرت اور کیں علیہ السلام ۲۹۳

● فساد عظیم ۲۹۷

● فساد عظیمہ ۲۹۷

● فساد طبع ۲۹۸

● زلازل اور آفات ۲۹۹

● جوع ۳۰۱

● نقص ۳۰۲

● وبا ۳۰۳

● فقر ۳۰۳

● عسرت ۳۰۳

● زلازل اور آسمان ۳۰۵

● حضرت آکفل ۳۰۸

● داع اللہ ۳۰۹

● ذوالکفل ۳۰۹

● ذوالقرنین ۳۱۲

● ذوالقرنین اول: ۳۱۷

● وقت اور زمانہ ۳۱۸

● وسعت ۳۲۰

● مقصد اور مہم ۳۲۱

● ایک استدلال ۳۲۳

● قوم نوح کا قتل طوفان ۳۲۸

● مرحلہ اول: فساد عظیم ۳۳۰

+ فساد نسل ۳۳۰

+ فساد علم ۳۳۱

+ ذہنی فسادات ۳۳۲

● مرحلہ دوم: تکرار ۳۳۳

● مرحلہ سوم: کل تباہی ۳۳۴

+ انجماد فساد نسل ۳۳۶

+ انجماد فساد علم ● ۳۳۶

+ آدم اور تصویر آدم پر اثرات ۳۳۹

● قوم نوح: مابعد طوفان ۳۴۱

+ دفاع براعظم

+ بحال آدم

■ مرحلہ ششم: ابلیس کے تہذیبی حملے کا دور ۳۴۵

+ آدمی پہلو ۳۴۵

+ ابلیسی پہلو ۳۴۶

● پہلا تہذیبی معرکہ: عاد ۳۴۸

● دوسرا تہذیبی معرکہ: ثمود ۳۵۵

● تیسرا تہذیبی معرکہ: قوم لوط ۳۶۴

● چوتھا تہذیبی معرکہ: قوم شعیب ۳۷۴

+ ابلیس کے تہذیبی معرکے کا جائزہ ۳۸۵

۳۹۹_۳۹۰


○○○

Copyrighted material

# پیش لفظ

حامداً ومصلیاً

یہ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی امت ہی نوع انسان میں وہ آخری امت ہے جو شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ امت تاریخ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا: عنقریب قومیں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوے دیں گی جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوے دیتے ہیں۔ (ابوداؤد و بیہقی)

اس اندوہناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ ــــ جو دنیا کا واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کامل علم (ما کان وما ھو کائن وما یکون) دیا گیا ــــ آج حیران اور ہکا بکا کھڑا رہ گیا ہے اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثار قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار تیز تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی ہار ٹوٹ جائے اور کیے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن و احادیث مبارکہ کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جاتا اور آئندہ کے لئے خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرض منصبی کو کما حقہ سرانجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انہی امور کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔

# مُقدّمہ

"یا ساری الخیل" کہاں چل کی آمد آمد ہے؟" کی اشاعت اول (مئی ۱۹۹۹ء) سے اس کی طبع ثالث (فروری ۲۰۰۰ء) تک آتے آتے یہ واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ روئے ارض اور بوائے ارض میں تبدیلیاں اتنی تیز رفتار، بنیادی اور انقلابی ہو چکی ہیں کہ یہ کتاب ایک تدوین کے بجائے اب تاریخ کا حصہ ہو چکی ہے۔ جب کہ امت کے خواص کی حالت یہ تھی کہ اس وقت تک ایک نہایت قلیل تعداد ہی اس کے مندرجات سے باخبر ہو سکی تھی اور وہ بھی اہل علم ہی کے تبصرے یا تو اس مواد کو موصول ہوئے تھے یا کسی حلقے میں شائع ہو سکے تھے۔ جہاں تک ارباب حل و عقد کی بات ہے تو ان کے آثار کم ہی نمایاں تھے کہ وہ اپنے لادینی اور مغرب سے مستعار مفاہیم سے کنارہ کش ہو کر حالات و حوادث کی اس تبدیلی کے تناظر میں امت کی بقا کے لیے کماحقہ اقدام کے لیے تیار ہو رہے ہوں۔ فروری ۲۰۰۰ء کے وسط تک آتے آتے یہ بات پوری طرح آشکار ہو چکی تھی کہ اب حالات کروٹ بدل گئے ہیں اور "یا ساری الخیل" میں بیان ہونے کے امکانات (صفحات ۲۰۶ تا ۲۰۸) کا اظہار کیا گیا تھا وہ اب مستقبل کے خطرے نہیں بلکہ حال کا تجزیہ بن چکے تھے۔ علاوہ ازیں اب تبدیلیوں کی صورت اور اس کی اصولیات میں بھی انقلابی تبدیلی آ چکی تھی۔ جنہیں اب "یا ساری الخیل" کی سطح پر لا کر سمجھنا ضروری ہو چکا تھا۔

حوادث کی یہ رفتار کیفیت تھی جو اس کی متقاضی ہوئی کہ آئندہ صورت حال کو پیش نظر رکھ کر جلد کوئی تجزیہ پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی کوشش ایک غار کی صورت ہی لے سکتی تھی۔ اب اس بات کا اندیشہ صاف نظر آ رہا ہے کہ جیسے جیسے ہم قیامت کی طرف بڑھ رہے ہیں حالات کی تبدیلی اور حوادث کے رونما ہونے کی رفتار بہت تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں ایسی نوبت آ سکتی ہے کہ ایسے کسی غار کے پیش کرنے کی صورت بھی باقی نہ رہ جائے۔ کاش امت کی یہ بے حسی اور آنکھ مچولی جلد ختم ہو جاتی اور بالعموم عامۃ المسلمین اور بالخصوص اہل حل و عقد باطل کی بھلی کا ایندھن بننے یا اس کے بچھڑے ہوئے سازوں پر رقص کرنے کے بجائے اس کردار کے ادا کرنے میں اس قلیل گروہ کا ساتھ دیتے جس کی کامیابی ہی نوع انسان

کی کامیابی ثابت ہوگی اور یہ وہی گروہ ہے جس کے بالآخر کامران و بامراد ہونے کی بشارت آنحضور ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین علی من ناواهم حتی یقاتل آخرهم المسیح الدجال (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر جہاد کرے گا اور جو اس سے دشمنی کریں گے اس پر غالب آتا رہے گا یہاں تک کہ وہ آخری گروہ بھی ہوگا جو مسیح دجال کے خلاف جہاد کرے گا۔

اجمالے کی ضرورت مصنف کو مجبور کر رہی ہے کہ اس تحریر میں دقیق نظری یا علمی مباحث سے حتی الوسع گریز کیا جائے، صرف اگر بہ حوالہ درج کیے جائیں اور تفصیل پر اجمال کو ترجیح دی جائے۔ ان سارے امور اور عنوانات سے جن کا یہاں ذکر ہوگا تفصیلی علمی اور فکری بحثیں ثابت و فاضل "عالم اسلام کی منتخبی اور مقصدی صورت حال" میں ہوگی۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ایسے تمام مباحث، نظریات، نزاعات اور تعبیرات پر علمی بحث اور ان کی تقریر بھی ـــــ جن کا تعلق اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ یا اصول تاریخ سے ہے ـــــ اسی سلسلے میں ان شاء اللہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

اسرار عالم

# باب اوّل

## ضرورت عجالہ

"یارکی انجیل" کیا دجال کی آمد آمد ہے؟ مئی سنہ ۱۹۹۹ عیسوی میں جب اشاعت ہوئی تو وہ خود ایک شدید بحرانی صورت حال کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی تعجب خیز حوادث کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو اساسی طور پر بے حد خطرناک اور انقلابی تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دوسرے فرض پر ایسے سنگین حالات تشکیل پانے لگے انہوں نے صورت حال کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ صورت حال کی یہ تبدیلی عجیب اور ناقابل یقین حوادث کا پیش خیمہ تھی جن کے دور رس نتائج سامنے آتے اور ان کا براہ راست اثر امت مسلمہ پر پڑتا۔

حوادث کے اس انقلابی سلسلے میں چار امور نہایت درجہ اہم تھے انہوں نے اس عاجز کو مجبور کر دیا کہ اب حالات کا نہ صرف یہ کہ از سر نو جائزہ لیا جائے بلکہ اس میں وہ امور بھی بالتفصیل زیر بحث لائے جائیں جنہیں اب تک شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حالات کی نزاکت نے تجزیے کے عمل کی ضرورت بڑھا دی اس سے احتراز کے لیے ضروری ہے کہ ان اسباب اور ان کے تناظر کا بھی ذکر کر دیا جائے جو اس تصنیف کا سبب ہوئے۔

### پہلا سبب : سلامتی کونسل

اس تعلق سے پہلا سبب امریکہ اور برطانیہ کا اقوام متحدہ کے تعلق سے بالعموم اور سلامتی کونسل کے تعلق سے بالخصوص وہ تجزیہ کر دینے والا فیصلہ جس کے نفاذ عمل پر پوری دنیا کے ۱۹۹۹ء کے اواخر میں واضح طور پر ابھرنے لگے تھے لیکن اس کی حقیقت اپریل ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئی۔

امریکہ اور برطانیہ کا وہ تجزیہ کن فیصلہ تھا ـــــ جو کہ اور جاپان جیسے ملکوں کے مقابلے میں سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کے لیے دنیا کے ایک ملک کا انتخاب ـــــ عالمی دنیا میں

کی تاریخ میں یہ ایک غیر معمولی فیصلہ ہے جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اقوام متحدہ کی تشکیل کے حقیقی پس منظر سے واقفیت رکھتے ہوں۔ یہ کہنا کسی اعتبار سے غلط نہ ہوگا کہ اقوام متحدہ کی چھیاسی سالہ تاریخ میں یہ سب سے بڑا اور دور رس فیصلہ ہے۔ ابھی اس فیصلے کو پوری طرح سامنے آنے اور زیر عمل ہونے میں مزید چند ماہ لگیں گے تاہم یہ فیصلہ چونکہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اعلیٰ ترین سطح پر کیا گیا ہے اس لیے اب اس میں کسی ردوبدل کا امکان نہیں اور اس کے دور رس نتائج کا ظہور عین ممکن ہے کہ چند ہی مہینوں میں شروع ہو جائے۔

دراصل یہ وہی فیصلہ تھا جس کے کر لینے کے بعد امریکی صدر مسٹر گلنٹن کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ وہ متحدہ لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے اور اس جائزے میں رنگ بھرنے کے لیے ہنولی ایشیا کا دورہ کریں۔ چنانچہ امریکی صدر کے حالیہ دوروں کی تاریخ میں شاید پہلی بار کسی امریکی صدر نے اس طرح کے اہتمام کے ساتھ کسی خطے کا دورہ کیا اور جیسا کہ موجودہ صدر امریکہ مسٹر گلنٹن نے مارچ ۱۹ تا ۲۵ سن ۲۰۰۰ء میں جنوبی ایشیا کے تین ملکوں کا دورہ کیا۔

چونکہ یہ دورہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے آئندہ دنیا پر دور رس اثرات مرتب ہوتے جا رہے ہیں اس لیے اس کے حقیقی تناظر کا جائزہ لیے بغیر اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

کیا اقوام متحدہ (U.N.O) حکومت دجال کی پہلی باضابطہ شکل ہے۔ جس کے قیام کے لیے مسیح دجال کے ہراول دستے گذشتہ چار سو سال سے کوشاں تھے۔ خیر، امن، خوشحالی اور انسان دوستی کے دلچسپ پردوں میں اقتصادی کے دجل کو اطالوی تاجر یہودی دانشور عزریہ دی روسی (Azarish de' Rossi) نے اپنی کتاب میور عینام (Meor Enayim) میں یوں بیان کیا ہے:

> "دنیا کی تمام قوموں کو جان لینا چاہیے کہ ہم ہر نسل کے بچے کھچے لوگ بڑی حد تک ہر جگہ پر ہیں۔ ہمارے آقا ہمارے اوپر ایک (NATO) کی روایت کی رو سے ان کے پابند ہیں کہ اس ریاست کے لیے جو ہم پر حکومت کر رہی ہے اس پر ہمارے لیے دعا کریں۔ کسی بھی عہد سے زیادہ اس موجودہ وقت میں جب کہ ہمارے گناہوں کے سبب ہر چہار طرف بکھیر دیے گئے ہیں دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے دعا کریں۔ اور اس کی کہ کوئی کسی دوسرے پر حکومت نہ کرے کہ وہ ان کے دلوں سے ہر طرح کے خوف اور

نفرت کو دور کردے اور اس کی جگہ اس دنیا میں امن کی شجر کاری کردے: اس لیے کہ ان قوموں کے امن میں ہمارے لیے بھی امن ہے۔"

(Meor Enayim: Azariah de' Rossi, Montua, 1573(A.D), P.169b) [1]

یہودیوں کو عقائدی ولولے سے پر کردینے اور قلبی اطمینان سے آسودہ کردینے کے لیے ابلیس نے انہیں دینی جواز کی فراہمی کی۔ چنانچہ ساری دنیا کے یہودی مسیح دجال کی آمد سے قبل اس کے لیے ایک عالمی حکومت کے قیام کی کوشش، اور ہیکل سلیمانی کی از سر نو تعمیر کے دینی جذبے کے تحت کام کرنے میں سرگرم ہوگئے۔ انہیں اس کا قطعاً احساس نہیں کہ ایسا کر کے وہ اللہ کی رضا کی تکمیل کے بجائے طاغوت اور دجال کے لیے سرگرم ہیں۔ وہ اس مسیح کے لیے نہیں جس کا انتظار ان کے آبا کر رہے تھے اور جنہیں اپنی پہلی بعثت پر وہ نہ صرف جھٹلا چکے ہیں بلکہ اپنے علم کی حد تک اسے مصلوب بھی کر چکے ہیں بلکہ اس مسیح کے مخالف مسیح دجال کے لیے کوشاں ہیں (اس دجل کی تفصیلات اِن شاءاللہ آئندہ ابواب میں آئیں گی)۔ امن، خوشحالی اور عدل کا وہ دور جسے دراصل حضرت مسیح علیہ السلام مسیح دجال اور اس کے حلیفوں کو قتل کر کے پوری روئے ارض پر اِن شاء اللہ قائم کریں گے ـــــ یہ یہودی اس دور کو دراصل مسیح دجال کے لیے قائم کرانا چاہتے ہیں۔ ابلیس نے انہیں یہ دھوکہ دیا ہے کہ اصلی مسیح مسیح دجال ہے اور اللہ رب العزت کا بھیجا جانے والا مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دراصل مسیح دجال اور دہشت گردوں کا سردار ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

چنانچہ اقوام متحدہ کا چارٹر دراصل مسیح دجال کا چارٹر ہے۔[2] چنانچہ انیسویں صدی میں عالمی نظام کی تعیین کی کوششیں ہوں (جن کا ذکر عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال صفحات ۲۰۔۲۳ میں کیا گیا ہے) یا ۱۸۹۷ میں باسل (Basel) میں صیہونی تنظیم کا قیام ہو یا اس کے تحت پوری کی جانے والی منصوبہ بندی ـــــ جن میں قابل ذکر سائکس پیکاٹ خفیہ معاہدہ (Sykes-Picot Secret Agreement 1904) (۲) اعلان بالفور (Balfour Declaration 1916) (۳) وارسای معاہدہ (Treaty of Versaille 1921) (۴) لیگ آف نیشنز کا قیام (League of Nations) اور (۵) کیلاگ برائنڈ پیکٹ

Copyrighted material

(Kellog - Briand Pact 1928) ہیں ـــــ یہ دراصل اسی اقوام متحدہ کے قیام کی کوششیں تھیں جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے زمین پر امن، خوشحالی اور عدل کی اسی ربانی حکومت کے قیام کے لیے ہے جسے مسیح قائم کریں گے۔ لیکن باطن کے اعتبار سے یہ مسیح دجال کی وہ حکومت ہے جسے ابلیس ربانی مسیح کو ختم کر کے قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور جس کے لیے اس کے حلیف یہودی اور دیگر شیاطین راہ ہموار کر رہے ہیں۔

حاشیہ ۲ میں مذکورہ تفصیلات جنہیں مندرجہ ذیل چھ عنوانات کے تحت ملخص کیا جا سکتا ہے یہ ہیں:

(1) Peace among animals, no ravenous beast, the child (Adam) leading them.
(2) Desert and waste become beautiful and fertile.
(3) Abundance without labour.
(4) The waters and trees.
(5) The new state is on the mountain, in accordance with the idea that Paradise was on a mountain --- This mountain is now to be Mt. Zion.
(6) There is to be no bodily defect or sorrow or war but everywhere happiness and contentment while Yahweh will be present among men.

ترجمہ:

(۱) جانوروں کے مابین امن قائم ہو جائے گا۔ کوئی جانور درندہ صفت نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ آدمی کا بچہ اس سے کھیلے گا۔

(۲) تمام صحرا اور بنجر زمین خوبصورت اور زرخیز ہو جائے گی۔

(۳) لوگوں کو کم محنت کرنا ہو گی اور وافر مقدار میں ہر چیز پیدا ہو گی۔

(۴) ساری زمین میں ہر جگہ وافر مقدار میں پانی اور سرسبزی اور درخت دستیاب ہوں گے۔

(۵) زمین پر نئی ریاست (ریاست ربانی) ایک اونچے پہاڑ پر قائم کی جائے گی۔ اور یہ اس تصور کے مطابق ہے کہ الجنۃ اونچی جگہ پر قائم تھی ـــــ اب اس اونچے پہاڑ کا تصور جبل صیہون میں بدل چکا ہے۔

(۶) لوگوں میں کسی قسم کی جسمانی اور طبعی خرابی باقی نہیں رہے گی۔ ہر شخص دکھ اور غم سے آزاد ہو گا۔ زمین پر جنگ کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا، ہر طرف خوشیاں ہی

خوشیاں ہوں گی اور طمانیت اور سیری ہوگی اور یہود الوگوں کے مابین موجود ہوگا۔

دجال کی اسی آئندہ حکومت کے ابتدائی خدوخال کو صدر امریکہ فرینکلن ڈوائٹ روز ولٹ نے یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو Declaration by United Nation کے نام سے پیش کیا تھا۔ یہ دجالی پیش خیمہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو وجود میں آ گیا۔ دجالی حکومت کے مذکورہ مقاصد کی تکمیل کو اس کے چارٹر میں ان الفاظ میں متعین کیا گیا:

(1) To maintain international peace and secutiry.

(2) To develop friendly relations among nations based on respect for the principle of equal right and self-determaination of peoples;

(3) To co-operate in solving international econamice, social, cultural and humanitarian problems and in promotion respect for human rights and fundamental freedoms;

(4) To be a centre for harmonizing the actions of nations in attaning these common ends. ۳

ترجمہ:

(۱) بین الاقوامی امن اور سلامتی کو بحال رکھنا۔

(۲) قوموں کے مابین مساوی حقوق اور قوموں کے حق خود اختیاری کے اصول کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا۔

(۳) بین الاقوامی معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور انسانی مسائل کو حل کرنے میں تعاون کرنا اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ کو فروغ دینا۔

(۴) ان مشترکہ مقاصد کے حصول کیلئے قوموں کے مابین تعامل کو منسجم کرنے کیلئے مرکز کی طرح کام کرنا۔

اس مقام پر اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، عالمی ٹرائبنلز اور ہیگ کی عالمی عدالت کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے ان کے یہاں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی ذومعنویت (Equivocality) اور ان کی سریت (Cryptology or Cryptic Import) کا سمجھنا ضروری ہے۔

ان میں سے مفہوم کی ایک قسم تو وہ ہے جو معروف ہے اور قانون کی کتابوں میں عموماً اس

کا ذکر ملتا ہے۔ اور عام طور پر یہودیت اور دجالی طاقتوں کے علاوہ لوگ اسی مفہوم کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن اصطلاحات کی اس معنویت سے الگ ایک اور معنویت ہے جو ان اصطلاحات سے اصلاً مقصود ہے۔ چنانچہ یہودیت اور دجالی قوتیں آپسی بیانات میں ان اصطلاحوں کا استعمال مؤخر الذکر معنویت کے ساتھ کرتی ہیں۔ ہر چند کہ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں اصطلاحات کا ذکر کیا جائے اور ان کے اصل معانی (Imports) یا خفیہ معانی (Hidden Meanings) بتائے جائیں تاہم زیر بحث عنوان کے تعلق سے چند اصطلاحات کا ذکر کرنا مفید ہوگا۔

(۱) بین الاقوامی (International) : اس کے دو معانی لیے جاتے ہیں۔ پہلا (۱) وہ تعلق، معاملہ یا نزاع جس کا تعلق دو ایسے فریقوں سے ہو جن میں دونوں غیر یہودی ہوں۔

دوسرا (۲) وہ تعلق، معاملہ، یا نزاع جس کا تعلق دو ایسے فریقوں سے ہو جن میں ایک یہودی اور دوسرا غیر یہودی ہو۔

عام طور پر اس لفظ کا استعمال پہلے معنی میں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دوسرے معنی میں۔

(۲) آفاقی (Cosmopolitan) : یہ ایک خفیہ اصطلاح ہے۔ جب اس کا استعمال واحد میں Nation یا People کے ساتھ ہو یعنی Cosmopolitan Nation or People تو اس کا مطلب ہے یہودی قوم۔

(۳) آفاقی شہر (Cosmopolitan city) : یہ بھی یہ ایک خفیہ اصطلاح ہے۔ اور اس کا استعمال بعض اوقات یہ بتانے کے لیے ہوتا ہے کہ فلاں شہر میں یہودی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔

(۴) اقوام (Nations) : اس کا استعمال ٹھیک اسی طرح ہوتا ہے جیسے بین الاقوامی (International) لفظ کا۔

(۵) بین الاقوامی امن (International Peace): بیسویں صدی کے اوائل سے اس کے استعمال میں باضابطگی اور دقت آگئی ہے۔ اب اس کا مفہوم ہے یہودی قوم کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موافق عالمی صورت حال۔ چنانچہ اس کا استعمال مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے ہوتا ہے۔

**مثبت استعمال:** کسی خطے میں یہودیوں کی جان اور مال کو خطرہ در پیش ہو اور اس کا سبب وہاں پھیلی ہوئی قتل و غارت گری ہو قطع نظر اس کے کہ اس کا سبب کچھ بھی ہو اور یہ کہ وہ سبب معقول ہو یا نامعقول ـــــ تو اس صورت میں اس قتل و غارت گری کو بند کرانا جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ یہودیوں کی جان و مال محفوظ ہو جائیں خواہ اس عمل سے دوسری اقوام کی جان اور مال کے تحفظ کا بھی سامان کیوں نہ ہو جائے اسے بین الاقوامی امن (International Peace) کا مثبت استعمال کہتے ہیں۔

**منفی استعمال:** کسی خطے یا پوری روئے زمین میں یہودیوں کی جان اور مال کی ترقی اور ان کے مقاصد کے حصول کے لیے اگر جنگ کا بھڑکنا اور دوسری اقوام کی جانوں اور مالوں کی بے دریغ بربادی ضروری ہو تو ایسا کرنا اور ایسی جنگ بھڑکا دینا بین الاقوامی امن (International Peace) کا منفی استعمال ہے۔

پوری اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی یورپی تاریخ اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کی عالمی تاریخ منفی استعمال کی بہترین مثال ہے جبکہ بیسویں صدی میں ۱۹۲۱ء سے لے کر اب تک اس کے مثبت استعمال کی بھی کئی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۶) بین الاقوامی سلامتی (International Security) : اس اصطلاح کا مفہوم ہے کسی خطے یا پوری روئے ارض کی وہ کیفیت جس سے یہودی جان و مال سلامت رہیں اور ان کے مقاصد کے حصول کی راہ مسدود نہ ہو۔ بین الاقوامی امن اور بین الاقوامی سلامتی میں فرق کیفیت کے اظہار اور حکمت عملی کے اظہار کا ہے۔ اوّل الذکر میں پہلی صورت نمایاں ہے اور ثانی الذکر میں دوسری صورت۔

(۷) بین الاقوامی نزاع (International Dispute) : اس اصطلاح سے عام طور پر وہ معنی لیے جاتے ہیں جس کا تعلق دو فریقوں کے مابین نزاع سے ہو اور ان میں دونوں فریق غیر یہودی ہوں۔ چنانچہ اقوام متحدہ ایسے نزاعات کے حل کا کوئی پروگرام نہیں رکھتی۔ چونکہ یہ نزاعات ہر چند کہ یہودیوں سے متعلق نہیں ہیں لیکن چونکہ ان کی موجودگی میں یہودی مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ پڑتی ہے اس لیے ان نزاعات کو اس طرح ختم کر دینا یا زیر قابو کر لینا جو یہودی مقاصد کے حصول کی راہ کو وا کر دے اقوام متحدہ کے مقاصد کا ایک حصہ ہے۔ عام طور پر ایسے نزاع

یانزاعات کو جن میں ایک فریق یہودی ہو بین الاقوامی نزاع نہیں کہا جاتا۔

(۸) بین الاقوامی خطرہ (International Threat) : یہ اصطلاح بھی بڑی دقیق ہے۔اس کا پورا استعمال اس طرح عام طور پر کیا جاتا ہے:

Threat to the International Peace and Security.

اس کا مفہوم ہے وہ تمام افراد، گروہ، حکومتیں،ان کے افعال و اعمال یا نزاعات جن سے یہودیوں کی عالمی سلامتی کو خطرہ ہو یاان کے مقاصد کے حصول میں حقیقی مانع یا موانع ہوں۔

(۹) انسانی حقوق (Human Rights) : انسانی حقوق سے مراد ہے وہ کیفیت، قانون،انتظام یا حالت جس سے یہودیوں کی جان اور مال محفوظ ہوں یا انہیں کوئی حقیقی خطرہ نہ ہو۔

(۱۰) بنیادی آزادی (Fundamental Freedom) : اس سے مراد وہ ساری آزادی یاان ساری قوموں کی آزادی ہے جن سے یہودی اپنے مقاصد کا حصول کر سکیں۔وہ ساری پابندیاں جو یہودیوں یاان کے عملیوں کے مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بنیں بنیادی آزادی کے منافی ہیں۔

(۱۱) معاشی یامالی بحران (Economic or Financial Crisis): معاشی یامالی بحران سے دو باتیں مراد ہیں۔

(۱) کسی خطے یا پوری روئے زمین میں وہ معاشی یامالی صورت حال جس سے مقامی یا عالمی طور پر یہودی مفادات کو خطرہ در پیش ہو۔

(۲) کسی خطے یا پوری روئے زمین میں وہ معاشی یامالی صورت حال جو یہودیوں کے ذریعہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیے جانے والے دو عالمی اداروں IMF اور IBRD یا World Bank کے اپنے مقاصد کے پورا کرنے یا ان کے عمدگی سے کام کرنے میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۱۲) حکمت عملی کے علاقے (Strategic Areas) : کسی خطے یا پوری روئے زمین میں وہ تمام علاقے جو یہودیوں کے مقاصد کے حصول کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہوں۔

(۱۳) قانون کی حکمرانی (Rule of Law) : بظاہر اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کسی خطہ ارض بالخصوص قومی ریاستی نظام (Nation State System) میں لاقانونیت اور

آمریت نہ ہو بلکہ قانون اور ضابطہ کی حکومت قائم ہو جو پارلیامنٹ کو جوابدہ ہو۔

لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے کسی خطۂ ارض یا قومی ریاستی نظام میں کسی ایسے قانون کا نہ پایا جانا یا اگر ہو تو اس کا خاتمہ جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ یہودیوں کی کارروائیوں اور بالخصوص ان کے اپنے مقاصد کے حصول میں کی گئی کارروائیوں پر قدغن لگایا گیا ہو۔ دنیا میں وہ خطہ یا ملک جہاں یہودیوں کو سب کچھ کرنے کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہو اسے ایک ایسا ملک کہا جاتا ہے جہاں قانون کی حکمرانی (Law of Rule) ہے۔

(۱۴) عالمی حکمرانی (Global Governance) : اس کا عام مفہوم ہے پورے روئے ارض پر تمام لوگوں کے جمہوری حقوق کی پاسداری کرنے والی عالمی حکومت اور اس کی کارروائی یا کارکردگی یا اس کا طریقۂ انتظام۔

لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے پورے خطۂ ارض پر قائم وہ براہ راست یہودی حکمرانی جسے وہ "برگزیدہ قوم کی حکمرانی" (Governance of the Chosen People) کہتے ہیں۔ جب ساری دنیا میں وہ حکمرانی قائم ہو جائے گی تو یہی مثالی عالمی حکمرانی سے تعبیر کی جائے گی۔

(۱۵) عالمی مہذب معاشرہ (Global Civil Society): اس کا عام مفہوم ہے پوری روئے زمین کے ہر حصے میں ایسے افکار و نظریات پر قائم معاشرہ قائم کرنا جہاں جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادیٔ رائے کو یقینی صورت میں دیکھا جا سکے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم ہے پوری روئے زمین پر ایسی معاشرت قائم کرنا اور اس کے تحت ایسے نظام حکومت، نظام رہائش اور نظام علوم قائم کرنا جہاں یہودیوں کی ہر خواہش کی تکمیل ممکن ہو اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ کوئی مزاحم نہ ہو بلکہ پورا معاشرہ اسے اپنا مقصد حیات سمجھ کر خود یہودیوں کے لیے اسے پورا کرنے میں سرگرم ہو جائے۔

(۱۶) عالمی مہذب اخلاقیات (Global Civic Ethics) : وہ نقطۂ نظر، آئیڈیالوجی، علوم، طرز رہائش اور پسند و ناپسند کا معیار جو عالمی مہذب معاشرہ کی تکمیل کرتے ہیں ـــــ مہذب اخلاقیات کہلاتی ہیں۔ چنانچہ پوری روئے ارض پر اس کی توسیع اور اس کے مطابق ارض کا انتظام عالمی مہذب اخلاقیات کہلاتا ہے۔

(۱۷) ریاستوں کو کلی طور پر غیر عسکری بنانا (Total Demilitarization of

(States اس کا ظاہری مفہوم ہے کہ پوری روئے ارض سے جنگ اور جنگ کی تباہ کاریوں کے امکانات کو ختم کرنا۔

جبکہ اس کا حقیقی مفہوم ہے یہودیوں کے علاوہ دنیا کی تمام قوموں میں اس عسکری صلاحیت(Potential) کو کلی طور پر ختم کر دینا جو کبھی بھی یہودیوں کے خلاف استعمال ہو سکتی ہو۔اور یہ اس صورت میں ہو کہ خود موجود یہودی عسکری صلاحیت اپنے معیار کے اعتبار سے دنیا میں بے مثل Unparalleled ہو جائے اور ناقابل چیلنج برقرار رہے۔

حکومت دجال کے اس ابتدائی خاکے میں بظاہر سب سے اہم ادارہ جنرل اسمبلی (General Assembly) ہے جو محض ایک ندوۂ خطابیہ کی حیثیت سے قائم کیا گیا۔ چنانچہ اسے محض عضو خطابی (Deliberative Organ) قرار دیا گیا اور اس دجالی حکومت کے مقاصد کی تکمیل کا اصلی ادارہ سلامتی کاونسل (Security Council) طے پایا۔ چنانچہ اسے بنیادی طور پر ذمہ دار ادارہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے مقاصد اور فرائض کی تعیین اس طرح کی گئی:

(1) to maintain international peace and security in accordance with the principle and purposes of the United Nations;

(2) to investigate any dispute or situation which might lead to international friction;

(3) to recommend methods of adjusting such disputes or the terms of settlements;

(4) to formulate plans for the establishment of a system to regulate armaments;

(5) to determine the existence of a threat to the peace or act of aggression and to recommend what action should be taken, to call on Members to apply economic sanctions and other measures not involving the use of force to prevent or stop aggression;

(6) to take military action against an aggressor;

(7) to recommend the admission of new members and the terms on which states may become parties

to the statute of the International court of Justice;
(8) to exercise the trusteeship functions of the United Nations in "Strategic areas";
(9) to recommend to the General Assembly the appointment of the Secretary General and together with the Assembly, to elect Judges of the International Court.[۴]

ترجمہ:

(۱) اقوام متحدہ کی اصولیات اور مقاصد کے مطابق بین الاقوامی امن وسلامتی کو بحال رکھنا۔

(۲) کسی نزاع یا صورت حال کی جس کے بین الاقوامی تصادم کا باعث ہونے کا اندیشہ ہو جانچ کرنا۔

(۳) ایسے نزاعات کے سمجھوتہ کرانے کے طریقوں کی یا سمجھوتہ کے شرائط کی سفارش کرنا۔

(۴) ہتھیار بندی کو قابو میں رکھنے کے نظام کے قیام کے منصوبوں کو تیار کرنا۔

(۵) امن کے خطرہ اور جارحیت کے عمل کے وجود کو متعین کرنا اور اس بات کی سفارش کرنا کہ کیا اقدامات کیے جائیں۔ ارکان سے کہا جائے کہ وہ معاشی پابندیاں عائد کریں اور دوسرے ایسے اقدامات کریں جن میں طاقت کا استعمال نہ ہوتا کہ جارحیت واقع نہ ہو یا رک جائے۔

(۶) جارح کے خلاف عسکری کارروائی کرنا۔

(۷) نئے ارکان کے داخلہ کی اور ان شرائط کی سفارش کرنا جن پر ریاستیں بین الاقوامی عدالت انصاف کے ضابطہ میں شریک ہو سکیں۔

(۸) "حکمت عملی" کے علاقوں میں اقوام متحدہ کے واقف کی ذمہ داریاں ادا کرنا۔

(۹) جنرل اسمبلی کے سکرٹری جنرل کے اپوائنٹمینٹ کے لیے سفارش کرنا اور اسمبلی کے ساتھ اس کا انتخاب کرنا اور اسی طرح بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کا انتخاب کرنا۔

حکومت دجال کی یہی وہ تشکیل ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس عہد کے مشہور یہودی مفکر اور دانشور Cecil Roth نے یوں لکھا ہے۔

"These, in the present generation, Jews have endevoured to act up to the noble sentiment expressed by Azariah de' Rossi, nearly, four centuries ago."[۵]

ترجمہ:

"اس طرح، موجودہ نسل میں، یہودیوں نے ان نیک جذبات کے شایان شان عمل کرنے کی کوشش کی جن کا اظہار عزاریہ دروسی نے چار صدیوں قبل کیا تھا۔"

اور اس وقت جب یوروپ انہیں یہودیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلنے لگا تھا اس نے یہودیوں کی کوشش کو روکنے اور ان کو سبوتاژ کرنے والوں کو اس طرح دھمکی دی تھی:

"For two thousand years, then, the Jews have formed part of Europe. They have througout that period --- though more intensively during the past centuries, since the gates of Ghetto were broken down --- made their contribution to the commcn heritage: sometimes as intermediaries sometimes as pioneers, more often (so far as their activities were not curtailed) as participants. In the long run, their contribution has become interworven inextricably with the common stock by a thousand different strands. Disintegrate these, and the tree of western culture would be mutilated. Allow them unobstructed growth, and it may bear in the future through this means fruit yet more splendid than in the Past."[۶]

ترجمہ:

"اس وقت، تقریباً دو ہزار سالوں سے یہودی یوروپ کا حصہ بن چکے تھے۔ اس پوری مدت میں ــــ گرچہ پچھلی صدیوں میں زیادہ شدت کے ساتھ خاص طور پر جب سے Ghetto کے دروازے توڑ کر گرا دیئے گئے۔ انہوں نے مشترکہ وراثت کے لیے اعانت کی ہے۔ کبھی واسطہ بن کر، کبھی رہنما بن کر، بیشتر (جہاں تک کہ ان کی سرگرمیوں پر پابندی نہیں تھی) شریک بن کر۔ آخر کار، ان کی اعانتیں عام لوگوں میں ہزاروں مختلف تانوں بانوں کی طرح پیوست ہو گئیں۔ ان تانوں اور بانوں کو بکھیر دیجئے اور دیکھ لیجئے کہ مغربی ثقافت کا درخت کس طرح ٹھونٹھا ہو جاتا ہے۔ اس کے

بر خلاف انہیں بے روک ٹوک بڑھنے دیجئے تو دیکھ لیجئے گا کہ مستقبل میں کس طرح اس سے بھی شاندار پھل برآمد ہوں گے۔"

چنانچہ اپنے قیام سے لے کر اب تک اقوام متحدہ نے بالعموم اور سلامتی کونسل نے بالخصوص وہی کیا ہے جو اس دجالی حکومت کے قیام، توسیع اور استحکام کے لیے ضروری تھا۔ وہ سارے مسئلے حل کیے گئے جن کا حل یہودیوں کے لیے ضروری تھا حتی کہ ایک مصنوعی قوم آباد کر دی گئی اور ایک مصنوعی ملک وجود میں لا دیا گیا۔ ان چھوٹے سے چھوٹے مسئلوں کو بھی قابل توجہ سمجھا گیا اور ان کے حل میں پیش قدمی کی گئی جو یہودیوں کے لیے براہ راست یا بالواسطہ ضروری تھے اور ان مسئلوں کو جو اپنی جگہ کتنے ہی بڑے اور خطرناک کیوں نہ ہوں اور جن کے حوالے سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں جانوں کا زیاں ہوا یا ہو رہا ہو نا قابل التفات قرار دیئے گئے۔ یہاں تک کہ اس ابتدائی خاکے نے پچاس سال پورے کر لیے۔ اس پوری مدت میں بطور خاص خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور پوری اسلامی دنیا پر اس دجالی حکومت نے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ امت مسلمہ کی قرآن و سنت سے دوری، اس کے علماء اور دانشوروں کی بے حسی اور حکمرانوں کی گمراہی نے پوری ملت اسلامیہ کو اس مملکت کا مجبور شہری یا غلام بنا دیا جس کا استیصال ان پر واجب تھا اور جس کی کسی بھی شئے سے استفادہ ان پر حرام تھا چہ جائیکہ اس کا حصہ بن کر اس کے استحکام اور توسیع میں آلۂ کار بننا۔

پچاس سالوں کی کامیابی نے یہودیوں کے لیے حکومت دجال کو پوری طرح قائم کر دینے کی راہ صاف کر دی چنانچہ انہوں نے اقدام کیا اور اس طرح اس حکومت کا دوسرا دور ۱۹۹۱ء سے شروع ہو گیا جس کا خاکہ ۱۹۹۵ء میں

"Our Global Neighbourhood : The Report of the Commission on Global Governance"

کے نام سے شائع کیا گیا جس کی سفارشات درج ذیل تھیں۔ ان سفارشات پر ایک گہری نظر اور ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے چارٹر کا تقابلی مطالعہ بڑی آسانی سے یہ باور کرا سکتا ہے کہ کس طرح ۱۹۴۵ء میں قائم کردہ دجالی حکومت اب اپنے دوسرے مستحکم دور میں داخل ہو گئی ہے۔ سفارشات درج ذیل ہیں:

## Summary of Proposals in Chapter Six

**(Strengthening International Law)**

(1) All members of the United Nations should accept the compulsory Jurisdiction of the World Court.

(2) The Chamber procedure of the World Court should be modified to address its dangers and to increase its appeal to states.

(3) World Court judges should be appointed for one ten-Year term only, and a system introduced to screen potential members for jurisprudential skills and objectivity.

(4) States should be encouraged to include in future agreements and treaties provisions for the settlement of any inter state disputes.

(5) The UN Secretary General should have the right to refer the legal aspects of emerging disputes to a full bench of the World Court for advice at an early stage.

**(The Security Council)**

(6) A distinguished legal person should be appointed by the Security Council to provide independent advice on international legal proposition to the Council.

(7) The Security Council should make greater use of the World Court as a source of advisory opinions and, whereever possible, avoid being the judge of what international law may or may not be in particular cases.

**(Enforcing International Law)**

(8) An international criminal court should be established with an independent prosecutor or panel of prosecutors of the highest moral character as well as the highest level of competence and experience.

(9) International treaties should include provision to help countries that may otherwise face financial hardship in complying with them.

(10) Failing voluntary compliance, Security Council enforcement of World Court decisions and of other international legal obligations should be persued.

(11) An appropriate body should be asked to explore ways in which international law-making can be expedited without calling into question the consensual nature of International Law.

ترجمہ:

## باب ششم کی سفارشات کی تلخیص

### بین الاقوامی قانون کو مستحکم کرنا

(۱) اقوام متحدہ کے تمام اراکین کو چاہئے کہ وہ عالمی عدالت کے دائرۂ اختیار کو لازم اور واجب تسلیم کریں۔

(۲) عالمی عدالت کی کارروائی کے طریقۂ کار میں اس طرح تبدیلی کی جائے تاکہ یہ ان خطرات کا مقابلہ کر سکے جو اس کے لیے پیدا ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے بھی تاکہ دیگر ملکوں کے لیے اس کی جاذبیت میں اضافہ ہو۔

(۳) عالمی عدالت کے جج ایک دہ۔ سالہ مدت کے لیے تعینات کیے جائیں اور ایک ایسا نظام جاری کیا جائے تاکہ انصاف کی مہارت اور معروضیت رکھنے والے ایسے باصلاحیت اراکین کی پرکھ کر تعیناتی کی جا سکے۔

(۴) ملکوں کو اس بات پر ابھارا جائے کہ وہ آئندہ کرنے والے معاہدوں اور اتفاق رائے میں اس بات کو شامل کریں کہ بین الممالک تنازعات پر (اس عدالت کے تعلق سے) شق ہو۔

(۵) اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کسی پیدا ہونے والے تنازعہ کے قانونی پہلو کے تعلق سے عالمی عدالت کے پورے بنچ سے قانونی مشورہ طلب کرے۔

### سلامتی کونسل

(۶) سلامتی کونسل کے ذریعہ ایک منفرد ماہر قانون کی تعیناتی ہو جو کونسل

کے بین الاقوامی قانونی تجاویز پر آزادانہ رائے فراہم کرے۔

(۷) سلامتی کونسل عالمی عدالت کا مشیرانہ ماخذ کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استعمال کرے اور جہاں تک ممکن ہو کسی مخصوص بین الاقوامی مسئلے میں کیا بین الاقوامی قانون ہونا چاہئے یا نہ ہونا چاہئے کے تعلق سے فیصلہ کرنے والا بننے سے احتراز کرے۔

بین الاقوامی قانون کا نفاذ

(۸) اعلیٰ ترین اخلاقی کردار اور اعلیٰ ترین صلاحیت اور تجربے سے متصف آزاد حاکم یا حکام کی تعیناتی کے ساتھ ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت کیا قیام کیا جائے۔

(۹) بین الاقوامی معاہدوں میں یہ شق موجود ہوا کرے کہ اگر کسی ملک کو ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنے میں مالی دشواری کا سامنا ہو تو ان کی مدد کی جائے۔

(۱۰) رضاکارانہ عملدرآمد میں ناکام ہونے کی صورت میں سلامتی کونسل عالمی عدالت کے فیصلے کو نافذ کرنے اور دیگر عالمی قانونی واجبات کی ادائیگی کے لیے کارروائی کرے۔

(۱۱) بین الاقوامی قانون کی متفقہ صورت کو مجروح کیے بغیر ایک بین الاقوامی قانون بنانے کے لیے ایک مناسب باڈی کو کام کرنے کے لیے کہا جائے۔

ان سفارشات کو روبہ عمل لانے اور پورے عالم میں اس دجالی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے طریقے بتائے گئے ہیں جن کی تفصیل باب ۷ میں درج کی گئی ہے جس کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے:

(1) Establishment of Global Governance.

(2) Establishment of Global Civil Society.

(3) Promotion of Global Civic Ethics.

اور شق نمبر ۱، ۲ اور ۳ کے لیے سردست قومی حکومتوں سے کام لیا جائے اور ساری دنیا میں NGO's کا جال پھیلا دیا جائے اور ان سے کام لیا جائے۔

(4) Strengthening of Global Security.

اور اس کو مستحکم کرنے کے لیے

(a) Total Demilitarization of States.

(b) Nuclear Disarmament

نیوکلیائی طور پر نہتا کرنے کے لیے چار محاذ متعین کیے گئے ہیں:

(1) The earliest possible ratification ard implementation of existing agreements on nuclear and other weapons of mass destruction;

(2) the indefinite extension of the Non-Proliferation Treaty;

(3) the conclusion of a treaty to end all nuclear testing; and

(4) the initiation of talks among all declared nuclear powers to establish a process to reduce and eventually eliminate all nuclear arsenals

ترجمہ:

(۱) نیوکلیائی اور عام تباہی لانے والے ہتھیاروں کے تعلق سے موجود اتفاق رائے کی جلد از جلد توثیق اور ان پر عمل درآمد کرانا۔

(۲) عدم پھیلاؤ معاہدے میں غیر معینہ مدت کی توسیع کرانا۔

(۳) تمام نیوکلیائی تجربوں کے خاتمے پر معاہدہ کرانا

(۴) تمام نیوکلیائی اسلحہ خانوں کو کم کرنے اور فی الحقیقت ان کے کلی خاتمے کے طریقوں کو وضع کرنے کے لیے تمام اعلان شدہ نیوکلیائی طاقتوں کے مابین بات چیت کا آغاز کرنا۔

(5) Establishment of an Economic Security Council (ESC) to ensure Financial Economic Globalisation.

(۵) مالی معاشی عالمیت کو یقینی بنانے کے لیے ایک معاشی سلامتی کونسل قائم کرنا۔

جس کے مقاصد ہوں گے:

(1) to continously assess the overall state of the World economy and the insteraction between major policy areas;

(2) Provide a long-term strategic policy framework in order to promote stable, balanced, and

sustainable development;

(3) Secure consistency between the policy goals of the major international organisations, particularly the Bretton Woods bodies and the World Trade Organizations (WTO) ; and

(4) give political leadership and promote concensus on international economic issues.

ترجمہ:

(۱) عالمی معیشت کی حالت اور خاص پالیسی میدانوں میں باہمی تعامل کا سالانہ بلا فصل جائزہ لینا۔

(۲) مستحکم، متوازن اور پائیدار ترقی کی افزائش کے لیے طویل المدت حکمت عملی کے لائحہ کی فراہمی کرنا۔

(۳) بڑے بین الاقوامی اداروں بطور خاص بریٹن وڈس ادارے اور عالمی ادارۂ تجارت (WTO) کے پالیسیوں کے مقاصد میں تطبیق کی حفاظت کرنا ـــــ اور

(۴) سیاسی قیادت دینا اور بین الاقوامی معاشی امور میں اتفاق رائے کی افزائش کرنا۔

ان کے تحت WTO ایک اقوام متحدہ کے عضو کی طرح کام کرے گا اور ایک (Global Competition Office) قائم کرے گا۔ دوسری جانب بریٹن وڈس ادارے (Bretton Woods Institutions) یعنی آئی ایم ایف (IMF) اور ورلڈ بینک (WB) کی کارکردگی کو اس حکومت دجال کے استحکام کے لیے مزید ترقی دی جائے گی جو درج ذیل ہیں:

(1) Enlarging its capicity for balance of payments support through low conditionality compensatory finance.

(2) having oversight of the international monetory system and a capacity to ensure that domestic economic policies in major countries are not mutaully inconsistent or damaging to the rest of the international Community.

(3) releasing a new issue of Special Drawing Rights; and

(4) improving its capacity to support nominal exchange rates in the interest of exchange rate stability.

ترجمہ

(۱) کمتر شرائط پر مبنی تلافی معیشت کے ذریعہ توازن ادائیگی کے لیے مدد دینے کی استعداد میں توسیع کرنا۔

(۲) بین الاقوامی مالی نظام کی نگرانی کرنا اور ایسی استعداد کو یقینی بنانا تاکہ بڑے ممالک کے اندرون ملک معاشی پالیسیاں باہم غیر مطابق یا بقیہ بین الاقوامی برادری کے لیے نقصان دہ نہ ہوں۔

(۳) خصوصی حصول حق کی نئی صورتوں کو وا کرنا۔

(۴) شرح تبادلہ کے مفاد میں برائے نام شرح تبادلہ کی امداد کے لیے استعداد کو بڑھانا۔

(6) Reformation of the United Nations.

یہ دو جامع بات ہے جس کے تحت درج ذیل تجاویز دی گئیں ہیں:

(۱) سلامتی کونسل کو دو مرحلوں میں از سر نو تشکیل دی جائے۔

(الف) پہلے مرحلے میں پانچ اسٹینڈنگ ممبر مقرر کیے جائیں جو دوسرے مرحلے میں بھی برقرار رہیں۔ جن میں دو صنعتی ممالک سے اور ایک ایک افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سے ہو۔ مزید ازیں سلامتی کونسل کے غیر مستقل ارکان کی تعداد ۱۰ سے ۱۳ کر دی جائے۔ اور فیصلہ کے لیے لازمی ووٹوں کی تعداد ۹ سے بڑھا کر ۱۴ کر دی جائے۔ ویٹو کو کلی طور پر ختم کرنے سے قبل اسے کم سے کم استعمال کرنے پر اتفاق کیا جائے۔

(ب) دوسرے مرحلے میں پورے سلامتی کونسل کی ۲۰۰۵ تک تشکیل نو کی جائے۔

(۲) جنرل اسمبلی کو برقرار رکھا جائے اور مزید قوی بنایا جائے۔

(۳) ٹرسٹی شپ کونسل کو نیا مینڈیٹ دیا جائے۔

(۴) ہر سال Forum of Civil Society کا انعقاد کیا جائے جس میں Civil Society Organisations کو مدعو کیا جائے۔

(۵) پوری دنیا میں عورتوں کو Global Governance میں مرکزی

حیثیت دی جائے۔

(7) Strengthening the Rule of Law world-wide.

اس کے تحت ایک عالمی قانون بنایا جائے اور ساری دنیا کو اسی عالمی قانون کے ماتحت کر دیا جائے۔[۸]

۱۹۹۵ کے وسط سے ہی ان سفارشات اور تجاویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے جو چند سالوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ لیکن ان تمام تجاویز کا کلیدی اور سب سے بنیادی حصہ نمبر ۶ کے ذیل میں سلامتی کونسل سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ اقوام متحدہ کی بالعموم اور سلامتی کونسل کی بالخصوص کوئی ایسی تشکیل نہیں ہو سکتی جو یہودیوں کے منصوبۂ حکومت دجال کے خلاف جاتی ہے۔ اس لیے سلامتی کونسل کی موجودہ صورت حال میں جہاں پانچ مستقل ممبر ہیں اور ان کو ویٹو کے اختیارات ہونے کے باوجود اصل قوت امریکہ اور برطانیہ کو حاصل ہے کوئی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ دجالی حکومت پوری طرح قائم نہیں ہو جاتی۔ اور اس کے قیام کے بعد کسی سلامتی کونسل کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔

یہی وہ حالات تھے جن میں یہودی قوت اور اس کے تحت امریکہ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام میں ایک بحران آتا ہوا محسوس ہوا۔ یہودیوں کو اپنے اس انتظام کے تعلق سے جسے یہاں امریکہ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کہا گیا ہے یہ بات تقریباً پچیس سال قبل معلوم ہو چکی تھی کہ یہ انتظام دیگر قوموں کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔ تاہم وہ اسے کسی صورت اس وقت تک تھامے رکھنا چاہتے تھے جب تک انہیں کوئی امید سے بھرا دوسرا راستہ میسر نہ آ جائے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دنیا کی موجودہ حالت میں اسے بہت دنوں تک قائم رکھنا مشکل ہوگا۔ تاہم دو باتیں انہیں بطور خاص پریشان کر رہی تھیں:

(۱) ہر طرح کے مظالم کے باوجود عالم اسلام کا شکست تسلیم کرنے اور ان سے فکری، علمی، ذہنی، جذباتی، ثقافتی ہم آہنگی سے انکار کر دینا اور اس کے برخلاف اپنے تشخص کو بچانے کا عزم صمیم رکھنا۔

(۲) جرمنی اور جاپان پر ہر طرح کے حربے آزمانے کے باوجود ان کا یہودیوں کے خلق

کردہ امریکہ ۔ برطانیہ۔ سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کا حصہ بننے سے انکار کردینااوراپنے ماضی کونہ بھلانے پراصرار کرنا۔

انہیں امید تھی کہ وہ:

(۱) عالم اسلام کو کچل دیں گے اورانہیں اپنا حاشیہ بردار بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کم ازکم مسلم حکمرانوں کے رویئے سے انہیں اسی کااندازہ ہورہاتھا۔

(۲) انہیں اس بات کی بھی امید تھی کہ وہ بالآخر جرمنی اور جاپان کو ـــــ بطور خاص جنگ عظیم دوم کے بعد پیدا ہونے والی نسل یاکم ازکم تیسری نسل کوجو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پیدا ہوئی ہے ـــــ رام کرلیں گے اورانہیں بھی اپناحاشیہ بردار بنالیں گے۔

(۳) انہیں اس کی بھی پوری پوری امید تھی کہ وہ کسی مسلم طاقت کوجوہری قوت ہرگز بننے نہیں دیں گے۔

یہودیوں کوکیاخبر تھی کہ ایک نئی راہ ڈھونڈھنے کی کوشش میں جب وہ سوویت یونین کی از سرنو تشکیل کرنے کے لیے اس فلک بوس عمارت کوزمین بوس کریں گے توایک نئی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اوروہ نئی صورت حال تھی ڈاکٹر ہیلمٹ کول (Dr. Helmot Kohl) کی سربراہی میں ایک نئے یوروپ کی تشکیل کا آغاز۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء کے بعد یوروپ میں اتحاد کی ایک نئی لہر چلی جوMaastricht ہوتے ہوئے اب Euro سے آگے چلی گئی ہے۔ یوروپ میں اتحاد تاریخی طور پر یہودی۔ اینگلو سکسن انتظام کے لیے ہمیشہ بحران کاباعث ہوا ہے۔[۹]

یہودی۔ اینگلو سیکسن انتظام کی اس تشویش کوٹموتھی گارٹن ایش (Timothy Gartan Ash) نے اس طرح بیان کیاہے:

> "The trouble is that those designs for European Unification that were peaceful were not implemented, while those that were implemented were not peaceful. The reality of unification was either a temporary solidarity in response to an external invader or an attempt by one European State to establish continental hegemony by force of arms, from Napoleon to Hitler." [۱۰]

ترجمہ:

"مشکل یہ ہے کہ یوروپ کے اتحاد کے لیے ان منصوبوں پر جو پرامن تھے عمل نہیں کیا گیا۔ اور جن پر عمل کیا گیا وہ پرامن نہیں تھے۔ نپولین سے لے ہٹلر تک، اتحاد کی حقیقت یا تو یہ رہی کہ وہ کسی خارجی حملے کے وقت ایک وقتی یکجہتی تھی یا یہ کہ وہ کسی ایک یوروپی ملک کے ذریعہ طاقت کے استعمال سے ایک براعظمی غلبہ کی کوشش تھی۔"

ہر چند کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے تمام کردار کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے وہاں کے اس وقت کے بادشاہ اور موجودہ بادشاہ کے والد نے اپنی وہ حیثیت ختم کردی تھی جسے تمام جاپانیوں کے مرجع اور الوہی نسل کی اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن بایں ہمہ ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر بطور خاص ۱۹۸۰ کے بعد ہر سال ۳ مئی کو جو کہ جاپان کے موجودہ امریکیوں کے ذریعہ بنائے گئے دستور کے نفاذ کا دن ہے وہاں کی حکومت رائے عامہ کا جائزہ لیتی ہے کہ کیا اب اس دستور کو از سر نو قوم کی امنگوں کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے بطور خاص اس کی دفعہ ۹ کو جس میں جاپان نے دائمی طور پر جنگ سے الگ رہنے کا عہد کیا ہے۔ دفعہ کے الفاظ ہیں:

The Japanese people forever renounce war as a Sovereign right of the nation and the threat or the use of force as a means of settling international disputes."

ترجمہ:

"جاپانی عوام جنگ اور دھمکی یا طاقت کے استعمال سے جو بین الاقوامی نزاعات کے حل کرنے کے لیے ہوں ـــــ بحیثیت ریاست کے خود مختارانہ حق کے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہوتے ہیں۔"

یہ دفعہ مزید کہتی ہے:

Land, sea and air forces, as well as other war potential, will never be maintained."

ترجمہ:

"بری، بحری اور فضائی قوت اور اسی طرح دیگر جنگی صلاحیت اب کبھی بھی برقرار نہیں رکھی جائے گی۔

چنانچہ اس سال بھی یہ بات بڑی شدومد سے زیر بحث آئی۔ جاپان کے موجودہ وزیر اعظم اور ابھی ابھی فوت ہونے والے وزیر اعظم دونوں اعتدال کے ساتھ ہی سہی مگر اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کا اعتدال اور اظہار میں احتیاط ممکن ہے ان کی عملیت (Pragmatism) کا نتیجہ ہو مگر وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عوام کی رائے اصلاً ٹوکیو کے گورنر مسٹر شنتارو ایشی ہارا (Shintaro Ishihara) کے ساتھ ہے جن کا کہنا ہے کہ جاپان کو اس امریکی ساختہ دستور کو یکسر بدل دینا چاہئے۔

تیسری جانب عالم اسلام کے بہترے حکمرانوں کی سالوسی، خاموشی یا مجبوری کے ساتھ حاشیہ برداری کے باوجود پوری امت اور بطور خاص عامۃ المسلمین میں بڑھتے ہوئے دینی رجحان، شعور جاں سپاری اور مغرب سے نفرت نے یہودیوں کو مزید برافروختہ اور انہیں مزید غیر انسانی طور پر کچلنے کی طرف مائل کر دیا ہے۔ یہودی قوت کی یہی حواس باختگی جو مختلف پردوں میں، مختلف بہانوں یا تدبیروں سے اور مختلف ہاتھوں کے ذریعہ تقریباً تمام ہی براعظموں میں مسلمانوں کے قتل عام، نسل کشی، دربدری، عصمت دری، بائیکاٹ، اذیت دہی اور بے عزتی کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔ یہودی ان ساری تدبیروں کے باوجود امت کے عزم میں لچک کے آثار دور دور تک نہیں پا رہے ہیں۔

چوتھی جانب اپنے تمام حربوں، تدبیروں اور دھمکیوں کے باوجود وہ اس میں ناکام ہو گئے ہیں کہ کسی مسلم ملک کو جوہری طاقت ہرگز بننے نہ دیں گے۔ اس ناکامی نے انہیں یکایک ایک ایسے خطرے کے اندیشے میں مبتلا کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ بیسویں صدی میں کی گئی ان کی ساری کوششیں صفر ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ایک خطرناک فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ وہی فیصلہ ہے جس کی تعمیل کے پہلے مرحلے کے لیے صدر امریکہ نے جنوب ایشیا کا سفر کرنا ضروری سمجھا۔

لیکن جنوب ایشیا کا ہی سفر کیوں؟ اس کے دو اسباب نظر آتے ہیں۔

(۱) یہودیوں کا یہ احساس کہ ساری دنیا میں اسلامی بیداری کا مرکز فی الوقت جنوب ایشیا ہے۔

(۲) جنوبی ایشیا کی ایک قوم کے ایک موثر طبقے کا یہ باور کرا دینا کہ وہ قوم اور یہودی۔ اینگلو سیکسن انتظام قدرتی حلیف ہیں۔ اور امریکہ کا اس پر شرح صدر ہو جانا۔[11]

ایک جانب امریکہ اور جاپان کے مابین اس پر اتفاق کے باوجود کہ دونوں اپنے اختلافات کو مزید ہوا نہیں دیں گے (مئی ۴/ ۲۰۰۰ء) یہ بات یقینی ہو چکی ہے کہ اب ان دونوں کے اختلافات یعنی جنگ عظیم دوم کے بعد یہودی قوم کا قائم کردہ امریکہ۔ برطانیہ، سلامتی کونسل۔ آئی ایم ایف۔ ورلڈ بینک انتظام کی روشنی میں جاپان امریکہ تعلقات Point of No Return تک پہنچ گئے ہیں۔

دوسری جانب ۱۹۸۹ء سے جاری ہلمٹ کول طوفان کو ہر چند کہ اس طرح روک دیا گیا ہے کہ خود ہلمٹ کول کو صدارت سے الگ کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے لیکن ان سب کے باوجود یوروپ میں ان کا لایا گیا اتحاد کا طوفان اب بھی پوری شدت سے آگے بڑھ رہا ہے جس کا نتیجہ اہل یوروپ کا کوسوو آپریشن میں ناٹو کا بے دلی سے ساتھ دینا اور کسی درجے میں امریکی۔ برطانوی فوجوں سے عدم تعاون کرنا ہے۔

باشندگان برصغیر کے لیے بالعموم اور باشندگان ہند کے لیے بالخصوص سن ۲۰۰۰ عیسوی کی شروعات بظاہر نہایت روشن اور امید افزاء اور بباطن سخت تاریک اور بدترین معلوم ہوتی ہے۔ اگر صدر کلنٹن کے اس دورے کے مضمرات مخصوص رخ پر گئے اور اس کے عواقب اسی طرح سامنے آئے جو اس طرح کے قدرتی تحالف کا منطقی نتیجہ ہے تو یہ ایک ایسی ہولناک صورت ہوگی جس کی نظیر اس خطے کی تین ہزار سالہ تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

صدر امریکہ کلنٹن کا دورہ ظاہر ہے طرفین کے اتفاق کا نتیجہ ہوگا یعنی اس بات پر اتفاق کا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے مخصوص مقاصد کی تکمیل اس تحالف میں ممکن ہے۔ اس صورت میں یہ بالکل جداگانہ بات ہے کہ دونوں کے مقاصد الگ الگ ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کے مقاصد ایک ہی ہوں یا ایک ہی بات کے دو الگ الگ پہلو۔ ایسی صورت میں طرفین کا یہ تصوراتی اتفاق بلا روک ٹوک عملی اتفاق میں بدل جائے گا۔ اور بہت اہم امور میں گہرائی تک جا سکتا ہے۔

کلنٹن نے مارچ ۲۰۰۰ء میں بھارت کا دورہ کیا اور انہوں نے بھارتی جنتا پارٹی کی قیادت والی حکومت کے ساتھ بہت سے میدانوں میں متفقہ اقدامات کے لیے معاہدے اور مفاہمت کیے جن میں سب سے اہم بات امریکہ کی بعض شرائط کے ساتھ ہندوستان کی سلامتی کونسل کے مستقل رکنیت پر آمادگی ہے۔

اس کے معابعد اپریل میں برطانوی وزیر خارجہ کک کا دورۂ ہند ہوا اور انہوں نے بھی انہیں شرائط کے ساتھ ہندوستان کی سلامتی کونسل کی رکنیت کے استحقاق کی حمایت کی۔ اپریل کے وسط میں بھارت کے صدر کا دورۂ فرانس اور اس کے معابعد فرانس کے دو وفود کی بھارت آمد ہوئی۔ اس میں سب سے ابھری ہوئی بات بعض شرائط کے ساتھ سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کے لیے بھارتی استحقاق کی فرانس کے ذریعہ حمایت ہے۔ بھارت جیسے ایشیائی ملک کا سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننا اہل ایشیا کے لیے خوشی اور اطمینان کی بات ہے لیکن کل تک مغرب کا بھارت کو رکنیت سے محروم رکھنا اور آج حمایت کرنا تشویش کا باعث ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ کہیں عالمی استعماری قوتیں بھارت کی موجودہ حکومت کے مخصوص رجحانات کا اپنے استعماری مقاصد کے لیے استحصال کرنا تو نہیں چاہتیں۔ اگر ایسا ہے تو لازماً اس کا نقصان صرف اور صرف بھارت کو ہوگا۔ تشویش کی دوسری بات یہ ہے کہ عالمی سطح پر یہ اتفاق اور تحالف ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب بھارت کی اندرونی صورت حال بعض پہلوؤں سے اتنی سنگین ہو چکی ہے کہ جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاید ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں بھی صورت حال اتنی سنگین نہیں تھی۔ بابری مسجد کا انہدام، ٹاڈا میں ہزاروں مسلمانوں کی گرفتاری اور مہینوں بلکہ سالوں، دستور کی موجودگی میں بلا مقدمہ قید وبند اور اذیت، قانون اور حکومت کے بعض بے قابو حلقوں کا فاشسٹ عناصر کی کھلی حمایت اور ان کے لیے قانونی چھتری کی فراہمی، پورے ملک میں مسلمانوں کو برسر زمین خوفزدہ کرنا، مسلم معیشت کے خلاف درپردہ اور علانیہ عملی اقدامات، دستور کی ترمیم کی کارروائی کا آغاز، مذہبی تعمیرات بل کے ذریعہ ہر طرح کے مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی اداروں، سرگرمیوں اور تشخصات کا خاتمہ کرنے کی کوشش، مخصوص علاقوں اور زمینوں سے مسلمانوں کی جبری بیدخلی، تمام دینی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کو غیر ذمہ دارانہ طور پر دہشت گردی قرار دینا، تمام دینی، ثقافتی اور تہذیبی مقامات کو دہشت گردی کے اڈے قرار دینا، مسلمانوں کا انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے دستوری چارہ جوئی کے حق کا صرف کاغذ پر باقی رہ جانا، پولس اور پیرا ملٹری فورسیز کے معتدبہ حصہ کو فاشی جذبات سے بھر دیا جانا اور فوج کے بعض طبقات کا اس سے اچھوتا نہ رہنا، بیوروکریسی کے بہت بڑے طبقے کا انہیں سرگرمیوں میں متحرک ہو جانا ایک ایسی صورت حال کو جنم دے رہا ہے جس کے عواقب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

اس مخصوص صورت حال میں مشہور ماہر حکمت عملی اور قومی سلامتی کونسل کے رکن کے سبرامنیم (K. Subrahmanyam) کا یہ اظہار خیال کہ۔

"Containing International terrorism, religious extremism and narcotics traffic constitute a major area of agreement" (between India & the United States). [۱۲]

ترجمہ:

"بین الاقوامی دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور منشیات کے لین دین کو قابو میں لانا اتفاق کے بڑے حصے کے بطور ہے (جو بھارت اور امریکہ کے مابین ہے)

بہت معنی خیز ہے۔

ہر چند کہ یہ بات بے حد حیرانی کی ہے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے فکری گروہ (Ideological Group) آر ایس ایس کی ہندوستان کے تعلق سے عالمی پالیسی امریکہ کی عالمی پالیسی کے بالکل علی الرغم اور اس سے متصادم ہے۔ آر ایس ایس ایک نظریاتی گروہ ہے اور سبرامنیم کی تلقین خالصتاً ابن الوقتی اور موقع پرستی کے اصول پر قائم ہے۔ ہر چند کہ سبرامنیم نے اپنے فلسفے کو عملیت (Pragmatism) کا لبادہ اوڑھایا ہے لیکن وہ اپنی اس عملیت کی پیش کش میں یہ بتانے سے قاصر رہے کہ اگر ایک بار بھارت اس عملیت کا سہارا لے کر اپنی ریاستی اصولیت سے ہٹ جائے اور کچھ دنوں کے بعد اسے یہ اندازہ ہو کہ امریکہ بھارت اور اپنے مفادات کے توازن کے ساتھ تکمیل سے زیادہ صرف اپنے مفادات کی تکمیل چاہتا ہے اور اسے بھارتی مفادات سے کوئی خاص غرض نہیں تو پھر بھارت اس صورت حال سے اپنے کو کیونکر نکال پائے گا اور اس کی عملیت کیا ہوگی۔ اور یہ خطرہ اس صورت میں اور بھی عیاں ہوتا نظر آتا ہے کہ وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صرف اس کا مسئلہ نہیں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے:

The US is interested in the Indian markets just as every country is interested in every country's markets. India should explore the possibilities of the US markets for Indian Software and skills."

ترجمہ:

"امریکہ بھارت کے بازار میں دلچسپی رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے ہر ملک

کسی دوسرے ملک کے بازار میں دلچسپی رکھتا ہے۔ بھارت کو چاہئے کہ وہ امریکہ کے بازار میں بھارتی سوفٹ ویر اور ہنر مندی کے امکانات کے دروازے وا کرے

بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں:

There can be no doubt on the basic assumption that the US would like to perpetuate its position as the sole superpower in the world, to give its citizens the highest per capita income and to be the dominant decision-maker in all major strategic, economic, technological and environmental global decisions."

ترجمہ:

"اس بنیادی مفروضے میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ دنیا میں اپنے سپر پاور کے مقام کو دوامی بنائے رکھنا، اپنے شہریوں کو سب سے زیادہ فی کس آمدنی دینا اور تمام بڑے تدبیری، معاشی، تکنیکی اور عالمی ماحولیاتی فیصلوں میں غالب فیصلہ کن کی حیثیت میں رہنا چاہتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھارت کا اس غار میں داخل ہونا جتنا خوشنما اور آسان ہوگا اختلاف کی صورت میں اس غار سے نکلنا اتنا ہی بھیانک اور مشکل۔

لیکن اب جب کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت نے اس سمت جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو سبرامنیم کی الفاظ میں بھارت اور امریکہ کے متفقہ مقاصد اس خطے میں اقلیتوں کے لیے بے حد تشویشناک ثابت ہوں گے۔ حالات کے اس رخ پر چلے جانے کے بعد وزیر داخلہ ایڈوانی کا بیان مزید تشویشناک مضمرات کا حامل سمجھا جاسکتا ہے کہ اب بھارت پر بیرونی خطرے اور اس کے اندرونی خطروں میں فرق باقی نہیں رہ گیا ہے۔

اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ خطہ ایک ہزار سال کے اجتماعی امن کے بعد پھر قتل عام اور بڑے پیمانے پر عوامی بیدخلی (Mass Exodus) کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جس کا تلخ تجربہ بھارت کی تاریخ نے بطور خاص دوسری صدی عیسوی اور نویں صدی عیسوی کے مابین کیا تھا۔

لیکن اس سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی اس خطے کے تعلق سے

پالیسی میں اچانک تبدیلی اور ان کی جانب سے بھارت کے انتخاب کا اصل سبب کیا ہے؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ:

(۱) یہودی قوت یہ محسوس کر چکی ہے کہ اب اس کی اور عالم اسلام کی کشمکش ناگزیر ہو کر عالمی جنگ کی صورت اختیار کرنے جا رہی ہے۔

(۲) یا یہ ہے کہ وہ اب اس کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ عالم اسلام کو کچل دینے میں مزید تاخیر ان کے عالمی منصوبے کو ہی درہم برہم کر کے رکھ دے گی لہٰذا ایسا اقدام ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسا قدم ایک عالمی جنگ پر منتج ہو گا۔

(۳) یا یہ ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو اور پورے جزیرۃ العرب پر قبضہ کر لینے کو مزید ٹالنا خطرناک ہو گا لہٰذا اس آپریشن کے کرنے کا وقت گزرتا جا رہا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایسا آپریشن ایک عالمی جنگ پر منتج ہو گا۔

(۴) کیا وہ اس نتیجے تک پہنچ گئے ہیں کہ ایک عالمی جنگ کی صورت میں جرمنی اور جاپان نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ ممکن ہے کہ مخالفانہ رول ادا کریں۔ اور اس صورت میں سلامتی کونسل میں ان کی رکنیت ہولناک نتائج پیدا کرے گی؟

(۵) کیا وہ اس نتیجے تک پہنچ گئے ہیں کہ جنگ عظیم دوم کے بعد انہوں نے جرمنی اور جاپان کے عزت نفس کو جس طرح پامال کیا ہے اس کے سبب کسی بحرانی صورت میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے؟

(۶) کیا اس کا سبب عالم اسلام سے ہونے والی عالمی جنگ کی مخصوص نوعیت عملی ہے؟ یہ بات واضح ہے کہ کسی ایسی آئندہ جنگ کی تین خصوصیات ہوں گی۔ (۱) ایک جانب سے اعلیٰ فنی جنگی مشنری کی حرکت High-tech war machinary mobilisation اور دوسری جانب سے ادنیٰ اور متوسط جنگی مشنری کی حرکت (Low and medium tech-war Machinary mobilisation) (۲) بے حد و حساب خام مال کی کھپت (High Consumption of Raw Material) (۳) غیر معمولی اور بے شمار انسانی جانوں کا تلف ہونا (War of Over-kill)۔ ظاہر ہے اس صورت حال میں کئی باتیں قابل ذکر ہوں گی:

(۱) یہودیوں کا موت سے بے حد ڈرنا جب کہ ایک عام اندازہ کے مطابق ایک ایسی عالمی

جنگ کے چھڑنے کی صورت میں اب ۳۰ سے ۵۰ کروڑ لوگوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ۵۰ کروڑ کے کلی زیاں میں اگر یہودیوں اور مسلمانوں کی اموات کا تناسب ۱:۱۰۰ بھی ہو جب بھی یہودیت ۵۰ لاکھ اموات کو برداشت نہیں کر سکے گی۔

(۲) اس صورت میں اس کے لیے جرمنی اور جاپان بے کار ہیں۔ وہ ان کے لیے اتنے جانوں کی قربانی دینے کی صلاحیت سے قاصر ہیں۔

(۳) یوروپ کا کوئی ملک شاید اب کسی ایسی جنگ کے لیے تیار نہ ہو۔ مثلاً: روس اور مشرقی یوروپ کے ممالک۔

(۴) جنگ عظیم اوّل اور دوم کے سابقہ رکارڈ کی بنیاد پر وہ یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بھارت ان کے لیے اتنے جانوں کی قربانی دے سکتا ہے۔ خود اس ملک کی اندرونی صورت حال میں ایک طبقے کے لیے یہ تاریخی حکمت عملی دور رس نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

(۵) انسانی وسائل کے ساتھ ساتھ کسی ایسی جنگ میں خام مال اور اب اس Glcbalised دنیا میں Industrial Base بھی ناگزیر ہیں۔ جرمنی تو خیر کسی حد تک ورنہ جاپان تو خام مال کے تناظر میں بالکل بے کار ہے۔ بھارت ہر دو اعتبار سے مالا مال ہے۔

(۶) جرمنی اور جاپان دونوں یہودیوں کے علاقۂ دشمنی کی باہری سرحدوں پر واقع ہیں اور کسی ایسی جنگ میں ان کا تعاون مؤثر نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف یہودیوں کے نقطۂ نظر سے بھارت باہری سرحدوں (Peripheral) پر ہونے کی بجائے عالم اسلام کے وسط میں واقع ہے جو ہر اعتبار سے Mobility اور اسٹرائک کے لیے موزوں ہے۔ یہودیوں اور امریکہ کو اس سے چنداں غرض نہیں کہ اس صورت میں بھارت کو کتنے نقصانات کا سامنا ہوگا اس لیے کہ صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھنا ان کی تاریخ رہی ہے۔

(۷) کسی ایسی متوقع جنگ میں بیلسٹک میزائیلوں کا رول سب سے زیادہ ہوگا۔ ایسی صورت میں بین براعظمی بیلسٹک میزائل کا رول بہت کم نظر آتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے وار ہیڈس جوہری ہوں۔ اور روایتی وار ہیڈس کے ساتھ بین براعظمی میزائلوں کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ـــــ نہ مالی اعتبار سے اور نہ جنگی اعتبار سے۔ لہٰذا اس بات کے زیادہ امکانات ہیں کہ درمیانے اور چھوٹے درجے کے بیلسٹک میزائل ہی زیادہ تر استعمال کیے

جائیں۔اس صورت میں واقعی علاقۂ جنگ (Real War Theatre) کا معاملہ یہودیوں کے لیے سنگین ہوگا خاص طور پر اس لیے کہ ان کے دماغوں میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی یاد ابھی محو نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی تناظر میں بھی بھارت ان کے لیے نہایت موزوں علاقہ ہے۔ جہاں وہ اپنے مفادات کی جنگ بھارتی سرزمین پر لڑنا چاہتے ہیں۔

ایسی صورت میں اگر یہودیوں کو بھارت کی آمادگی بھی مل جائے تو یہ ہر صورت سے جرمنی اور جاپان کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہوگی۔

کیا مسٹر کلنٹن کا دورہ دراصل اس سلسلے کا آغاز ہے جس کا منطقی نتیجہ غزوۂ ہند ہو سکتا ہے؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ظہور دجال سے معاً قبل کسی نزدیکی عہد میں ہوگی۔ یہ جنگ بے حد خوں آشام ہوگی، جس میں جان اور اسباب کا بے حد زیاں ہوگا۔ جس کی شروعات مقامی اہل ایمان پر غیر انسانی مظالم، ان کی بے بسی اور ان کی داد رسی کے حوالے سے ہوگی۔ (ان امور پر تفصیلی بحث ان شاءاللہ آگے آئے گی) عین ممکن ہے کہ حالات کے وقوع پذیر ہونے کا وہ آخری سلسلہ جس کی آخری کڑی ظہور دجال اور پھر قتل دجال ہے اس کا آغاز غزوۂ ہند سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا سبب ہو جنوب ایشیا میں مسلمانوں کا قتل عام اور ان کا کلی صفایا کر دینے کے اقدامات جس کے آثار بدقسمتی سے پوری طرح نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ کے اس فیصلے کے تناظر میں ان کے مقاصد کو اس طرح ملخص کیا جا سکتا ہے:

(۱) جنوب ایشیا میں مسلمانوں کو نہتا کرنا (Disarmament of Muslims in South Asia)

(۲) یہودیوں کے نقطۂ نظر سے جنوب ایشیا میں نام نہاد اسلامی لہر کو روکنے کے لیے اسلامی سرگرمیوں، تشخصات اور ثقافت کا خاتمہ کرنا ـــــ اس صورت میں اس ایجنڈے کی طرف پیش رفت جس کے تحت

(ا) پورے جنوبی ایشیا کو اسلامی جذبات اور عواطف سے پاک کرنا اور

(ب) بھارت میں مسلمانوں کو بہر صورت de-Islamise کرنا یا انہیں Liquidation کی حد تک Marginalise کر دینا ناگزیر ہے۔

اگر حکمت عملی کی بنا یہی ہے اور ایسا نہیں لگتا کہ اس کے سوا کوئی اور بات یہودیوں کو منظور ہو گی۔ تو اس صورت حال میں یہ وہ انقلابی تبدیلی ہے جو لازماً تاریخی رخ اختیار کرے گی اور پھر صورت حال ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جائے گی۔

چنانچہ پہلا سوال جو سبب بنا اس تجزیہ کا دہ یہ ہے:

کیا غزوۂ ہند کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟[۱۳]

## دوسرا سبب: عیسائی یہودیت کے تخریبی عزائم

اس تجزیے کا دوسرا سبب ہے ۱۹۹۹ء کے اوائل میں ڈینور کولوریڈو دس پین سیٹنلسٹ (Denver Colorado Dispensationalist) لوگوں کے ایک گروپ کی جسے Concerned Christians کہا جاتا ہے اسرائیل آمد اور مسجد اقصیٰ کو بم سے اڑا دینے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی گرفتاری اور ان کا امریکہ واپس بھیجا جانا۔ یہ گروہ امریکہ اور دیگر پروٹسٹنٹ عیسائی دنیا میں پھیلے ہوئے ان سینکڑوں گروہوں میں سے ایک ہے جو Dispensationalists یا Fundamentalists کہلاتے ہیں۔ عیسائیت میں یہودی سازش کے نتیجے میں رونما ہونے والی تفریق کی سب سے بڑی پیداوار پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں جو رومن کیتھولک سے الگ ہو کر اب خود سینکڑوں فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ یہ تفریق دراصل یہودیوں کی کاشتہ و پرداختہ تھی اس لیے یہودیت سے قربت اور ان کے عمیل کی حیثیت سے کارگزاری ان میں سے ہر فرقے کا خاصہ اور مقصد وجود ہے۔[۱۴] ہر چند کہ ان کا ظاہری تشخص عیسائیت کا ہے لیکن یہ عیسائی سے زیادہ یہودی ہیں اور زیادہ بہتر طور پر کہا جائے تو یہودی عیسائی یا عیسائی یہودی ہیں۔

موجودہ عہد میں پروٹسٹنٹ اور بطور خاص امریکہ میں رہنے والے پروٹسٹنٹ بنیادی طور پر دو ظاہری تشخص میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا — لبرل پروٹسٹنٹ (Liberal Protestant) ہیں اور دوسرا کنزرویٹو پروٹسٹنٹ (Conservative Protestant) اور ظاہر ہے پہلا گروہ نہایت قلیل ہے۔ یوں تو ہر پروٹسٹنٹ وہی عقاید اور جذبات رکھتا ہے جو اسرائیل، بنو اسرائیل اور یہودیت سے قریب تر ہیں لیکن کنزرویٹو بطور خاص اس تعلق سے زیادہ

شدید احساسات رکھتے ہیں۔

انقلاب فرانس سے قبل تقریباً ۱۷۰۰ سالوں بعد روئے زمین پر پہلی یہودی حکومت بحر اٹلانٹک کے اس پار امریکہ میں قائم کی گئی جو آج حکومت ریاست ہائے متحدہ امریکہ (United States of America-USA) کہلاتی ہے۔ چونکہ یہ ایک یہودی حکومت تھی اور امریکہ کا قیام یہودیوں کے مقصد اصلی سے پہلے کی ایک منزل تھی اس لیے اسے نیا بابل (New Babylon) کے نام سے پکارا گیا۔[۲] امریکہ کے قیام کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ روئے ارض سے خلافت اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ اور فلسطین پر قبضہ کر کے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنا اور عظیم اسرائیل سلطنت قائم کرنا امریکہ کا مقصد وجود ہے۔

اس لیے بالکل ابتداء سے اب تک ریاستہائے متحدہ امریکہ میں حکومت اور اس کے ہر نظام کی بنیادی ساخت یہودی فریمسین پروٹسٹنٹ رہی ہے جسے کسی دوسرے تناظر میں WASP White-Anglo-Saxon-Protestant بھی کہتے ہیں جو پوری طرح اس کی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا۔

امریکہ کا پہلا صدر اور اس کا بانی مبانی جارج واشنگٹن نہ صرف یہ کہ ایک کٹر فریمسن تھا بلکہ اس کے بڑے روحانیین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔[۳]

امریکہ کا دستور اور اس کی حکومت، اس کی فوج کی تشکیل، اصول اور مقاصد فریمسن مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ ہر چند کہ یہاں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں تاہم چند ضروری اور اہم امور درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) ریاستہائے متحدہ امریکہ قیام اسرائیل اور باضابطہ قیام حکومت دجال سے قبل کی ایک عبوری حکومت ہے۔ اس لیے "City on the Hill" یعنی Capitol Hill دراصل علامت ہے Mt Zion کی۔

(۲) چونکہ امریکہ عیسائی ریاست نہیں بلکہ ایک یہودی ریاست ہے یہی سبب ہے کہ امریکہ کا سب سے بڑا سرکاری تہوار کرسمس نہیں بلکہ "Thanksgiving" ہے جو دراصل Jewish Festival of Harvest of Succoth کا دوسرا نام ہے۔

(۳) چونکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ یہودی ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ فریمسن توجیہ کی حامل یہودی ریاست بھی ہے یہی سبب ہے کہ دستور امریکہ میں the Declaration of Human Rights دراصل ایک خالص فریمسن ایجنڈہ ہے۔

(۴) ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سرکاری مہر اور نشان the Great Seal of the United States مشہور فریمسن مہر اور نشان ہے۔

(۵) چونکہ امریکہ محض ایک سیاسی وجود کا نام نہیں بلکہ یہودی روحانی سفر کی ایک منزل ہے اس لیے اس کا تقدس پوری طرح اور ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ واضح ہو کہ White House فریمسن اور یہودی روحانیین کی اس مقدس آبادی کو کہتے ہیں جو ہیکل سلیمانی سے باہر دنیا میں کسی جگہ ہو سکتی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے یہودی روحانیین کی تاریخ میں Casa blanca بھی کہتے ہیں۔

(۶) افواج امریکہ کے صدر دفتر اور سپریم کمانڈ ہیڈ کوارٹرز کو Pentagon کہتے ہیں۔ یہ دراصل فریمسنوں کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر یا ڈھال کا نام ہے۔ چنانچہ دنیا میں پائے جانے والے فریمسنوں کے دو احزاب اس علامت کا اظہار دو طرح سے کرتے ہیں۔ ان میں ایک Pentalpha اور دوسرا Hexalpha ہے۔ Pentagon یعنی پنج گوشہ دراصل اسی کا اظہار ہے۔[۴۷] چنانچہ امریکہ کا فوجی ہیڈ کوارٹرز Pentagon دراصل دجال کے ظہور سے قبل ابلیس کی یہودی فوج کا عالمی صدر دفتر ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ حکومت امریکہ دنیا کی پہلی فریمسن حکومت نہیں ہے۔ اپنے قیام کی ترتیب کے اعتبار سے وہ دوسری حکومت ہے اور رتبہ اور وقار کے اعتبار سے بھی دوسری حکومت ہے۔ چنانچہ روئے زمین پر پہلی باضابطہ فریمسن حکومت اور دراصل اس وقت روئے ارض پر قائم تمام فریمسن حکومتوں میں سب کی ماں اور بزرگ ترین حکومت دراصل حکومت برطانیہ ہے۔ اور اس کی روحانیت کی علامت اس کی موجودہ بادشاہت ہے۔ یہ حکومت ۱۶۸۸ میں قائم ہوئی۔ اور وہاں کی بادشاہت نے فریمسن کی روحانی امامت کا مقام اٹھارہویں صدی کے بالکل اوائل میں حاصل کر لیا جو اب تک چلا آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ کی حکومت اور وہاں کے فریمسن روحانیین دراصل حکومت برطانیہ اور یہاں کے روحانیین

کے تابع فرمان ہیں۔اس طرح فریمسن کی دوسری باضابطہ حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے جو ۱۷۷۶ء میں قائم ہوئی۔ فریمسن کی تیسری باضابطہ حکومت حکومتِ فرانس ہے۔ جو ۱۷۸۹ء میں قائم ہوئی۔اس طرح رتبہ کے اعتبار سے اس کی حیثیت تیسری ہے۔ چنانچہ اس وقت فریمسن حکومتوں کی روحانی اور اقتدار اعلیٰ کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

ڈگری 30 32 33 (1)

↓

اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت اسرائیل

↓

اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت برطانیہ

↓

اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت امریکہ

↓

اعلیٰ ترین ذمہ دار حکومت فرانس

یہاں ایک بات ایسی ہے جس کا ذکر کیا جانا بے حد ضروری ہے اور وہ بات ہے گزشتہ دو صدیوں میں عالم اسلام میں ہونے والی سازشوں سے مسلم قائدین، علماء، دانشوران اور عوام الناس کی مجرمانہ حد تک بے خبری۔ کسی قوم کی قیادت کے لیے خواہ وہ قیادت دینی علوم سے متصف لوگوں کی ہو یا عصری علوم سے متصف لوگوں کی اس سے بڑی ناکامی، نااہلی اور بے پروائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پورے دو سو سالوں سے ان کے مابین رہ کر اسلام اور ملت اسلامیہ کے دشمن علانیہ طور پر پوری ملت اسلامیہ کو ذبح کر دینے کی سازش اور تیاریاں کرتے رہے اور وہ اس سے بے خبر رہے۔ کوئی آنکھ دیکھ نہ سکی۔ کوئی کان سن نہ سکا کوئی دماغ سمجھ نہ سکا۔ کوئی دل بے قراری محسوس نہ کر سکا۔ آخر کیوں؟ قیادت وسیادت کے استحقاق کے دعوے، ولایت ونیابت رسول اللہ ﷺ کی اجارہ داری کے اعلانات اور ینظر بنور اللہ کے زمزموں کی کیا یہی حقیقت ہے؟ یہ عاجز پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہر استعماری کوشش خواہ وہ برطانیہ کی ہو یا فرانس کی، ہالینڈ کی ہو یا بلجیئم کی وہ باضابطہ اور منظم طور پر فریمسن کوششیں تھیں۔ بلکہ تاریخ کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۷۸۰ سے لے کر ۱۸۲۱ء تک ہونے والی برطانیہ اور فرانس کے مابین ہر کشمکش کا

صرف ایک ہی عنوان تھااور وہ یہ تھا کہ عالمی فریمسن کے اس اعلیٰ ترین 'ELDER' پر کون باور کرادے کہ فریمسن کے مقاصد کو وہی کسی سے زیادہ احسن طریقے سے پورا کر سکتا ہے لہٰذا وہی اس کا مستحق ہے کہ 'ELDER' اسے اپنا نائب یا خادم خاص بنالے۔ رقابت کی اس لڑائی میں بالآخر فرانس ہار گیااور برطانیہ نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر کے نیابت کا مقام حاصل کرلیا۔ جس کی قیمت نپولین کو سینٹ ہیلسنا میں قید کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ بہر حال فرانس کا درجہ اس صدر نشین نے دوسرا رکھا جواب تیسرا ہے۔

چنانچہ ان تمام قوتوں ـــــ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ یا بلجیم ـــــ کا مقصد اوّلین وہ عالمی فضا تیار کرنا تھا جس کی خواہش مند فریمسن تحریک تھی۔ ان میں سب سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ سلطنت برطانیہ نے کیا۔ جس کا ہر سربراہ اور بطور خاص مرد سربراہ ہمیشہ فریمسن تحریک کا سرگرم رکن ہی نہیں بلکہ عظیم سلطنت برطانیہ کے حدود میں بلا فصل روحانی اور انتظامی سربراہ چلا آتا ہے۔ حکومت برطانیہ سے الگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سارے اعلیٰ عہدے دار عام طور پر فریمسن تھے۔ بعض گورنر جنرل اور وائسرائے ہندوستان فریمسن تحریک کے روحانی اور انتظامی پیشوا بھی رہے ہیں۔

لیکن ان باتوں سے الگ ہٹ کر گزشتہ صدیوں کے دوران استعماری علاقوں میں چار ایسے شعبے ہیں جہاں فریمسن تحریک نے باضابطہ تنظیم اور کاڈر (Cadre) بنائے۔ دراصل یہ وہی شعبے ہیں جن کو بعد میں عالمی تحریک فریمسن سے جوڑ دیا گیا۔ واضح ہو کہ یہ تنظیم اور کاڈر اخص الخواص کاڈر سے الگ ہیں جن میں مسلم نوابان اور راجگان شامل تھے چنانچہ وہ تنظیم اور کاڈر درج ذیل ہیں:

(۱) تعلیم

(۲) سول سروس

(۳) فوج

(۴) عدلیہ

چنانچہ یہ کاڈر ان تمام مسلم ملکوں میں قائم کیا گیا جہاں درج ذیل میں سے کوئی بھی صورت پائی جاتی تھی۔

(۱) وہ مسلم علاقے جو براہ راست مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً برٹش انڈیا بیسویں صدی میں مصر اور سوڈان

(۲) وہ مسلم علاقے جو بالواسطہ مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً رام پور کی ریاست یا سلطنت آصفیہ

(۳) وہ مسلم علاقے جو غیر سرکاری طور پر مغربی استعمار کا حصہ ہوں مثلاً ۱۹۲۳ء کے بعد عراق، ٹرانس جارڈن اور شام۔

(۴) وہ مسلم علاقے جو غیر سرکاری طور پر مغربی استعمار کے اثرات میں ہوں مثلاً: ایران، افغانستان

(۱) تعلیم: تعلیم کے تمام بڑے مراکز Utrecht, Sorbonne, Cambridge, Oxford سبھی فریمسن کے مراکز تھے اور ہیں۔ ان تعلیم گاہوں میں جانے والا ہر مسلم اتنا خوش قسمت نہیں تھا جو اس شعر کا مصداق بنتا۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

مثلاً اس عظیم الشان کیمبرج یونیورسٹی Cambridge University کی حقیقت صرف ایک عنوان میں مضمر ہے اور وہ ہے 'The Cambridge Apostles'۔۔۔ اور اگر کسی کے پاس وہ چشم بصیرت ہو تو وہ آج بھی اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ کیمبرج کے یہ Apostles کون کون تھے؟ کیا کیا تھے؟ کیا کیا بنے؟ اور کیا کیا کیا؟ اگر صرف اس فہرست کو ہی ملاحظہ کر لیا جائے جو رچرڈ ڈیکن Richard Deacon نے اپنی کتاب:

The Cambridge Apostles: A History of Cambridge University's elite Intellectual Secret Society, Robert Royce Limited, London 1985.

کے آخر میں دی ہے۔ تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ Apostles کس مقصد کے لیے یکجا ہوئے تھے اور اس لبادے میں کون چھپا تھا۔

بشتے از خروارے اس فہرست سے صرف چند نام پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس سلسلے کی باقی کڑیاں جوڑی جا سکیں۔

(۱) Balfour, Arthur J. (Ist. Earl)

(۲) Balfour, Francis Maitland,

(۳) Balfour, Gerald William (2nd Earl)

لطف کی بات یہ ہے کہ مصنف رکتاب A.J. Balfour پر درج ذیل حاشیہ تحریر کرتا ہے:

"A. J. Balfour is an unconfirmed member, but because of the evidence for and against, it seems fitting that his name should be recorded."

ترجمہ: اے، جے، بیلفور ایک غیر موثق رکن ہیں ـــــ لیکن ان شواہد کی بنیاد پر جو اس تعلق سے اثبات اور نفی میں پائے گئے ہیں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام رکن کے بطور درج کیا جائے۔

واضح ہو کہ یہ وہی بیلفور ہیں جو اسرائیل کے قیام کے پہلے خطہ تیار کرنے والے اور حکومت برطانیہ کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے Balfour Declaration (۱۹۱۶) کے خالق تھے۔

ہر چند کہ پوری فہرست ایک نگار خانۂ عالم ہے۔ تاہم صرف چند نام اور بیان کر دیئے جائیں تاکہ اس کی دوسری کڑیاں بھی مل جائیں:

(۱) Theodore Beck

(۲) Strachey, (Sir) Arthur

(۳) Strachey, Lytton

(۴) Strachey, J. Beaumont

واضح ہو کہ ان میں تھیوڈور بیک علی گڑھ اور مینٹل کالج کے دوسرے اور پہلے باضابطہ پرنسپل بنائے گئے۔ سر آرتھر اسٹریچی ـــ جان اسٹریچی کے بیٹے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکیل تھے بعدہ بمبئی ہائی کورٹ میں جج اور الہ آباد کے چیف جسٹس (۱۸۹۹ء) ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں شملہ میں انتقال کیا۔ جان اسٹریچی ۱۸۷۴ء میں صوبۂ سرحد کے لیفٹننٹ گورنر تھے۔ اب ذرا ایک اقتباس ایک یہودی مصنف David Lelyveld کی کتاب

Aligarh's First Generation: Muslim Solidarity in British India, Princeton University Press. 1978

سے ملاحظہ فرمائیں:

"The recruitment of young professors from Oxford and Cambridge was consistent with the basic decisions that Sayyid Ahmad had made during his stay in England. Once again the mediating role was played by Sayyid Mahmud, who returned to Cambridge on a visit in 1883 with the intention of finding a successor to Siddons. The man selected, Theodore Beck, was presented to Sayyid Mahmud at Trinity College by John Strachey's son, Arthur ..... Beck had grown up in London ..... Beck took his Tripos examinations in mathematics, and was also elected to the elite **secret society** called the **'Apostles'**."

ترجمہ:

(علی گڑھ میں قائم مسلم اینگلو اورینٹل کالج کے) نوجوان پروفیسروں کی آکسفورڈ اور کیمبرج سے بحالی ٹھیک اس بنیادی فیصلے کے عین مطابق تھی جو سر سید احمد خاں نے اپنے قیام انگلینڈ کے زمانے میں کیے تھے۔ ایک بار پھر سید محمود نے واسطہ کا کردار ادا کیا جو ۱۸۸۳ میں سڈن کی جگہ لینے والے پرنسپل کی تلاش میں کیمبرج گئے تھے۔ منتخب شخص ـــــ تھوڈور بیک ـــــ سید محمود کے سامنے جان اسٹریچی کے بیٹے آرتھر کے ذریعہ ٹرینٹی کالج میں پیش کیے گئے ـــــ بیک لندن میں پلے بڑھے تھے۔... بیک نے ریاضی میں ٹرائپوس امتحان لیا تھا ـــــ اور ان کا انتخاب اس اعلیٰ ترین خفیہ سوسائٹی میں بھی ہوا تھا جسے اپوسلز (Apostles) کہا جاتا تھا۔

اس اقتباس کے اندراجات کی مزید تصدیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(1) Aligarh Institute Gazette, Sept 7, 1886,

(2) Dictionary of National Biography 1901-1910 P.439

چنانچہ برطانوی غلامی کے عہد میں ۱۷۶۵ء سے ۱۹۴۷ء تک تعلیم کے میدان میں جو

سرکاری یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری کوششیں ہوئیں ان کی حقیقت کیا تھی؟ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ مدرسہ، مدرسہ غازی الدین حیدر دہلی، دہلی عربی کالج، سلسلۂ مدرسہ عالیہ، مدرسہ ایجوکیشن بورڈ اور دیگر سلسلوں کی حقیقت تو جانے دیجئے ان میں صرف ایک سلسلۂ تعلیم یعنی علی گڑھ مدرسہ جو بعد میں علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف ہوا اس کی حقیقت اس سلسلۂ نسب سے بخوبی جانی جاسکتی ہے۔

(۴) سول سروس: ایسٹ انڈیا کمپنی ہو یا سلطنت برطانیہ ـــــ سول سروس (Civil Service) اس کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ برطانوی استعمار میں سول سروس کا باضابطہ آغاز جس تعلیم گاہ سے ہوا وہ برطانیہ کے مقام ہیلی بری Haileybury کی تعلیم گاہ ہے۔

برطانیہ کا یہ مقام وہ اہم مرکز ہے جہاں سے فریمسن تحریک پوری سلطنت برطانیہ کی رگوں میں دوڑنے کے لیے نکلتی تھی۔ پوری انیسویں صدی میں ہر سول سرونٹ اسی منبل سے پانی پی کر آرہا تھا۔ لہٰذا اصلاً یہ وہی ہیلی بیرین (Haileyburian) ہیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے سے بیک بینی و دو گوش بیدخل کر دیا۔ ان کے ہی وہ کارنامے ہیں جن کا ایک انفجار ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ (Peter Penner: The Patronage Bureau cracy in North India, Chanakya Publication, Delhi - 1986) لیکن ۱۸۶۰ء تک یہ طبقہ آسمان کی طرح پھیل چکا تھا۔ چنانچہ بعد کے دنوں میں جب ہند نژاد مسلمان سول سروس میں آنے لگے تو انہیں ترقی کا سب سے آسان زینہ فریمسن تحریک میں شمولیت کا ملا۔ اور یہ ایک ہولناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد جو سول سروس میں تھی وہ فریمسن ہو گئی یا کم از کم اس کے لیے نرم گوشہ رکھنے لگی یا اس کی آلۂ کار بن گئی تاکہ اعلیٰ حکام کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ چنانچہ ہندوستان ہو یا مصر، ٹرانس جارڈن ہو یا عراق انہوں نے وہی کیا جو فریمسنری کے مقاصد کے تحت ضروری تھا۔ ہندوستان میں تقسیم ملک سے قبل ہر مسلمان سول سرونٹ (ہمارے کرم فرما بزرگ جناب منظور احسن جامعی مرحوم کے تجزیے اور روایت کے مطابق) چودھری محمد علی نہیں تھا۔ چنانچہ دنیا میں ہر جگہ مسلم عوام کی امنگوں کا خون جن مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا ان میں سے ایک یہ مسلم سول سرونٹ بھی تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح نے جن کے قدموں کے شل ہو جانے (Cold Feet) کا طعنہ دیا تھا وہ صرف فوج نہیں

تھی بلکہ سول سرونٹ بھی تھے جو قوم اور اسلام سے زیادہ فریمسنری کی خدمت کر رہے تھے۔

**(۳) فوج:** برطانیہ ہو یا فرانس فریمسنری کا سب سے منظم کاڈر فوج میں قائم تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں برطانوی فوج تو فریمسنری کا اپنا ہی دستہ تھی۔ صورتحال اتنی غیر معمولی تھی کہ فوج اور فریمسنری تحریک برطانیہ کے تمام استعماروں میں بشمول ہندوستان میں شانہ بہ شانہ ہی نہیں بلکہ یکجان ہو کر چل رہی تھی۔ یعنی ہندوستان میں قائم ہر فوجی کنٹونمنٹ دراصل اس علاقے میں فریمسنری کا صدر دفتر بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ صورت حال یکساں طور پر پوری اٹھارہویں صدی، انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں برقرار رہی۔ واضح ہو کہ یہ صورت حال صرف ہندوستان ہی میں نہیں تھی بلکہ برطانیہ، فرانس اور اس کے ہر استعمار یا زیر اثر علاقے میں تھی۔ برطانیہ اور فرانس میں قائم تمام اعلیٰ تعلیم کے عسکری ادارے دراصل اس کے مراکز تھے جہاں سے نکلنے والے افسروں میں سے اسی فیصد فریمسن ہو کر نکلتے تھے۔ یہ روایت آج بھی برقرار ہے۔ مسلم ملکوں کی فوجوں نے گزشتہ ۱۰۰ سالوں سے جو فساد برپا کیا ہے خواہ وہ مصر میں ہو یا شام، عراق، یا پاکستان میں یا انڈونیشیا میں اس کا راز اسی عنوان میں ہے۔ عالم عرب میں بعث کی حقیقت پانا بہت مشکل نہیں۔ اخوان المسلمین کے ساتھ مصر، شام اور عراق کے فوجی حکمرانوں کا وحشیانہ سلوک اور کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ سب کی تشریح اسی باب میں مل سکتی ہے۔ اسی میں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے آزاد اور خود مختار ہونے کے بعد بھی ۱۹۵۶ء تک اس کی فضائی فوج کا نام The Royal کے ساتھ کیوں شروع ہوتا تھا۔ حسن ظہیر (Hasan Zaheer) کی The Times And Trials of Rawalpindi Conspiracy 1951 (OUP, Karachi 1998) اور یہودی مصنف اسٹفن کوہین (Stephen Cohen) کی (The Pakistan Army, OUP, Karachi.1998) تو صرف جزوی اور سطحی واقعات کی کتابیں ہیں۔ ایر کموڈور انعام الحق (Inamul Haq) صاحب ایک سادہ اور طبعاً شریف آدمی تھے لہٰذا انہوں نے صرف آپ بیتی تک محدود ہو کر جو کچھ لکھا ہے وہ Tip of an Iceberg کے برابر بھی نہیں۔ اور انعام الحق صاحب ان تہہ خانوں تک جا بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ مسلم ملکوں کی فوجوں میں فریمسن تحریک کے تہہ خانوں تک پہنچنا بہت آسان نہیں۔ چنانچہ انعام الحق صاحب نے جو کچھ اپنی کتاب

"Memories of Insignificance: Daru -ut-Tazkeer, Lahore, 1999.

میں لکھا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی روشنی۔

۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی فوج کے افسروں میں دین دار افراد کی تعداد یقیناً بڑھنا شروع ہوئی جو ۱۹۷۱ء کے بعد اور تیز ہو گئی لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ فریمسن افسروں کا کاڈر کمزور ہو گیا۔ پورے ملک میں پھیلے سیاست دانوں، ریٹائرڈ فوجی افسروں، عدلیہ، بیوروکریسی، فارن ڈپلومیٹس اور تعلیمی اداروں میں ان کے مضبوط اور منظم کاڈر اور دوسری جانب دین دار طبقات ـــــ علماء، تحریکات اسلامی اور عام دینی مزاج رکھنے والے عوام ـــــ کی پھپھوندی لگی ہوئی اور سڑی ہوئی ـــــ علمی، عقلی، تجزیاتی، احتسابی اور عملی فضا نے ـــــ جن میں قرآن، سنت اور تاریخ اسلامی کی گہرائیوں سے عمومی لاعلمی، اپنے علم و عقل اور اسلام کے فہم کو آخری سمجھنا، اسلام اور دین اللہ کی حفاظت سے زیادہ اپنے ہوائے نفس سے بنائے گئے تشخصات کی حفاظت کی فکر کرنا، علمی، فکری اور عملی دنیا میں ایسی باتوں کو مسلمات سمجھنا جو خود قیاس مع القیاس بلکہ قیاس علی القیاس پر قائم ہوں ـــــ فریمسن جیسے ذہین طبقے کو مستحکم ہونے میں مدد دی ہے۔ برصغیر کے علماء ہوں یا تحریک اسلامی کے افراد وہ جس Stale اور Stereotyped علمی، فکری اور عملی قوت کو بروئے کار لا رہے ہیں اس سے چیخ پکار کی فضا تو برقرار رکھی جا سکتی ہے لیکن قوموں کی تاریخ بدلی نہیں جا سکتی چہ جائے کہ اس سے امت محمدیہ مستجابہ کے فرائض منصبی کی ادائیگی۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کے تعلق سے جو ذمہ داری جنوبی ایشیا کے مسلمانوں پر عائد ہو گئی ہے اے کاش وہ اس تاریخی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے حضرت علامہ اقبال کا شاہین نہ بن سکتے تو نہ سہی کم از کم امراء القیس کے گھوڑے کی طرح تو ہو جاتے

مکر مفر مقبل مدبر معاً

کجلمود صخر حطة السیل من عل

۱۹۷۱ء اہل پاکستان کے لیے عام الحزن کی طرح آیا لیکن دین دار طبقات کی جہالت اور عجب نے اس موقع کو گنوا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان دیندار طبقات کی جدوجہد سے نہیں بلکہ قدرت کی اپنی سنت کے تحت (خدا شری برانگیزد کہ خیری مادراں باشد) تقسیم ملک کے بعد پہلی

بار وہاں ایک Tectonic Upheavel آیا تھا جس میں بہت گہرائیوں میں پوشیدہ رہنے والی زیر زمین تہیں بھی ابھر کر اوپر آگئیں تھیں اور تھوڑی سی تفتیش بھی اہل پاکستان کو پورے عالم اسلام میں پھیلے عدم استحکام کے ذمہ دار عفریتوں سے آگہی دلا سکتی تھی۔ لیکن چونکہ یہ دین دار طبقہ بالکل ہی سادہ لوح تھا لہٰذا بہت جلد ان ذہین لوگوں نے سب کچھ برابر کر دیا اور وہ تہیں پھر زمین کی گہرائیوں میں چلی گئیں۔ حمود الرحمٰن کمیشن کا ریفرنس ہر چند کہ بہت حاوی اور جامع نہیں تھا تاہم بہت غنیمت تھا۔ لیکن کیا یہ صرف حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ حقائق کا پتہ لگاتی؟ کیا قومیں حکومت کے بل پر جیا کرتی ہیں؟ عین ممکن ہے کہ جناب الطاف گوہر کی یہ بات درست ہو کہ ۱۶ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بعض لوگوں کا کورٹ مارشل ہوا تھا لیکن عام طور پر پھیلی ہوئی یہ بات قطعاً درست نہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن کے ذریعہ سامنے لائے جانے والے حقائق اس لیے (Intern) کر دیئے گئے کہ اس سے قوم کا مورال مجروح ہوتا۔ حقیقت یہ نہیں بلکہ اصلی حقیقت یہ تھی کہ اس رپورٹ میں بالیقین کچھ ایسے شواہد ضرور سامنے آگئے ہوں گے جن سے ان طبقات کی سازش کا علم ہو جاتا جو عالمی سطح پر اسلام اور اہل اسلام کے عدم استحکام کا سبب چلے آرہے تھے اور اسی کے ذیل میں ان افراد کی حقیقت کا بھی علم ہو جاتا جو ۱۹۴۷ء سے اب تک اپنے مقاصد میں سرگرم رہے تھے۔ چند جنرلوں اور بیوروکریٹس کو قربان کر کے اگر اصلی حقائق پوشیدہ رہ جاتے تو یہ ایک آسان سودا تھا۔ اور ایسا ہی کیا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ پوری طرح شائع بھی کر دی جاتی جب بھی یہ دیندار طبقہ اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اگر اس میں وہ بنیادی صلاحیت اور آمادگی پائی ہی جاتی تو کیا دنیا میں دیگر جگہوں پر پھیلے حقائق کم چشم کشا تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دیندار طبقہ نے قسم کھالی ہے کہ وہ نہ اپنے اوپر نظر ثانی کرے گا نہ اپنا احتساب کرے گا نہ خود کو حقیقی اسلام کے سائے میں لائے گا بلکہ طرح طرح کے شرعی جہالت کے حیلوں سے اپنے جمود اور تعطل کو سند جواز عطا کرے گا۔

کیا ان حضرات کو اس کا علم ہے کہ لندن میں قائم عالمی گرینڈ لاج (The Grand Lodge, London) کو کلکتہ سے ۲۸ دسمبر ۱۷۲۸ء کو لکھی گئی ایک درخواست پہنچی تھی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ فریمسنری کی عالمی تحریک برصغیر میں باضابطہ فریمسنری کے قیام اور اس کے لاج (Lodge) کو سند تقدیس (sign of Consecration) عطا کرے۔ جس کے

بعد ۶ فروری ۱۷۲۹ء کو برصغیر میں پہلا فریمسن لاج The Lodge at Fort William قائم کیا گیا اور اسی سال یعنی ۱۷۲۹ء میں کیپٹن رالف فارونٹر (Captian Ralph Farwinter) کو "Provincial Grand Master of East India in Bengal" اور جیمس ڈاؤسن (James Dowson) کو "Provincial Grand Master of East India" مقرر کیا گیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے فریمسن کی شاخیں بلوچستان کی ایرانی سرحد سے لے کر بشمول افغانستان ـــــ رنگون تک اور کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک قائم ہو گئیں۔ ظاہر ہے جب ملک تقسیم ہوا اور پہلے بھارت اور پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش وجود میں آئے تو ان میں بھی انتظامی تبدیلیاں لائی گئی ہوں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں فریمسنری کی قوت، اقتدار اور صورت حال اور اس سے وابستہ افراد کا انداز صرف اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بھارت میں فریمسنری کی ساری ذمہ داری ایک ایسی ذات کے کاندھوں پر ڈال دی گئی جو ساری دنیا کے فریمسن اکابر میں ان کے اپنے مطابق اپنے تقویٰ، فکری اصابت اور فریمسنری سے وابستگی کے اعتبار سے عظیم المرتبت تھی اور بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس ذات نے ہندوستان کے فریمسن اکابر میں تقدس کا وہ مقام حاصل کیا جو کسی غیر برطانوی اور غیر یہودی کو کبھی نہیں مل سکا ہوگا۔ اور وہ ذات گرامی کوئی اور نہیں بلکہ نواب مشتاق علی خاں کے پوتے اور نواب سر حامد علی خاں کے بیٹے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرزند ارجمند اور ۱۹۳۰ء سے ریاست رامپور کے نواب ـــــ میجر جنرل ہز ہائنس ڈاکٹر نواب سید رضا علی خاں بارٹ، جی سی آئی ای، کے سی ایس آئی، ڈی لٹ، ایل ایل ڈی ہیں۔

جب ۱۹۶۱ء میں نواب سید رضا علی خاں کا انتقال ہوا تو عالمی فریمسنری تحریک میں ان کا سورج نصف النہار پر تھا۔ عالمی فریمسنری کے ایک بڑے قائد کے الفاظ میں "عالمی فریمسنری نواب صاحب کے خدمات جلیلہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور اس سے ہمیشہ Inspiration لیتی رہی گی۔"

۱۷۲۹ء میں برصغیر میں قائم ہونے والی فریمسنری تحریک نے ۱۵ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۹۸ء کو اپنے دہلی اجلاس میں اس کا فیصلہ کیا ہے کہ یہ تحریک اب اس مقام پر آگئی ہے کہ برصغیر میں اپنی سرگرمیاں علانیہ طور پر انجام دے۔ کیا ۱۹۹۸ء کے اوائل سے یہ محسوس نہیں کیا جارہا ہے کہ

اچانک برصغیر کا موسم بدل چکا ہے۔ اہل نظر لوگوں کی نگاہ میں کارگل کا پورا واقعہ (Episode) اور اس کا تسلسل رد عمل (Chain Reaction) عالمی فریمسنری کی ایک سوچی اور سمجھی اسکیم تھی جس کی پہلی سطح مذہبی اور دینی تھی۔ اس لیے کہ جذباتی اور گہری معلومات اور تجزیاتی قوت سے محروم علماء اور تحریکات اسلامی کے افراد کے لیے یہ نعرے بے حد ہوش ربا ثابت ہوتے ہیں اور ان نعروں کے بلند ہوتے ہی ان کی رہی سہی قوت مدرکہ بھی معطل ہو جاتی ہے اور یہی موقع ہوتا ہے فری مسنری کا اپنے کسی گرینڈ پلان (Grand Plan) کو عملی شکل دینے کا۔ چنانچہ اس واقعے کے پہاڑ کے پیچھے فریمسنری کی عالمی فوج کھڑی تھی اور اس نے بڑی چابکدستی سے پوری ملت اسلامیہ کو آئندہ چند سالوں کے لیے جملۂ معترضہ کے ہفت خواں طے کرنے کے لیے بھیج دیا اور اس دوران وہ اپنا عالمی پلان پورا کرلیں گے۔ اس عاجز نے پوری ملت کو "یا ساری الجبل!" سے پکارا لیکن ایسا لگتا ہے کہ صرف اہل حل وعقد ہی ان الفاظ اور ان کی معنویت سے نا آشنا نہیں بلکہ بیشتر تحریکات اسلامی کے افراد بھی ان کی ہی طرح بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔

چونکہ فی زمانہ علماء اور تحریکات اسلامی کے بیشتر افراد جو مغرب سے سخت تشویش رکھنے کے باوجود اس سے حد درجہ مرعوب اور لاشعور کی سطح پر اس کے بے حد مشتاق ہیں اور اس لیے ان میں اکثر مغربی ملکوں کے اسفار اور اس نگار خانہ کی سیر کو اپنی عظمت اور مقبولیت اور رسوخ فی الدین کے لیے سند سمجھتے ہیں ـــــ نہ مشرق میں رہ کر مغرب کی حقیقت سمجھ پاتے ہیں نہ مغرب جاکر۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت پوری ملت کے پاس امت کا اپنا کوئی آزاد عالمی منصوبہ نہیں۔ اور ملت کی ساری سرگرمیاں خواہ تحریکی ہی کیوں نہ ہوں فی الواقع مغرب کے چھیڑے ہوئے ساز پر منفی اور مثبت رد عمل کے سوا کچھ نہیں۔

بہر حال ہم ان جملہ ہای معترضہ کے بعد پھر اسی سلسلۂ بحث کی طرف واپس آتے ہیں جہاں ہم مسلم ملکوں کی فوجوں کا ذکر کر رہے تھے۔ لہٰذا ان تمام حقائق کے باوجود اس عاجز کی باتوں کا یہ مطلب قطعاً نہ لیا جائے کہ مسلم ملکوں کی فوجوں میں سارے کے سارے افسر اسی قبیل کے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان فوجوں میں قوت ایمانی اور تقویٰ سے لبریز ایسے ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان میں سے کسی دستے میں ایک شخص کی موجودگی بھی فرشتوں کی پوری فوج کے اترنے کا باعث بن سکتی ہے۔

(۴) عدلیہ: عہد حاضر میں فریمسنری کی سب سے باوقار اور خاموش تنظیمیت کی علامت مغربی طرز پر قائم عدلیہ ہے جو تقریباً تمام مسلم ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ اس کی شروعات انیسویں صدی میں برطانیہ کے Lincoln's Inn اور فرانس کے قانون کے مراکز سے ہوئی تھی لیکن چونکہ عدلیہ کے باوقار حضرات عام معاشرے سے الگ تھلگ اور بااثر ہوتے تھے لہٰذا تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تقریباً تمام ہی مسلم ملکوں میں فریمسنری کو رائج کرنے میں مغربی طرز کی عدلیہ کا کسی سے کم ہاتھ نہیں۔ عام طور پر فریمسنری کی سریت ججوں کے پروقار لبادے میں بآسانی چھپ جاتی تھی۔ اور آج بھی اس کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ عبوری حکومتِ دجال (اقوام متحدہ) کی تمام Supra- State Activities میں یہی برسرکار اور ریٹائرڈ جج سب سے پیش پیش ہیں۔

ان تفصیلات سے کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ مسلم ملکوں کی تعلیم گاہوں، سول سروس، فوج اور عدلیہ کے سوا دیگر شعبوں میں فریمسنری کے کاڈر موجود نہیں۔ یہ کاڈر ہر جگہ ہیں یا کم از کم ان میں انفرادی طور پر منسلک و مربوط افراد خواہ وہ سیاسی پارٹیاں ہوں، NGO's ہوں یا بعض طبقاتی تشخصات مثلاً: ڈاکٹر، وکلاء، انجنیئر، حتی کہ علماء، پیر صاحبان اور مشائخ بھی۔ جو بات بے حد افسوسناک ہے وہ یہ ہے کہ پورے عالم اسلام کے سب سے بیدار مغز طبقات یعنی تحریکات اسلامی میں بھی اس تعلق سے بے خبری ہی بے خبری پائی جاتی ہے۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ ان کے یہاں بھی فریمسنری نے انکلیو (Enclave) بنالیے ہیں۔ میں نے عالم اسلام کی ایک بہت بڑی تحریک اسلامی کے بڑے قائدین میں سے ایک سے اس تناظر میں بات کی۔ میں نے ان کے سامنے اس صورت حال کو ایک مسئلے کی شکل میں رکھا۔ میں نے پوچھا:

اگر کوئی شخص تحریک میں ہو اور اس کی تنظیمی سرگرمیاں دستور کے مطابق بظاہر اطمینان بخش ہوں اور اس میں کسی غفلت اور تعطل کا احساس نہ پایا جاتا ہو بلکہ وہ دوسرے سے یا سب سے زیادہ سرگرم نظر آتا ہو اور کسی ذریعہ سے قائد تحریک کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ شخص کسی خطرناک اسلام دشمن تحریک سے وابستہ ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت بھی نہ ہو تو دستور کے مطابق قائد اسے تحریک میں رہنے یا اسے ذمہ دارانہ منصب تک پہنچنے سے کیسے روک سکتا ہے جب کہ صورت حال یہ ہو کہ دستور میں کسی منصب کی اہلیت جو بتائی گئی ہے اس کا فیصلہ عام ارکان کرتے ہیں جن کی بڑی

تعداد کو نہیں معلوم کہ مثلاً: عالم بالکتاب والسنہ ہونے، رسوخ فی الدین کا حامل ہونے یا اہل الرائے ہونے کا حقیقی اور مطلق مفہوم کیا ہے بلکہ عام طور پر وہ اسکے معروف مفہوم کو ہی جانتے ہیں جن میں مطلق کے بجائے اضافی صورت حال کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے اور عام طور پر تحریکات میں وابستگی اور اہل الرائے ہونے کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ مثلاً کون اپنی تحریروں یا تقریروں سے جو عموماً زیادہ ہوتی ہیں کتنا نمایاں ہے۔ اور بطور خاص اس صورت حال میں کہ اگر:

(۱) قاید بلا ثبوت اسے تحریک سے ہٹانا چاہے تو اسے غیر دستوری قرار دیا جائے گا یا

(۲) قاید ثبوت نہ ہونے کی صورت میں یا اس کے باوجود اس کے بارے میں تحفظات کا در پردہ یا علانیہ اظہار کرے تو اسے غیبت بلکہ بہتان یا نجوئی قرار دیا جائے گا۔

تو ان بزرگ قائد نے جواب دیا: بلاشبہ دستور میں تو ایسی کوئی شق نہیں ہے جس کے ذریعہ کسی ایسے شخص کو دستوری طور پر اعلیٰ مناصب تک پہنچنے سے روکا جاسکے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ ذی حیثیت اور باوقار بھی ہو۔ لیکن "ہم تحریک اسلامی کے افراد کی اصابت رائے اور اجتماعی شعور سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ شخص بہت دنوں تک چھپ کر نہیں رہ سکتا۔"

میں نے جواباً پوچھا:

"کیا آپ کی یہ بات آپ کا تصوراتی خیال ہے یا اعتماد یا اس کے پیچھے کوئی واقعہ ہے جس کے تجربے کے بعد آپ اس نتیجے تک پہنچے ہیں۔"

انہوں نے جواب دیا:

"یہ میرا خیال ہے اور مجھے اس پر اعتماد ہے۔"

تب میں نے ان کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اس لیے کہ کم از کم ایک ایسے شخص کی حقیقت پا لینے پر اللہ نے اس عاجز کو قدرت دے دی تھی جو پچھلے چالیس سالوں سے رکن ہی نہیں ذمہ دارانہ مناصب پر بھی رہتا آیا تھا اور اسلام دشمن قوتوں سے براہ راست منسلک بھی تھا حتی کہ اس کا اسلام بھی مشتبہ تھا۔

دراصل گزشتہ کئی صدیوں سے اس امت کی صورت حال ناگفتہ بہ حد تک خراب ہو چکی ہے۔ عالم عرب تو ساتویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہی مرگ نما خوابیدگی کی حالت میں چلا گیا تھا اور عالم ترک پر یہ کیفیت سترہویں صدی میں طاری ہو گئی۔ برصغیر پورے عالم اسلام

میں سب سے بہتر حالت میں تھا۔ اور پھر اس پر اللہ کی بے حد و حساب عنایات بھی ہوئیں۔ لیکن یہاں کے جمہور علماء اور مسلم حکمران، فی الواقع بد بخت ثابت ہوئے۔ جس خطے کو تین سو سالوں کے اندر حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت علامہ اقبال رحمہم اللہ علیہم اجمعین جیسی شخصیات دی گئی ہوں اور اس قوم کے جمہور علماء اور حکمرانوں نے انہیں قوم کی علمی و فکری اور روحانی مجرئی سے نکال کر آثار الصنادید بنادیا ہو ان جمہور علماء اور حکمرانوں بلکہ اس پوری قوم کو بد بخت ہی کہا جاسکتا ہے۔ برصغیر کے کسی بھی مکتب خیال کی دینی درس گاہ کے نصاب ان تینوں کے افکار، ان کے تجزیوں حتی کہ ان کی کتابوں سے خالی ہیں۔ ان کا ذکر خواہ کتنا ہی احترام سے کیوں نہ کیا جاتا ہو لیکن اس پورے ذخیرۂ علم میں جس کو دینی علوم کہتے ہیں ان حضرات کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اگر معاشرے کے دیگر ذرائع سے جنہیں دراصل غیر مستند مصادر علم (Apocrypha) سمجھا جاتا ہے کوئی استفادہ نہ کرے تو وہ اس سے بھی نابلد رہے گا کہ ان ناموں کے لوگ اس خطے میں کبھی پیدا بھی ہوئے تھے۔

ان تینوں حضرات کی نہاد نبویانہ تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ روئے ارض پر ختم نبوت سے پہلے انہیں پیدا کرتا تو ضرور یہ تینوں انبیاء کی صورت میں آتے۔ اور اب جب کہ یہ حضرات قدس تشریف لائے تو ان کے ساتھ جمہور علماء امت اور حکمرانوں نے وہی سلوک کیا جیسا علماء یہود نے انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا۔

چنانچہ امت کا یہی جمود اور تعطل ہے جس نے ایسی مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی ہے جس کا ذکر بھی دل کی دھڑکن روک دینے کے لیے کافی ہے۔ غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ان حضرات کو اس کا قطعاً احساس بھی نہیں ہے۔ چنانچہ برصغیر کے علماء اگر واقعی اپنے دعوے کے مطابق ورثۃ الانبیاء ہوتے تو جن 'نیک کاموں' کی طرف وہ سن ۲۰۰۰ میں توجہ فرما رہے ہیں یعنی مغرب کی حقیقت سمجھنے کے لیے انگریزی پڑھنا اور کمپیوٹر ٹائپسٹ پیدا کرنا تو ان کو چاہئے تھا کہ ان کاموں کی طرف ۱۷۱۷ اور ۱۷۳۸ء کے مابین توجہ فرماتے۔ ان علماء کرام کا ذکر تو خیر جانے دیجئے فی الواقع امت کا سب سے بیدار سمجھا جانے والا طبقہ یعنی تحریکات اسلامی کا عمومی حال بھی کچھ زیادہ امید افزاء نہیں۔ ان کے بعض طبقات سن ۲۰۰۰ میں ان کاموں کی طرف توجہ فرما رہے ہیں جن کی جانب امت کو ۱۸۲۸ء اور ۱۸۴۳ء کے مابین توجہ کرنی چاہئے تھی۔ کیا انہیں معلوم

نہیں کہ دجال کا ہراول دستہ سن ۲۰۰۰ میں ان منصوبوں پر عمل در آمد کر رہا ہے جو اس نے ۱۹۰۱ء میں سوچے تھے۔ اور اپنی تجربہ گاہوں میں ان منصوبوں پر تجربے کر رہا ہے جو اسے ۲۰۸۰ میں کرنے ہیں اور اس کے دماغ ان امور پر Hypothesis قائم کر رہے ہیں جو ۲۱۰۰ کے بعد پیش آسکتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں آنے والی ایک خبر تو اتنی وحشت ناک ہے جس پر سنسکرت کا ایک محاورہ ہی یاد آتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

وِنَاشَ کَالے وِپَرِیتَ بُدِّھی

(جب بربادی کے دن آنے ہوتے ہیں تو عقل خبط ہو جاتی ہے)

خبر ملاحظہ فرمائیں:

"اسلام آباد": انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور امریکن سینٹر اسلام آباد نے اسلام، مسلم دنیا، اسلامی تحریکات، انسانی حقوق اور خواتین کے مسائل پر انٹرنیٹ پر موجودہ ویب سائٹس کا تعارف کرانے کے لیے ایک مشترکہ پروگرام کا انعقاد کیا۔ جس کا موضوع "اسلام آن دی انٹرنیٹ" تھا۔ امریکن سنٹر کے کنٹری لائبریری ڈائرکٹر اسلم مجاہد نے انٹرنیٹ پر موجود ان تنظیموں اور اداروں کا تعارف کرایا جو انٹرنیٹ پر اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کی اسلام کے حوالے سے انٹرنیٹ پر ویب سائٹس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکی یونیورسٹیوں، حکومتی اداروں نے اس سلسلے میں بے شمار کام کیا ہے۔ اسلم مجاہد نے اس ضمن میں مسلم پبلک افیئر کونسل، مسلم ووسن لیگ، اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ، امیرکن انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز اور دیگر کئی ویب سائٹس دکھائیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اور متعلقہ موضوعات کو انٹرنیٹ پر کتنی کوریج دی جاتی ہے۔ امریکی سینٹر کے انفارمیشن ریسورس آفیسرز ہنری میڈسن نے ان سہولیات کے بارے میں حاضرین کو آگاہ کیا جو تحقیقات کاروں، پالیسی سازوں، حکومتی افسران اور صحافیوں کو مہیا کرتے ہیں۔.....

(روزنامہ جسارت، کراچی، ۲۹ جون ۲۰۰۰ء)

عقل و دل و نگاہ کا مرکز اوّلین ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف

نومبر ۲۹، ۱۹۴۷ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد پاس کر دی کہ فلسطین کو منقسم

کردیا جائے اور وہاں یہودیوں کی ایک (مصنوعی) ریاست قائم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو شام سے ذرا قبل سلطنت اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ وہی وقت تھا جس کے ٹھیک چند گھنٹوں کے بعد لیگ آف نیشنز (League of Nations) اور بعد ہا اقوام متحدہ (U.N.O) کے انتداب فلسطین کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس تسلسل کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے مشہور یہودی تاریخ داں برنارڈ مارٹن (Bernard Martin) نے اس طرح بحث کی ہے:

"Within minutes after the news of Isreal's Declaration of Independence flashed across the White House teletype, President Harry S. Truman, ignoring the Counsels of State Department and the American officials, extended de facto recognition to the new state. Three days later the government of the Soviet Union, which --- to general surprise had supported Palestine partition resolution inthe United Nations, granted de jure recognition. Most other non-Arab nations quickly followed the United States and Russia, only Great Britain grudgingly with holding recognition as long as it could."

(Bernard Martin: A History of Judaism, Basic Books, Inc, Publishers, N.Y. 1974 Vol.II P-441.)

ترجمہ:

"صدر امریکہ ہیری، ایس، ٹرومین نے ـــــ وہائٹ ہاؤس کے ٹیلی ٹائپ کے ذریعہ اسرائیل کے اعلان آزادی کے چند ہی منٹوں کے اندر ـــــ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے مشیروں اور دوسرے امریکی افسران کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ـــــ اس نئی ریاست کو حقیقی ریاست کے اعتبار سے تسلیم کر لیا۔ تین ہی دنوں کے بعد ـــــ سوویت یونین کی حکومت نے بھی ـــــ حیرتناک طور پر اسے باضابطہ ریاست کے اعتبار سے تسلیم کر لیا ـــــ جبکہ سوویت یونین نے فلسطین کی تقسیم کے رزولیوشن کی حمایت کی تھی۔ بیشتر غیر عرب قوموں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کا اتباع کیا (اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا) سوائے برطانیہ کے جس نے اسے تسلیم کرنے کو

اس وقت تک ٹالا جب تک (ایسا کرنا اس کے مفاد میں تھا)۔ (بالآخر اس نے بھی اسے تسلیم کرلیا۔)

اس سے بڑا ڈرامہ دوسری جانب ہو رہا تھا چنانچہ دوسرے دن پانچ عرب ریاستوں — عراق، مصر، لبنان، شام اور ٹرانس جارڈن کی فوجوں نے نئی اور ناجائز ریاست اسرائیل پر حملہ کردیا۔

عالم عرب کے مخلص مسلمانوں کی سادگی اور ان کے فری میسن حکمرانوں، ان کی فری میسن فوج، بیوروکریسی اور سفارت کاروں کی منافقت اور ان کی جنگ زرگری کا نقشہ ایک دوسرے یہودی تاریخ داں میکس آئی ڈیمونٹ (Max.I.Dimont) نے یوں کھینچا ہے:

"The Israeli War of Independence (1948-1949) contains all the elements of drama, intrigue, and luck that one associates with a historical novel. This clash of destinies began when the British Empire folded its Palestinian tents, hauled down the Union Jack, and departed. Five Arab armies, led by the spiritual successor to T.E. Lawrence --- General John Bagot Glubb, honorary Pasha --- immediatly swooped down upon Israel from all directions, announcing in their first communique that within a week the fighting would be over and the Jews driven into the Sea."

(Max.I. Dimont: Jews, God and History, Mentor N.Y. 1962, P-423)

ترجمہ:

کسی تاریخی ناول کی طرح اسرائیل کی جنگ آزادی (۱۹۴۹۔۱۹۴۸ء) بھی اپنے اندر ڈرامہ، سازش، اور مقدر کے تمام عناصر رکھتی ہے۔ (اسلام اور یہودیت کے) مقدر کا تصادم اس وقت شروع ہوا جب برطانوی سامراج اپنے فلسطینی خیمے کو گرا کر یونین جیک کو اتار کر رخصت ہو گیا۔ چنانچہ پانچ عرب فوجیں لارنس آف عربیا کے جانشین اور وارث جنرل جان بے گوٹ گلب جو اعزازی طور پر پاشا سے ملقب تھا کی قیادت میں تمام سمتوں سے اسرائیل پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اپنے پہلے ہی سرکاری اعلان میں (عربوں کے ذریعہ) کہا گیا کہ جنگ محض ایک ہفتے میں ختم ہو جائے گی اور یہودیوں کو

سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔

اسی مقام پر اس بات کی وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ سلطنت برطانیہ، سلطنت امریکہ اور سلطنت فرانس کے قیام اور استحکام کے بعد اور مزعومہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے قبل لازم تھا کہ ایک عبوری عالمی حکومت قائم کی جاتی اور اس کے زیر سایہ سلطنت اسرائیل کا قیام ہوتا۔ چنانچہ یہی عبوری عالمی حکومت مجلس اقوام متحدہ UNO ہے۔ جسے ابتداءً حکومت دجال سے موسوم کیا گیا ہے۔ مجلس اقوام متحدہ ۱۹۴۵ء اور ریاست اسرائیل ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی۔

"ڈرامہ دو ہفتے میں ختم ہوگیا۔ پندرہ دنوں کے اندر اسرائیل کا رقبہ دوگنا ہوگیا۔ اور مقدمہ عبوری حکومت دجال (U.N.O) میں چلا گیا۔ پھر اس کے بعد حکومت دجال اور عالم عرب کے فری میسن حکمرانوں کے ڈراموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔۔۔ ہر اگلی منزل کے پہلے ایک ڈرامہ ۔۔۔ ریاست اسرائیل کے اعلان کو عرب حکومتوں سے تسلیم کرانے اور اس کی سرحدوں کو مزید توسیع دینے کے لیے ۱۹۴۸ء کا ڈرامہ، نہر سوئز کو بین الاقوامی علاقہ قرار دینے کے لیے ۱۹۵۶ء کا ڈرامہ، قرارداد ۲۴۲ پاس کرانے یعنی ریاست اسرائیل کو جائز ریاست قرار دلوانے اور بیت المقدس پر قبضہ دلوانے کے لیے ۱۹۶۷ء کا ڈرامہ، کیمپ ڈیوڈ اور اس کے ذیلی کیمپ ڈیوڈ معاہدے، کروانے یعنی عربوں کے ساتھ پر امن بقائے باہم کے حق کو منوانے کے لیے ۱۹۷۳ء کی رمضان جنگ کا ڈرامہ، چنانچہ ڈراموں کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ مجلس اقوام متحدہ کی بنیادی طاقت سلامتی کونسل ہے۔ سلامتی کونسل کیا ہے، اور کس کی علامت ہے؟ اگر غور کیا جائے تو سلامتی کونسل کے اجلاس میں نشستوں کی صورت حال اس کی حقیقت کو خوب واضح کر دیتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ہم یہ جان لیں کہ مہر سلیمانی، سپر سلیمانی اور پنٹاگن کی طرح سلامتی کونسل کی مخصوص نشست گاہ اور اس کی ترتیب کس کی علامت ہے؟

اس علامت کو Catenarian علامت کہا جاتا ہے جس کی دو شکلیں ہیں:

(۱) پہلی محراب کی طرح اوپر ابھری ہوئی جسے Catenarian Arch کہتے ہیں اور

(۲) دوسری افقی پڑی ہوئی جسے Royal Arch Chapter کہا جاتا ہے۔ اگر محراب کی طرح ابھری ہوئی ہو تو اس کی شکل ⌒ یوں ہوگی یہی شکل اگر پڑی ہوئی ہو تو

یوں ⌒ ہو گی۔

چنانچہ محراب کی طرح ابھری Catenarian Arch کے بارے میں جونس کہتے ہیں:

"Freemasonry knows the Arch as not only the symbol of strength but as a symbol of heaven. There is some suggestion of an arch in Job XXVI, II: "the pillars of heaven tremble." [۵]

ترجمہ:

"فری مسنری 'محراب' کو صرف قوت کی علامت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ عرش کی علامت کے بطور بھی جانتی ہے۔ ایوب ۲۶/۱۱ میں اس محراب کے تعلق سے کچھ اشارے دیئے گئے ہیں: "عرش کے ستون لرزنے لگے۔"

افقی یعنی پڑی ہوئی یعنی Catenarian Arch Chapter ہو تو اس کے بارے میں جونس کہتے ہیں:

"The august Sanhedrin sat in a semicircle when in judgement. The form of the Royal Arch Chapter based on the catenarian arch is thus the reminder of that ancient assembly. Actually, the assembly was not known as a Sanhedrin until the second century B.C. We learn of the Constitution of the Assembly in Number XI, 16, where "the Lord said unto Moses, Gather unto me seventy men of the elders of Israel, whom thou knowest to be the elders of the people, and officers over them; and bring them unto the tent of meeting, that they may stand there with thee" (Revised Version). This council met within the precincts of the Temple and its presiding officer represented the king, just as the presiding officer in a chapter also represents the king, and is correctly addressed as 'M.E.' [۶]

ترجمہ

"عظیم الشان سنہیدرن اسی طرح نصف دائروی ہو کر فیصلے کے لیے منعقد ہوا کرتا تھا۔ رائل آرچ چیپٹر کی بناوٹ جو Catenarian Arch پر مبنی ہے اس قدیم

مجلس کی یادگار ہے۔ در حقیقت یہ مجلس دوسری صدی عیسوی قبل مسیح سے پہلے سنہیدرن کے نام سے جانی نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ ہمیں اس مجلس کی تشکیل کا علم شہد یازدہم ۱۶/ سے ہوتا ہے جہاں فرمایا گیا: خدا نے موسیٰ سے کہا: اسرائیل کے ستر بزرگوں کو میرے پاس جمع کرو جسے تم لوگوں کے بزرگوں اور سرداروں کی حیثیت سے جانتے ہو۔ اور انہیں خیمۂ ملاقات میں لاؤ جہاں وہ تمہارے ساتھ کھڑے رہیں۔ (نظر ثانی شدہ متن) یہ مجلس بیت المقدس کے احاطہ میں منعقد ہوئی اور اس میں صدر نشین نے، بادشاہ کی نمائندگی کی جس طرح چیف جسٹس صدر نشین بادشاہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اسے بجا طور پر M.E کہا جاتا ہے۔"

چنانچہ سلامتی کانسل ایک عبوری سلامتی کونسل ہے۔ جب ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہو کر عظیم ریاست اسرائیل قائم ہو جائے گی تو دنیا کی یہ موجودہ سلامتی کانسل منتقل ہو کر اور صرف یہودیوں کے ستر افراد پر مشتمل وہ سلامتی کونسل بن جائے گی جو ہیکل سلیمانی کے اندر اجلاس کرے گی اور وہی دجالی حکومت کا اصلی روپ ہوگا۔

یہ تفصیلات تو دراصل جملہ ہای معترضہ کے بطور محض وضاحتاً عرض کیے گئے ورنہ ہم اس بات کا ذکر کر رہے تھے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ دراصل ایک ایسی فریمسن حکومت ہے جس کا مقصد وجود ہی قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کر کے دجال کے استقبال کی تیاری کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے عالم مغرب کا ہر باخبر آدمی جانتا ہے، چنانچہ اس کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ میں مذہبیات کے مشہور دانشور ایڈورڈ .اے. تریاکیان (Edward A. Tiryakian) کے خیالات قابل ذکر ہیں۔ واضح ہو کہ مسٹر تریاکیان پرنسٹن اور ہارورڈ میں استاذ اور امریکن سوسائٹی فار اسٹڈی آف ریلیجن کے صدر (۸۴-۱۹۸۱) رہ چکے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"The religious matrix of the United States in Calvinism and the Social reflection of this cultured floor in the (formerly) hegemonic White Anglo-Saxon Protestant (WASP) section of the population are universally recognised and require no discussion ..... Essentially, the American setting gave rise to the first large-scale Puritan civilization, one that, freed from

the wotries of a repressive social environment, turned its missionary impetus into a gigantic enterprise of harnessing an equally gigantic physical environment that was viewed as wilderness. Max Weber and one of his leading interpreters, Talcott Parsons, have keenly observed that in reorienting that quest for salvation to "this worldly asceticism', Protestantism introduced a powerful "Cognitive break through", a "lever for social change." In seeing themselves not primarily as benefactors but as stewards or trustees of God's purpose in placing them in front of wilderness, the puritans and their descendants, even unto to-day, helped to create and then re-create not just what Lipset aptly termed" the first new nation" but what in fact was equally the first Protestant nation." ۷

ترجمہ:

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مذہبی قالب کا کالونزم سے بنا ہونا اور اس متمدن زمین کے ذریعہ آبادی کے تعلق سے (سابق) غالب سفید فام اینگلو۔ سیکسن۔ پروٹسٹنٹ (واسپ) رنگ کے معاشرتی عکس کا منعکس کرنا وہ بات ہے جو عالمگیر طور پر تسلیم کی جاتی ہے اور اس پر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی انتظام کی صورت میں دنیا میں پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر پیوریٹن تہذیب برپا ہوئی جو ظالمانہ معاشرتی ماحول کے تفکرات سے آزاد تھی، اس نے اپنے داعیانہ قوی کو ایک عظیم دیو ہیکل طبعی فضا کی تعمیر میں لگایا جس میں 'صحرا' کو متصور کیا گیا تھا۔ میکس ویبر اور ان کے سرخیل ترجمان ٹالکوٹ پارسنس نے دقت نظر سے محسوس کیا کہ نجات کی اس تلاش کو ایک ایسا رخ دینا جو "دنیاوی تجرد" کی صورت میں ہو پروٹسٹنٹ کا وہ کارنامہ ہے جس کے ذریعہ اس نے ایک نئی اور محسوس راہ تلاش کی ہے جو معاشرتی تبدیلی کا بہترین آلہ ہے۔ اپنے کو استفادہ کرنے والوں کی صورت میں دیکھنے کے بجائے بحیثیت نگراں اور امانت دار کے دیکھنا جسے خدا نے اپنی رضا کی تکمیل کے لیے صحرا میں رکھا ہوا ہے ـــــ پیوریٹوں اور ان کے اخلاف نے، آج تک نہ صرف، اس شئے کو جسے لپسٹ نے بہت مناسب نام دیا ہے ـــــ

پہلی جدید قوم"—— بلکہ جو درحقیقت پہلی پروٹسٹنٹ قوم تھی —— کو خلق کرنے اور پھر اسے دوبارہ خلق کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔

امریکہ میں یہودیوں پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"Infact, because of a deep-structure affinity of Calvinist Puritanism for Judaism, it is in America that Jews have increasingly found full Societal and cultural participation and acceptance, symbolised by widespread acceptance in recent years of the term "Judeo-christian." [۸]

ترجمہ:

درحقیقت، کالوینی پیوریٹنیت کی یہودیت کے ساتھ گہری ترکیبی قربت ہونے کے سبب یہ امریکہ ہے جہاں یہودیوں نے روزافزوں طور پر پوری معاشرتی اور ثقافتی شراکت اور قبولیت پائی جو یہودی عیسائیت کے نام سے حالیہ دنوں میں عام مقبولیت کی صورت میں ایک علامت کے بطور تسلیم کی جارہی ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

In brief, I would argue that being Jewish in America ..... has ..... had some very distinctive cultural advantages. ..... First and formost, the puritans had a deep identification with Israel. The Bible, particularly the Hebrew Scriptures, was constant referent ..... stemming from the puritan identification of themselves as fleeing from Egypt - corrupt civilization - into the land of Canaan, hence the name of the town New Canaan, Connecticut. Shedding civilization and creating a "city on the Hill" meant a repudiation of the false gods and graven images of that civilization. The puritans deemphasized Christian names and Christian holidays associated with Rome, Paganism, or idleness. Thus Christmus was not celebrated, but Thanksgiving, derived from the Jewish harvest festival of Succoth, became the major holiday;

similarly, the puritans extensively used first names taken from the Old Testament in preference to Christian first names.

Second, the esoteric dimension of American civil religion is one in which Freemasonry has played a leading role from the very beginnings of the Republic, to which it has contributed some of the very basic symbols of the American polity, such as the Great Seal of the United States. Many of the leading figures of the independence movement were Masons, and the Declaration of Independence itself as was the case for the French Counterpart, the Declaration of the Human Rights -- is a menifestation of Masonic principles, including Universalism, the equality and brotherhood of all men, and the freedom of conscience. Central to Freemasonry are symbols, rituals, and mythologies that are linked to the Kabbalistic tradition, so, for example, speculative Masonry relates itself to the ancient craft of architecture whom master architect was Solomon, the builder of the Temple, and Freemasonry utilizes that Hebraic rather than the Christian Calender.

In brief, the Masonic dimension of American culture --- a particularly strong but covert presence in American life, especially in the formative period of the country --- provided Jews with important cultural support and legitimation."[9]

ترجمہ

الختصر۔ میں دراصل یہ کہنااور ثابت کرنا چاہتاہوں کہ امریکہ میں یہودی ہونا بعض نہایت منفرد تمدنی فوائد کا حامل ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور ابھری بات یہ ہے کہ پیوریٹن اسرائیل سے حد گہری وابستگی رکھتے ہیں بائبل اور بطور خاص عبرانی صحائف ان کے یہاں زندگی کالازمہ ہیں۔ اس کا تعلق پیوریٹن تشخص سے ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ (ان کا یوروپ سے بھاگ کر امریکہ آکر بس جانا) مصر کی

بد طینت تہذیب سے بھاگ کر ملک کنعان میں بس جانے کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آباد کیے شہر کا نام کنیکٹی کٹ رکھا جس کا مفہوم ہے کنعان جدید۔ (بد طینت) تہذیب کو خیر باد کہنا اور "شہر جبل" تعمیر کرنا اپنے آپ میں اس تہذیب کے باطل خداؤں اور تراشے ہوئے بتوں کی تکذیب کرنا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ امریکی پیوریٹنوں نے روم کے عیسائی ناموں اور تہواروں سے خود کو الگ کرلیا اور انہیں بے وقعت بتادیا جو دراصل ان کی نظر میں شرک اور بے عملیت کی یاد دلاتے تھے۔ یہی سبب ہے (کہ امریکہ میں پیوریٹنوں کے ذریعہ) کرسمس نہیں منایا جاتا بلکہ اس کے بجائے 'تشکر' منایا جاتا ہے جو دراصل یہودیت کے فصل کے کٹنے کے تہوار 'شقہ' سے مستفاد ہے۔ یہی سب سے بڑا تہوار ہے۔ اسی طرح پیوریٹن عہد نامہ عتیق (OT) میں مذکور ناموں کو اپنے نام کے پہلے جز کے اعتبار سے رکھنے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں کہ کوئی عیسائی نام رکھیں۔

دوسری بات یہ کہ امریکی سرکاری مذہب کا سرّی پہلو وہ امر ہے جس میں فری مسنری نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ اسی فری مسنری نے اس امریکی جمہوریت کو اس کی بنیادی علامت عطا کیں ہیں جو اس ریاست و حکومت کی اساسی علامتیں ہیں۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کا عظیم نشان (Seal)۔ امریکہ کی آزادی کے قائدین کی کثیر تعداد فریمسن تھی۔ اس طرح اپنے ہم رتبہ فرانسیسی انقلاب کے اعلان آزادی کی طرح ـــــ امریکہ کی آزادی کا اعلان بھی دراصل فری مسنری اصولیات، مقاصد اور نصب العین کا اظہار تھا جس میں انسانی حقوق (Human Rights) بنیادی ہے۔ اس کے علاوہ عالمگیریت (Universalism)، تمام انسانوں کے مابین مساوات اور اخوت اور آزادیٔ ضمیر اس کے بنیادی اجزا ہیں۔ ایسی علامتیں، رسوم اور اساطیر کو جن کا تعلق قبلانی (Kabbalistic) روایت سے ہو فری مسنری میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ مثلاً تاملی فری مسنری خود کو اس قدیم فن تعمیر سے منسلک کرتی ہے جس کا اعلیٰ ترین ماہر فن تعمیر سلیمان تھا جس نے Temple کی تعمیر کی تھی۔ اسی طرح فری مسنری عیسائی تقویم کے بجائے عبرانی تقویم پر عمل کرتی ہے۔

المختصر، امریکی تمدن کا فری مسنری پہلو، امریکی زندگی میں بالخصوص اس ملک کے تشکیلی عہد میں فری مسنری کی اس میں مضبوط مگر خفیہ موجودگی نے یہودیوں کو امریکہ میں اہم تمدنی حمایت اور قانونی حیثیت فراہم کی ہے۔

(۱) لبرل پروٹسٹنٹ ـــــ Congregationalists

| | | |
|---|---|---|
| (۳) موڈریٹ پروٹسٹنٹ ——— | Presbyterians | |
| | Episcopalians | ۹ فیصد |
| | Unitarians | |
| | Methodists | |
| | Lutherians | |
| | American Baptists | ۲۴ فیصد |
| | Desciples | |
| | Reformed | |
| (۴) کنزرویٹو پروٹسٹنٹ | Southern Baptists | |
| | Church of God | |
| | Pentecostals | ۱۵ فیصد |
| | Assemblies of God | |
| | and many others | |
| (۴) بلیک پروٹسٹنٹ | | ۹ فیصد |
| (۵) کیتھولک | | ۲۵ فیصد |
| (۶) دوسرے | | ۸ فیصد |
| (۷) غیر متعلق | | ۷ فیصد |

لیکن امریکی حکومت بنیادی طور پر دو ستونوں پر قائم ہے۔ان میں پہلا ستون ہے :

(۱) Masonic Secular Traditionاور (۲) Conservative Protestants ۔ یوں تو ہر پروٹسٹنٹ یہودیت کا حامی اور اس کا عمیل ہے لیکن کنزرویٹو پروٹسٹنٹ کا مقصد وجود ہی یہودیت کے مقاصد کی تکمیل ہے۔ چنانچہ فریمسنری نے قیام ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بعد اس کا کھل کر اعلان کیا کہ امریکہ کا قیام کیوں ہوا ہے؟ ۱۸۲۳ میں انہوں نے اعلان کیا:

"To the Jewish Nations we are indebted for all

that is ancient, judicius and distinct in Masonry. From them under the great I AM, we derive all we know of the history of man and the will of Heaven." [10]

ترجمہ

فری مسنری میں جو کچھ قدیم، عادلانہ اور منفرد ہے ان سب کے لیے ہم (فری مسنری کے متبعین) یہودی قوم کے مقروض ہیں۔ انہیں یہودیوں سے عظیم 'میں ہوں' کے تحت ہم تاریخ انسانی اور خدا کی مرضی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں حاصل کر رہے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جہاں ایک طرف لبرل اور موڈریٹ پروٹسٹنٹ کی آبادی میں یہودیت اور اسرائیل کے تعلق سے جوش اور حمایت کے باوجود بظاہر کمی آرہی ہے وہیں کنزرویٹو پروٹسٹنٹ میں بحیثیت تعداد اور بلحاظ یہودیت کی حمایت میں انتہاپسندانہ جذبات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کے جن چرچوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے ان میں بنیادی طور پر کنزرویٹو ہیں اور ان میں بطور خاص (۱) Evangelists اور (۲) Fundamentalist Bodies ہیں۔

Fundamentalist Bodies سے مراد کالونسٹ چرچ میں پیدا ہونے والا وہ گروہ ہے جو انجیلی تعبیر کے اس مکتبۂ خیال سے تعلق رکھتا ہے جو Dispensation پر یقین رکھتا ہے جس کا Scofeild Reference Bible میں سب سے واضح اظہار کیا گیا ہے یعنی انجیل کو بغیر تاویل کے اسی طرح لینا بطور خاص ان امور میں جہاں سرزمین اسرائیل کے تعلق سے پیش گوئیاں کی گئیں ہیں۔ اور یہ کہ وہ پیشین گوئیاں بالیقین پوری ہوں گی۔ اس طرح اس مکتب خیال کو Premillenialist کہا جاسکتا ہے یعنی وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ کی آمد اور اسرائیل کے تعلق سے وعدوں کی تکمیل اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے منتظر ہیں۔ یہ تمام طبقات بے حد شدید جذبات کے حامل ہوتے ہیں۔[11]

۱۹۴۰ کے بعد اس کا ایک گروہ جس میں کچھ اعتدال آگیا تھا Evangelical کہلانے لگا۔

ان Fundementalist طبقات میں بہت نمایاں گروہ درج ذیل ہیں:

(۱) Seventh - Day Adventist

(۲) The Church of Nazarene

(۳) Assemblies of God

(۴) The Salvation Army

(۵) Pentecostal Groups متعدد

(۶) Holiness Groups متعدد

لیکن اس میں سب سے مشہور Jerry Falwell اور اس کا گروپ Moral Majority (جسے چند سالوں قبل بظاہر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے) اور Pat Robertson ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بے شمار گروہ ہیں جو بنیادی طور پر Fundamentalists میں شمار ہوتے ہیں۔[۱۲]

دوسری جنگ عظیم کے معا بعد پوری امریکی حکومت اور بطور خاص وہائٹ ہاؤس پر جن تین گروہوں کا 'پورا کنٹرول' ہوگیا ہے وہ ہیں (۱) یہودی (۲) فریمیسن اور (۳) Fundamentalists۔ اور یہ تینوں طبقات دراصل عظیم اسرائیل کے قیام اور قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے کمربستہ ہیں۔ چنانچہ حکومت امریکہ پر ان کے "مکمل کنٹرول" نے ۱۹۷۰ء کے بعد امریکی حکومت کو مسجد اقصیٰ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے اور عظیم اسرائیل بنانے کے لیے یکسو کر دیا ہے۔ ۱۹۷۶ء کے بعد آنے والا ہر امریکی صدر یا تو خود Fundamentalist ہوتا ہے یا Fundamentalists کی مدد سے وہائٹ ہاؤس میں آتا ہے یا ان کے درمیان اور ان کے اشاروں پر کام کرتا ہے۔ اس لیے کہ White House اور Pentagon پوری طرح انہیں Fundamentalists کے ہاتھوں میں ہیں۔

جمی کارٹر ایک پرجوش اور انتہا پسند Fundamentalist تھا جو ۱۹۷۶ء میں صدر امریکہ منتخب ہوا۔ لطف یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں امریکی صدارت کے تینوں امیدوار یعنی اینڈرسن، کارٹر اور ریگن ـــــ بنیادی طور پر Fundamentalists تھے اور ان میں کارٹر اور اس کے بعد رونالڈ ریگن یکے بعد دیگرے Moral Majority یعنی Jerry Falwell کی مدد سے ہی کامیاب ہوئے۔ امریکہ کے ایوان صدر سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ انہیں

Fundamentalists کا قبضہ ہے۔ ریگن نے امریکہ کو نیا یروشلم New Jerusalem قرار دیا جو صرف اس لیے وجود میں آیا ہے کہ اصل یروشلم آباد ہو جائے۔

اس Fundamentalist گروہ نے عملاً پوری پروٹسٹنٹ دنیا کو ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے اور اس طرح پوری پروٹسٹنٹ دنیا امت مسلمہ، عالم اسلام اور اس کے مقامات مقدسہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہیں۔ انہوں نے ایک طرف مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کا عزم مصمم کر رکھا ہے تو دوسری طرف عالم اسلام کے خلاف ایک صلیبی جنگ چھیڑنے اور عالم اسلام کو کلی طور پر تباہ کر دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۰ کے بعد امریکہ میں ایسے مواد شائع ہونے لگے اور ایسے جذبات کی تشہیر ہونے لگی جو پوری عیسائی دنیا کو عالم اسلام کے خلاف چڑھا لانے اور امت مسلمہ کا خاتمہ کر دینے کے مترادف ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ رومن کیتھولک اور بہت سے آرتھوڈوکس چرچ نے ان جذبات کا کبھی ساتھ نہیں دیا اور اس طرح کے جذبات کی اشاعت کرنے والے پروٹسٹنٹ ہی واقع ہوئے ہیں اور ان میں کنزرویٹو پروٹسٹنٹ اور ان کے Fundamentalist گروہ پیش پیش ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے کہ یہودی سازش اس اعتبار سے کامیاب ہو جائے کہ مسلمان اور عیسائی باہم صلیبی جنگ میں مبتلا ہو جائیں اور وہ ان کے ذریعہ مسجد اقصیٰ کو تباہ کرا کے اسی طرح اپنا کام پورا کرا لے اور الزام دوسروں کے سر ہو جس طرح آج سے دو ہزار سال قبل انہوں نے اپنے علم کی حد تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دے ڈالا اور سارا الزام رومی حکومت کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

۱۹۷۰ء میں سب سے پہلے ہال لینڈ سے Hall Lindsey کی کتاب The Late Great Planet Earth شائع ہوئی جس نے ایک طرف عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی آمد کی یاد دلا کر خدائی حکومت کے قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر پر ابھارا تو دوسری جانب مزاحم قوتوں یعنی مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کیے۔[۱۳]

انہیں دنوں تھامس میک کال اور زولالیوٹ (Thomas McCall & Zola Levitt) کی کتاب Satan in the Sanctuary شائع ہوئی جو اسی طرح کے خیالات سے بھری ہوئی تھی۔[۱۴]

۱۹۸۷ میں میک کال اور لیوٹ کی دوسری کتاب The Coming Russian Invasion of Israel شائع ہوئی۔[۱۵]

یہ بات محض جذبات کے اظہار اورانہیں بھڑکانے تک محدود نہیں بلکہ ان Fundamentalists نے ـــــ جنہیں دراصل Dispensationalist کہنازیادہ بہتر ہے ـــــ لوگوں کو مسجد اقصیٰ کے ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کی عملی کوشش شروع کر رکھی ہے اور وہ بھی نہایت بڑے پیمانے پر۔ان میں سے صرف ایک گروہ یعنی Jerry Falwell کی صرف ایک کارروائی کی وسعت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کام کتنے بڑے پیمانے پر انجام دیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے یہ سارا کام عیسائی نمایہودی اصل یہودیت کے اشارے پر انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۸۵ء میں مائیامی (Miami) میں ایک راسخ العقیدہ ربانی اجتماع (Conservative Rabbinical Assembly) کو خطاب کرتے ہوئے Jerry Falwell نے یقین دلایااور اس کا حلف لیا کہ وہ ۷۰ ملین کنزرویٹو عیسائیوں کواسرائیل کی بقا، مسجد اقصیٰ کے ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے متحرک کرے گا۔ چنانچہ Falwell اس عہد کے بعد ساری دنیا سے عیسائیوں کے ایسے Tour کاانتظام کرنے میں منہمک ہو گیا تاکہ عیسائی ان کے خرچ پر یروشلم جائیں اور تعمیر ہیکل سلیمانی کے اس کاز کے لیے اپنی قربانی پیش کریں۔اسی مجلس میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

"Theologically, all Christians have to support Israel ..... If we fail to protect Israel, we will cease to be important to God."

ترجمہ:

عقیدے کے اعتبار سے ہر عیسائی پر فرض ہے کہ وہ اسرائیل کی حمایت کرے۔.....اگر ہم اسرائیل کی حفاظت کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو ہماری اللہ کے نزدیک کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

ابھی حال ہی میں Grace Halsell کی کتاب

"Forcing God's Hand: Why Millions Pray for a Quick Rapture And Destruction of Planet Earth."

شائع ہوئی ہے جس نے بڑی خطرناک صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ واضح ہو کہ

Halsell وہائٹ ہاؤس میں ایک اونچے عہدے پر فائز ہیں اور انہوں نے بھی Jerry Falwell کے ساتھ یروشلم کا سفر کیا ہے۔

Halsell کا کہنا ہے کہ Fundamentalist گروہ اب تقریباً بے قابو ہو گئے ہیں اور وہ کسی لمحے قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کو ڈھا دیں گے۔ اس دوڑ میں سبھی گروہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہیں۔ خواہ وہ Jerry Falwell ہوں یا Pat Robertson یا Hal Lindsey یا Tim Laflaye [۱۶]

یوں تو پچھلے تیس سالوں سے تقریباً ہر مہینے ایک ایسی کوشش ضرور ناکام بنادی جاتی ہے جس کا مقصد مسجد اقصیٰ یا قبۃ الصخرۃ کو تباہ کر دینا ہو۔ لیکن اب تک یہ کوششیں بیشتر شدت پسند یہودی تنظیموں کی جانب سے ہی ہوتی تھیں۔ یہ پہلی بار ہے کہ عین القدس کے اندر ایک ایسی کوشش سامنے آئی ہے جن میں Dispensationalist عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ کوشش اور اس کی تفصیلات بے حد سنگین ہیں۔

چنانچہ دوسرا سوال جو سبب بنا اس تجزیہ کا وہ یہ ہے:

کیا احادیث میں مذکورہ غزوۂ روم، الملحمۃ، غزوۂ نصاریٰ اور غدر روم کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟ [۱۷]

## تیسرا سبب: یہودی تخریبی عزائم

اس تجزیے کا تیسرا سبب ہے:

(۱) شدت پسند یہودی تنظیموں ـــــ گش ایمونیم (Gush Emonim) ـــــ تیہیہ (Tehiya)، اور اسی طرح ۱۰۰ سے زائد یہودی تنظیموں یا ان کی ذیلی تنظیموں کے خفیہ دستوں کا Rabbi Shlomo Chaim ، Yisrael Meida، Stanley Goldfoot Yehuda Etzion ،Haicohen Avnir جیسے خطرناک دہشت گردوں کی سربراہی میں کسی لمحے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو تباہ کرنے کے کام کو روبہ عمل لے آنے کے درپے ہونا۔ (۱۹۹۹ء)

(۲) ۱۹۷۹ء سے پاکستان کو جوہری ٹکنالوجی حاصل کر کے جوہری ہتھیار سے مسلح ہونے

سے روکنے کے، چلے آرہے اقدامات اور دوروں کے آخری سلسلے کے بطور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آخری ذمہ دار شخصیت اور وہاں کی فوج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے صدر امریکہ بل کلنٹن کا بنفس نفیس پانچ گھنٹوں کے لیے پاکستان کا دورہ کرنا اور پاکستان کو تباہ کر دینے کی دھمکی دینا اور اس کے بعد اس کے خلاف عسکری کارروائی کا در پردہ آغاز کر دینا (۲۵ر مارچ ۲۰۰۰ء)

(۳) امریکہ کی نگرانی میں اسرائیل اور فلسطینیوں کی بات چیت کا عملاً ناکام ہو جانا اور حکومت اسرائیل کا دو سے پانچ ماہ کے اندر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے غیر معمولی اقدام کرنے کا عزم کر لینا۔

(۲۰ اپریل ۲۰۰۰ء)

(۴) اور اس منصوبے پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے پہلے اقدام کے بطور اچانک غیر معمولی طور پر لبنان سے اپنا ۲۰ سالہ قبضہ ختم کر کے اپنی فوجوں کو از خود واپس بلا لینا۔

(۲۳ مئی ۲۰۰۰)

(۵) بظاہر بلا سبب اچانک سری لنکا میں جنگ کا تیز ہو جانا اور اس کے بہانے سری لنکا کے اسرائیل سے سفارتی اور عسکری تعلقات کے بحال ہونے کے ساتھ ساتھ سری لنکا میں اسرائیل کی فوجی موجودگی کا قائم ہو جانا اور ٹھیک انہیں دنوں امریکی بحری بیڑے کا وہاں آجانا اور اب سری لنکا کے ساحلی حدود سے اسرائیل کا اپنے درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے جوہری کروز میزائیل کا تجربہ کرنا۔ (۲۰ جون ۲۰۰۰) جس کے پس منظر میں اس صورت حال کا حقیقت بن جانا کہ پورا عالم اسلام ـــ مراکش سے منڈاناؤ تک تین جگہوں پر Sandwich کر دیا گیا ہو اور بطور خاص جنوب ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا میں پائے جانے والے ملکوں پاکستان، ایران اور افغانستان کو باقی مسلم دنیا سے کاٹ کر خلیج فارس اور بحیرۂ عرب کے مغربی کناروں کے مابین مقید کر دیا گیا ہے۔

(۲۶ مئی ۲۰۰۰)

(۶) روس کا اچانک اعلان کر دینا کہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا اور عملاً اس کی تیاریاں شروع کر دینا۔ (۲۴ر مئی ۲۰۰۰ء)

چنانچہ یہ صورت حال بے حد خطرناک اور سنگین مستقبل کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ سارے واقعات وقتی اور اتفاقی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک طویل تسلسل کے آخری مرحلے کی کڑیاں ہیں۔

یسعیاہ رکوع:۲ میں ذکر کیا گیا:

"آخری دنوں میں ایسا ہوگا کہ یہوا کی عمارت کا پہاڑ تمام پہاڑوں پر مستحکم کیا جائے گا۔اور تمام پہاڑیوں سے زیادہ بلند کیا جائے گا۔اور ہر قوم کے لوگ موج کی طرح اس کی جانب چلیں گے۔اور بہت ملکوں کے لوگ آئیں گے اور آپس میں کہیں گے آؤ! ہم یہوا کے پہاڑ پر چڑھ کر یعقوب کے خدا کے گھر میں جائیں۔ تب وہ ہمیں اپنا راستہ دکھلائے گا اور ہم اس کے راستے پر چلیں گے۔ کیونکہ یہوا کا انتظام صیہون سے اور اس کا کلام یروشلم سے نکلے گا۔ وہ قوموں کا فیصلہ کرے گا اور قوموں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے گا۔اور وہ اپنی تلواریں پیٹ کر ہل کے پھل اور اپنے نیزوں کو ہنسیا بنائیں گے۔ تب ایک قوم دوسری قوم کے خلاف تلوار نہیں چلائے گی نہ لوگ مستقبل میں جنگ کا فن سیکھیں گے۔" (Isaiah ۲:۲-۴)

یہ پیشین گوئی ایک حقیقت ہے لیکن یہودیوں نے شیطان سے تحالف اور خدا کے دشمن ہو جانے کے بعد اس کا دوسرا ہی مطلب لیا ہے۔ اور ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔ یہ پیشین گوئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے اور یہودی ان کی آمد سے کئی صدیوں قبل اللہ رب العزت کے بھیجے جانے والے مسیح کے دشمن اور ابلیس کی جانب سے بھیجے جانے والے مسیح الدجال کے منتظر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جب اللہ رب العزت کے ارسال کردہ مسیح تشریف لائے تو انہوں نے اپنے علم کی حد تک انہیں مصلوب کر کے ابلیس کے مسیح کے لیے راستہ صاف کرنا چاہا اور اب وہ اس مسیح کا انتظار کر رہے ہیں جو دراصل ابلیس کا ارسال کردہ مسیح ہوگا یعنی مسیح دجال ـــــ ظاہر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اب وہ خدا کے دشمن ہیں۔ اور خدا ان کا دشمن لہٰذا اب ان آیات کی اس تشریح کی کوئی گنجائش نہیں جس کی یرمیاہ ۲۳:۵-۶ (Jeremiah: 23:5-6)

اور ملاکی ۳:۲۳ (Malachi, 3:23) میں خبر دی گئی تھی۔ یہودیوں نے اللہ کے ارسال کردہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک کیا اور ان یہودیوں کو ان کے اس سلوک سے جس کا پورا پورا اندیشہ تھا بار بار باخبر اور متنبہ کیا گیا جیسا کہ (Sanhadrin 97 b) میں آیا ہے:

"اگر اسرائیلیوں نے توبہ کی تو انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ اگر نہیں، تو الواحد القدوس ان کے اوپر ایک ایسا بادشاہ مسلط کر دے گا جس کے فیصلے ہامان کے فیصلوں سے زیادہ شدید ہوں گے تب جا کر شاید وہ توبہ کریں اور ممکن ہے انہیں معاف کر دیا جائے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے اور یہودیوں نے وہی کیا جس کا اندیشہ تھا لہٰذا اللہ نے ان پر Titus (70A.D) کو مسلط کر دیا۔ جس نے ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور ہمیشہ کے لیے انہیں بیت المقدس سے نکال دیا۔ Titus کے ذریعہ دربدری کے بعد ساری دنیا میں یہودی ۱۹۴۸ء میں قیام اسرائیل سے قبل تک پورے ۱۹۰۰ سال مارے مارے پھرتے اور ہر جگہ فساد پھیلاتے رہے۔ چونکہ یہودی رب العزت کے مسیح کی آمد سے سینکڑوں سالوں قبل ہی ابلیس کے مسیح کے لیے یکسو ہو چکے تھے لہٰذا اب ان کی دل بستگی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ حضرت مسیح کے تعلق سے دی گئی خبروں کو مسیح دجال پر منطبق کریں اور اللہ کے ذریعہ القدس کی آبادکاری اور حضرت مسیح کے ذریعہ قائم ہونے والے نظام عدل کے بجائے ابلیس کے مسیح دجال کے لیے یروشلم کو مفسدانہ کارروائیوں کے لیے آباد کریں، مسیح دجال کے لیے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کریں اور اس کی آمد سے قبل اس مجسم فساد کے لیے ''نظام عدل'' قائم کریں۔

چنانچہ Titus کے ذریعہ قتل عام کے بعد اس کوشش کا باضابطہ آغاز ہو گیا اور یہودیت کے اس وقت (132-135A.D.) کے سب سے بڑے ربی ربی عقبہ (Rabbi Akiva) نے برکوخبہ (Bar Kochba) کو سلطنت روم کے خلاف مسلح بغاوت کرنے اور بزور ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس خیال نے پوری شدت اختیار کر لی کہ کس طرح ساری دنیا کی حکومتوں کو چیلنج کرتے ہوئے اور بطور خاص خلافت عثمانیہ کو نیست و نابود کر کے یروشلم کو آباد کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ صہیدزم کو بعل شیم توو نے اور حبۃ اسرائیل کو ربی یہودا الکلائی اور زیوی حرش کلیشر نے آگے بڑھایا یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں صیہونی تنظیم کا آغاز ہوا جس کا بانی بظاہر تھیوڈور ہرٹزل (Theodore Hertzel) تھا لیکن جس کے پس پردہ حائم لورجے (Haim Lorji) ربی ایلیاہ گت ماخر (Rabbi Elijah Guttmacher) اور موسیٰ حس (Moses Hess) جیسے احبار و رہانیین کا ہاتھ تھا۔

۱۹۴۸ء تک یہودی پاگل ہو چکے تھے۔ چنانچہ جنوبی افریقی نژاد یہودی Stanley Goldfoot جس کا ذکر ما قبل کیا گیا وہ شخص ہے جو ۱۹۳۰ میں فلسطین منتقل ہوا اور یہی وہ شخص

ہے جس نے ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ کو مسجد اقصیٰ کے قریب واقع King David Hotel کو جہاں فلسطین کے انتداب کا برطانوی سکرٹریٹ اور فوجی ہیڈ کوارٹر قائم تھا ڈائنامائیٹ سے اڑا دیا جو دراصل پہلا قدم تھا ریاست اسرائیل کے قیام کے لیے قوت کا استعمال کا۔

یہ وہی Goldfoot ہے جس نے Stern Gang نامی تنظیم بنائی جس نے فلسطین میں مسلم عورتوں اور بچوں کا بے دردی سے ایسا قتل عام کیا کہ ڈیوڈ بن گورین جیسے مفسد اور متشدد یہودی نے بھی اس کی مذمت ان الفاظ میں کی: ''یہ وہی سلوک ہے جو نازیوں نے کیا تھا'' اور اس تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا۔

۱۹۶۷ء کے بعد تو ہر مہینے کوئی ایسی کارروائی پکڑی جاتی ہے جس کا مقصد مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھا دینا ہے لیکن اس عرصے میں (۱۹۹۹۔۱۹۶۷) ایسی ۱۰۰ سے زائد کوششیں ہوئیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کوشش کامیاب ہو جاتی تو یہ سارے عتبات تباہ ہو جاتے۔

رابرٹ آئی فریڈمین (Robert I. Friedman) نے The Village Voice کے ایک شمارہ میں (۱۹۸۵) میں لکھا:

> ''مسجد اقصیٰ کا ایک ماڈل تیار کیا گیا، تباہ کرنے کی میقات اور طریقوں کو متعین کیا گیا اور صحرا میں Explosions کا تجربہ کیا گیا۔'' اسرائیلی فوج کے انجینئر کور کے ایک کمانڈر مناخم لونی (Menachem Livni) نے اس کا تجربہ کیا کہ:
>
> ''جب مسجد اقصیٰ ڈائنامائٹ سے اڑائی جائے گی تو وہ کس جانب گرے گی اور اسکے ٹکڑے کتنی دور تک اور کس طرح گریں گے۔''

واضح ہو کہ یہ تجربے دراصل اس نزاکت کو دیکھتے ہوئے کئے جاتے رہے ہیں کہ وہیں بالکل ملحقہ وہ حصے بھی ہیں جو یہودیوں کے لیے متبرک ہیں مثلاً دیوار گریہ۔

اس تجربے کے بعد انہوں نے عملی اقدامات کیے مگر گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سے ایک دہشت گرد Yehuda Etzion نے عدالت کو بتایا:

> ''چونکہ اسرائیلی حکومت مسجد اقصیٰ کو اب تک گرانے میں ناکام رہی ہے اس لیے اس نے سوچا کہ اسے خود ہی اس کام کو انجام دے دینا چاہئے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں بالکل معصوم ہوں۔ اس لیے کہ مسجد اقصیٰ کو ڈھا دینا جرم نہیں کار خیر عظیم ہے۔''

ہر چند کہ عدالت نے اسے معمولی سزائیں دیں جسے فوراً بعد صدر اسرائیل نے معاف کر دیا۔

ان تمام یہودی دہشت گرد گروہوں کو امریکہ کے یہودی اور Dispensationalists عیسائی کروڑوں ڈالر کی سالانہ امداد دیتے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں جب ڈینور گروپ نے مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کی کوشش کی تو اسرائیل کے ربی اعظم نے نہ صرف یہ کہ اس کی مذمت نہیں کی بلکہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا۔ شاید اس لیے کہ اسرائیل کے قیام کے بعد اس کے تمام بڑے ربی خود اس کار خیر میں عملاً حصہ لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ربی شلومو گورین (Rabbi Shlomo Goren) جو اسرائیل کا ربی اعظم بنا در اصل وہی شخص ہے جس نے اگست ۱۹۶۷ء میں مسجد اقصیٰ میں اپنے پچاس مسلح ساتھیوں کے ساتھ گھس کر اسے اڑانے کی کوشش کی تھی۔

مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو ڈھانے پر متعین تمام دہشت گرد تنظیموں اور بطور خاص Gush Emonim کو سب سے زیادہ امداد حکومت امریکہ کے خزانے سے ملتی ہے۔[1]

یہودیوں نے اس کا خوب اندازہ لگایا ہے کہ ان کے کسی ایسے عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہارورڈ سینٹر فار انٹرنیشنل افیرز کے اس سروے کا ذکر کرتے ہوئے ژیدی اراں نے لکھا تھا:

> "زیر زمین" کے سربراہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس "کریہہ عمل" (مسجد اقصیٰ) کو بم سے اڑا دینا دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو جہاد کے لیے برپا کر دے گا جو بالآخر پوری انسانیت کو معرکۃ المعارک میں جھونک دے گا۔ اس معرکۃ المعارک کو انہوں نے یاجوج و ماجوج کی جنگ سے تعبیر کیا ہے جس کے کائناتی روحانی اثرات مرتب ہوں گے۔ آگ کی اس مطلوب آزمائش سے اسرائیل کا فاتح برآمد ہو تا زمین پر مسیح کی آمد کی راہ ہموار کرے گا۔[2]

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پوری اسرائیلی قوم مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے انہدام کے سرسام میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اسرائیل کی سڑکوں پر گھومتے ربیوں کا یہ نعرہ عام طور پر ہر جگہ سنائی دے سکتا ہے:

"ہم اسی وقت مسیح کو چاہتے ہیں!"
مائش ــ مائش ــ ابھی، اسی وقت۔

ظاہر ہے اس صورت حال میں کسی ہولناک حادثے کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اب جب کہ اچانک اسرائیلی فوجوں نے لبنان سے انخلاء کردیا ہے ـــــ تو کیا پوری طاقت اور تمرد کے ساتھ اور ساری دنیا کی مسلمان حکومتوں اور امت مسلمہ کی آنکھوں کے سامنے اور ان کی مخالفت کے باوجود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے ڈھانے کی کارروائی اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور عظیم ریاست اسرائیل کے بنانے کا آغاز ہونے والا ہے اور اس کے نتیجے میں:

کیا الملحمۃ الکبریٰ یا العظمیٰ کے وقوع پذیر ہونے کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے؟[۳]

اور اگر ایسا ہے تو کیا ظہور دجال کے پیش خیمے ایستادہ ہونے لگے ہیں؟ اس لیے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

الملحمة الكبرىٰ وفتح قسطنطنيه وخروج الدجال فى سبعة اشهر (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: الملحمة الكبرىٰ اور فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال سات مہینوں میں ہوگا۔

آپ نے مزید فرمایا:

بين الملحمة وفتح المدينه ست سنين ويخرج المسيح الدجال فى السابعة (ابوداؤد)

ترجمہ: الملحمۃ اور فتح مدینہ کے مابین چھ سالوں کا وقفہ ہوگا اور مسیح دجال ساتویں میں نکلے گا۔

## چوتھا سبب : عالم اسلام پر ہمہ جہت حملہ

اس تحریر کا چوتھا سبب ہے برصغیر میں امت مسلمہ پر عالمی قوتوں کا حملہ۔

پہلا محاذ: اس ہمہ جہت حملے کے دو بنیادی پہلو یا محاذ ہیں۔ اہل مغرب کا گزشتہ ۳۰ سالوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ فی زمانہ عالم اسلام میں سب سے بیدار مغز اور مغرب کے تناظر میں ذہین مسلمان برصغیر میں پائے جاتے ہیں چنانچہ برصغیر کی امت مسلمہ فی زمانہ مسلمانان عالم کے دماغ کی طرح کام کر رہی ہے۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ ان قوتوں نے اس خطے کی امت پر براہ راست دھاوا بول دیا ہے۔

اکتوبر ۱۲ (۱۹۹۹ء) کو ایسا محسوس ہوا کہ بڑی چابک دستی سے عالمی فریمسنری نے پاکستان کا اقتدار اپنے زیادہ معتمد لوگوں کے حوالے کر دیا۔ یوں تو وہ ملک ابھی تک اس قیامت خیز صورت حال سے باہر نہیں نکل سکا ہے لیکن ابتدائی ۲۰۰ گھنٹے بڑے ہولناک تھے۔ جب ایک ذہین طبقہ لائی گئی تبدیلی پر عوام کی جانب سے غیر متوقع حمایت کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور فریمسنری کے رمزیہ الفاظ، کنایوں اور استعاروں کا علانیہ استعمال کرنے لگا۔ بلاشبہ ۲۰۰ گھنٹوں کے بعد اس میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی لیکن اب وہی الفاظ اور کنائے زیادہ مہارت کے ساتھ سیکولر پیرایوں اور Overtone کے ساتھ استعمال ہونے لگے جو اب تک بعض اسلامی کلمات کے لاحقے اور سابقے کے ساتھ جاری ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تقسیم ہند سے اب تک وہاں ایک چھوٹی مگر بے حد موثر لابی ضرور پائی جاتی رہی ہے جو نہایت اہم فیصلے کرنے کے مقام پر فائز چلی آ رہی ہے اور ضرورتاً فیصلے لیتی ہے اور بآسانی مخلصین کو outwit کر دیتی ہے۔

اس سے الگ ہٹ کر عوامی سطح پر ایسا لگتا ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری عالمی قوتوں نے مسلمانوں کی ترقی کے نام پر اس امت کو اس کے اسلامی حصار سے نکال کر اس کی تعلیم، آداب، معاشرت اور معیشت کو عالمی اور باطلانہ نیٹ ورک کا پرزہ بنانے کے لیے حملہ بول دیا ہے۔ یوں تو یہ کوشش ایک ایسے دیو کے مانند ہے جس کے سو سے زائد سر ہیں اور اس میں پایا جانے والا ہر چہرہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کوشش کے ذریعہ کبھی اکیسویں صدی کے نام پر، کبھی ترقی کے نام پر اور کبھی دوسری قوموں سے مسابقت کے نام پر برصغیر کے مسلمانوں کو Cyberspace سے جوڑنے کی اور انہیں اس Electronic Superhighway پر کھڑا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ سوال اس اچانک پیدا ہونے والے بے قابو جذبۂ خیر خواہی کا نہیں بلکہ اس کا ہے کہ اچانک اس مہم میں کود پڑنے والے مسلمان شرفاء کو اہل مغرب کی تائید حاصل ہے اور اس کے لیے مبینہ طور پر خطیر وسائل مہیا کیے جانے کی خبر عام ہے اور یہ شرفاء والہانہ طور پر قوم کو راہ پر لانے کے لیے نکل پڑے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتداء سے نمودار ہونے والی امت مسلمہ کے مابین یہ مخلوق کسی ریکارڈ پلیئر (Record Player) سے ملتی جلتی ہے۔ بے حس، بے شعور مگر اپنے تفویض کردہ کام میں مستعد۔ چنانچہ اہل مغرب کبھی ایک کیسیٹ لگا دیتے ہیں اور کبھی دوسرا۔ یہ پلیئر ہر کیسٹ عمدگی سے بجاتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل مغرب۔ نرا نہیں

دو ٹیموں میں بانٹ دیا اور ان میں دو طرح کے کیسٹ لگا دیئے۔ ایک میں کینس (Keynes)، آرتھر کوئسٹلر (Arthur Koestler) اور فرائیڈ (Freud) کے نغمے گائے جا رہے تھے تو دوسری طرف دوسرا کیسٹ چیخوف (Chekhov) آسکر لانگے (Oscar Lange) اور مارکس (Marx) کے نغمے بجا رہا تھا۔ ایک طرف منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کی تو دوسری طرف غیر منصوبہ بند معیشت (Unplanned Economy) کی دھنیں بج رہی تھیں۔ لیکن دونوں نغموں کا خاتمہ ہیوی انڈسٹریز پر ہوتا تھا۔ اب اچانک پرانے کیسٹوں کا بجانا روک دیا گیا اور نئے کیسٹ لگا دیئے گئے۔ چنانچہ Protectionism کی جگہ Liberalisation کے اور قومی معیشت (National Economy) کی جگہ (Globalization) کے نغموں کے کیسٹ بجنے لگے اور یہ پلیئر اسی شان بے خودی سے پھر اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ نہ کل ان کی سمجھ میں آیا تھا کہ IMF اور IBRD کیا ہیں نہ آج وہ اس کا شعور رکھتے ہیں کہ ان کی Restructuring کا مفہوم کیا ہے؟ ابھی وہ سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ انہیں IT (انفارمیشن ٹیکنالوجی) کا نیا کیسٹ دے دیا گیا ہے اور ان کی بے خودی اور وارفتگی دیدنی ہے؟

قبضۂ شمشیر سے ہے باہر ہے دم شمشیر کا

پاکستان اور بھارت میں مسلمانوں کے لیے یہ کام سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی سطحوں پر ہو رہا ہے۔ پاکستان میں یہ کام سب سے منظم طریقے سے اس وقت خود سرکار کے ذریعہ ہو رہا ہے اور بھارت میں غیر سرکاری طور پر ایسی ایجنسیوں کے ذریعہ جن میں مسلمان پیش پیش ہیں۔

پاکستان میں اس طرح کی منظم ترین کوشش نادرا (NADRA) کے ذریعہ ہو رہی ہے جو حال ہی میں قائم کی گئی ہے۔ عہد حاضر میں کسی بڑے سے بڑے نیوٹرون بم کے انسانی آبادی پر گرانے سے زیادہ خطرناک یہ کام ہے۔ یہ ایک دودھاری تلوار ہے۔ اس سے قوم کی فلاح بھی ہو سکتی ہے اور منٹوں میں اسے ذبح بھی کروایا جا سکتا ہے۔ جب تک قوم کو تین باتوں کی کما حقہ یقین دہانی نہ کرا دی جائے یہ عمل قومی خودکشی کے مترادف تصور کیا جائے گا ـــ شاید عالمی تناظر میں (NPT & CTBT) پر دستخط کرنے سے زیادہ خطرناک ـــ وہ تین باتیں درج ذیل ہیں:

(۱) اس ڈیٹا بیس کو اہم ترین رازوں کی طرح راز رکھا جائے گا اور کسی بھی چور دروازے سے بہ اجازت یا بلا اجازت عالمی کمپیوٹر نیٹ ورک (Computer Network) میں اسے مندرج (Down Load) نہیں کیا جاسکے گا۔

(۲) راز رکھنے کی یقین دہانی کرانے والے کیا اپنے وجود اور بقا کی یقین دہانی کرا سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے قانونی شخص (Legal Person) کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے باقی رہیں گے۔

(۳) انہوں نے ایسے کیا کیا اقدامات کیے ہیں جن کے ذریعہ بالواسطہ یا غیر معلوم طور پر اس ڈیٹا بیس کو کوئی عوام دشمن اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کرلے یا کسی کو منتقل نہ کردے۔

ہندوستان میں صورت حال کم تشویشناک نہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ایک اردو اخبار میں شائع شدہ ایک خبر سے موجودہ صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"نئی دہلی ۲۶ جون ۲۰۰۰ ـــــ (سہارا خبر رساں رضا)

"جامعہ ہمدرد (دہلی)، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سینٹرل وقف کونسل، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر اور مولانا آزاد فاؤنڈیشن کی جانب سے ۲۷ جون کو صبح دس بجے اطلاعاتی ٹکنالوجی انقلاب اور تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں سے متعلق ایک سیمینار کا ہمدرد کنونشن سینٹر ہمدرد نگر، تغلق آباد نئی دہلی میں افتتاح ہوگا۔

اس دو روزہ سیمینار کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالنے کے لیے آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر لودھی روڈ نئی دہلی میں جناب سید حامد، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب شاہد مہدی جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر جناب سراج حسین اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے ڈائرکٹر جنرل موسیٰ رضا نے شرکت کی۔ "اطلاعاتی ٹکنالوجی انقلاب اور اقلیتوں، کے موضوع پر جناب موسیٰ رضا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل قریب میں زندگی کا ہر شعبہ اطلاعاتی ٹکنالوجی سے متاثر ہو جائے گا۔ اور ہر ٹیلی ویژن انٹرنیٹ سے جڑ جائے گا۔ آنے والی دو دہائیوں میں روزگار کے بیشتر دروازے اطلاعاتی ٹکنالوجی ہی کھولے گی۔ کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹکنالوجی میں ۲۰۰۸ تک تقریباً ۳۲ لاکھ اسامیاں نکلیں گی۔ اس میدان میں ہندوستانی ماہرین کی مانگ بیرون ملک بھی بہت زیادہ ہے۔ جرمنی، اٹلی، اور دیگر کئی یوروپی ممالک میں اس ٹکنالوجی

کے، ہندوستانی ماہرین کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب سید حامد نے کہا کہ پہلی بار ہندوستان کے سات اہم تعلیمی ادارے اطلاعاتی ٹکنالوجی انقلاب اور اقلیتوں کے بارے میں دو روزہ سیمینار کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب شاہد مہدی نے کہا کہ یونیورسٹیاں اطلاعاتی ٹکنالوجی انقلاب کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گریجویشن سطح پر کمپیوٹر خواندگی کو لازمی بنانے کی تجویز پر ہم غور کر رہے ہیں۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر جناب سراج حسین نے اس سلسلہ میں کہا کہ حکومت کے ساتھ ساتھ دانشوروں کو عوام میں کمپیوٹر سے متعلق بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ اور یہ بتلانا ہوگا کہ کون سا کورس طلبا اور طالبات کے لیے بہتر ہے۔ یہ دو روزہ سیمینار اسی سمت میں ایک کوشش ہے۔ جہاں تک اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا تعلق ہے تو مدارس بھی اس سلسلہ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں اور اطلاعاتی ٹکنالوجی انقلاب کو آگے بڑھانے نیز مسلمانوں کو اس ٹکنالوجی میں مہارت فراہم کرانے میں اہم رول ادا کریں گے۔ مسٹر موسیٰ رضا کے مطابق ۲۰۰۸ء تک اطلاعاتی ٹکنالوجی کے تقریباً ۲۲ لاکھ تربیت یافتہ افراد کی متوقع ضرورت کے پیش نظر سالانہ دو لاکھ پچھتر ہزار ایسے افراد کی مانگ ہوگی۔ اگر مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے بھی اس شعبے میں اپنی شرکت درج کرانا چاہیں تب بھی انہیں اپنے ۳۸ ہزار طلباء کو سالانہ تربیت دینا پڑے گا۔ لہٰذا اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو اس ٹکنالوجی کی جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"[1]

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی ۲۷ جون ۲۰۰۰ء)

اسی تعلق سے ایک دوسری خبر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

سہارنپور۔ ۲ جولائی ۲۰۰۰ء سہارا خبر رشاہد زبیری۔

"ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے چانسلر اور مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر و ممتاز دانشور سید حامد نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور بگڑتی ہوئی خاندانی صحت پر تشویش اور تاسف کا اظہار کیا ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اشارۃً سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ ہمارے "مہربان" اس کے لیے تو فکر مند ہیں کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کیسے محدود رکھا جائے مگر وہ ایک قدم بھی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے نہیں اٹھاتے۔ سید حامد نے ان خیالات کا اظہار "اسلامی اصولوں اور ہندوستانی کلچر کی روشنی میں ایک

صحت مند خاندان" کے موضوع پر ایک سیمینار میں اپنے طویل کلیدی خطبے میں کیا۔ سیمینار کا اہتمام ایک غیر سرکاری تنظیم (N.G.O) "پروگرام فار اتھیکل، اکیڈمک اینڈ کلچرل انٹر پرائزز (Programme for Ethical ,Academic and Cultural Enterprises ---- PEACE---) نے ایک (غیر سرکاری N.G.O) تنظیم سفپسا (SIFPSA) کے مالی تعاون سے کیا تھا۔ یہ تنظیم ہندوستانی حکومت کے ساتھ مل کر ہندوستان میں فیملی پلاننگ (Family Planning) کو مقبول عام کرنے کے لیے کوشاں ہے۔" [۲]

(روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ ۳ جولائی ۲۰۰۰ء)

○○

# پانچواں سبب : آئمۃ المضلین کا تسلط

حملے کا دوسرا محاذ امت کے اندر ارتداد یا فرار من الزحف کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جو سبب معلوم ہوتا ہے آئمۃ المضلین کے تسلط کا۔ یہ امت کا داخلی محاذ ہے۔ یعنی یہ وہ محاذ ہے جہاں اسلام، قرآن، سنت اور اسلامی فکر و آداب پر حملے بیرونی طاقتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے ذریعہ ہو رہے ہیں۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ گزشتہ ڈھائی سو سالوں میں مغربی استعمار اور مستشرقین کے، حملوں نے اسلام اور امت مسلمہ کو ایسی تباہی سے دوچار نہیں کیا جیسی تباہی سے اس داخلی ارتداد اور فرار من الزحف نے صرف تیس (۳۰) سالوں میں کیا ہے۔ مغربی استعمار نے ڈھائی سو سالوں میں اسلام کے تناور درخت کی پتیاں نوچ ڈالیں، شاخوں پر لگے پھول اور پھل توڑ ڈالے، ٹہنیاں، حتی کہ شاخیں کاٹ ڈالیں لیکن شجر اسلام پھر بھی سلامت رہا ہے۔ اس کے برخلاف اس موجودہ ارتداد نے اسلام کے درخت کی جڑ ہی کاٹ ڈالی ہے۔ اور اب اس ارتداد کے بطن سے ایک نئی مخلوق پیدا ہوئی ہے جس کا چہرہ مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کے ہاتھوں میں اسلام کے بڑے اونچے اونچے علم بھی ہیں لیکن جن کے کارناموں کو دیکھ کر انیسویں اور بیسویں صدی کے متغربین ـــ سرسید، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، مرزا غلام احمد قادیانی، خیر الدین پاشا، ابراہیم شناسی نامق کمال، جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، طہ حسین اور نیاز فتح پوری جیسے لوگوں کی روحیں بھی اپنی اپنی قبروں میں کانپ جائیں۔

ارتداد کا پس منظر :

اس عاجز نے عرض کیا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت علامہ اقبال نبویانہ نہاد کے حامل تھے۔ چونکہ یہ حضرات قدس ختم نبوت کے بعد تشریف لائے اس لیے منصب کے اعتبار سے تو نبی نہیں تھے لیکن صفات کے لحاظ سے نبی تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی بدبختی کا آغاز اصلاً سترہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے جب سے اس خطے کی یہ ملت پے در پے اللہ کی نافرمانیاں کرنے لگی۔ اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے بار بار اسے سنبھلنے کا موقع دیا گیا اور اس ضمن میں اس پر عنایات پر عنایات ہوئیں۔

یہ تینوں مذکورہ حضرات صفات میں مشترک مگر توجیہ میں الگ الگ تھے۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب توجیہتاً "نبی الملوک" تھے اور حضرت شاہ ولی اللہ "نبی العلماء" اور حضرت علامہ اقبال "نبی الخضرم"۔

حضرت مجدد صاحب کی تشریف آوری کا مقصد اصلی یہ تھا وہ اہل ہند کو اور چونکہ یہاں اسلامی مملکت قائم تھی اس لیے اس کے بادشاہ کو دعوت دیں کہ خلافت عثمانیہ اب اس عظیم ذمہ داری کو اٹھاتے رہنے کی اہل نہیں رہی لہٰذا امت محمدیہ ہندیہ اس ذمہ داری کو اٹھالے چونکہ یہ ذمہ داری کوئی بادشاہ اور وہ بھی سلطنت مغلیہ کا فرماں روا بآسانی اٹھا سکتا تھا لیکن اس سے قبل اسے ایسے اقدامات کرنے چاہئے تاکہ عند اللہ اس کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ حضرت مجدد صاحب کی ضرورت بادشاہ کو مخاطب کرنے کی تھی لہٰذا وہ توجیہتاً نبی الملوک بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امت مسلمہ ہندیہ کی پہلی ہولناک ناکامی اللہ کی رضا کو سمجھنے اور اس پر لبیک کہنے سے پہلو تہی کے تعلق سے ہوئی۔ شاہ جہاں اور عالمگیر نے اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں کوتاہی کی تو مسلم سلاطین ہند کو ڈیڑھ سو سالوں تک توبہ کی مہلت دی گئی اور پھر ان پر اللہ کا غضب ٹوٹا اور مسلسل پانچ سو سالوں سے چلی آرہی حکمرانی کو اللہ نے تہس نہس کر دیا اور پانچ سو سالوں سے حکومت کرنے والی قوم غلام ہو گئی۔ اور بادشاہوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت مغلیہ تاریخ کا حصہ بنادی گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تشریف آوری کا مقصد اصلی اس تناظر میں تھا کہ پوری روئے زمین میں ابلیس نے شیطانی علمی اور فکری انقلاب برپا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اب بادشاہان اور حکومتیں تہذیب و تمدن نہیں دیں گی بلکہ قومیں اور نظام افکار کی بنیاد پر برپا ہوں گے لہٰذا خلافت اسلامیہ کو روئے زمین پر برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے فکری انقلاب کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اللہ نے امت مسلمہ ہندیہ کو دوسرا موقع عنایت فرمایا۔ یہ موقع اب علماء کو دیا گیا کہ وہ زمین پر اللہ کی خلافت کو تھام لیں۔ جسے اب عثمانی بہت دیر تک تھامے نہیں رکھ سکتے۔ اب ابلیس کے ہاتھوں ساری دنیا میں افکار کا ایسا طوفان آئے گا کہ اس میں خلافت عثمانیہ تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔ لہٰذا اس سے قبل امت مسلمہ ہندیہ کو چاہیئے کہ روئے ارض پر خود اسلامی فکری انقلاب برپا کر کے خلافت اسلامیہ کو مستحکم کر لے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی توجیہتاً نبی العلماء بنا کر بھیجے گئے۔ برصغیر کے

لوگوں کی بدبختی کے ایام ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا جب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تشریف لائے تو برصغیر کے علماء میں بعض نے قولاً اور تحریراً اور بیشتر نے عملاً ان کی تکذیب کردی۔ برصغیر کے علماء کے ذریعہ حضرت شاہ صاحب کی دعوت کی تکذیب دراصل انیسویں اور بیسویں صدی میں ابلیس کے عالمی نظام کی ترقی کا سبب بنی۔ چنانچہ برصغیر کے علماء نے خلافت ابلیسیہ کو قائم ہونے سے روکنے اور خلافت اسلامیہ کو نئے افکار و تطبیقات سے سارے عالم میں مستحکم کرنے کی ذمہ داری ادا کرنے سے انکار کردیا اور ان میں سے بعض اپنے مناظروں میں اور بعض ذکر و فکر صبح گاہی میں اور بیشتر شغل عجب میں حسب سابق مشغول رہے چنانچہ برصغیر کے روایتی علماء پر اللہ کا غضب ٹوٹا، ٹھیک ڈیڑھ سو سال کی مہلت توبہ کے بعد اللہ نے ۱۹۲۴ء میں ان کی سیادت و قیادت کو تہس نہس کردیا۔ اب ان علماء کا مقدر بنادیا گیا کہ وہ اہل حکومت، اہل ثروت، اہل سیاست اور جہلاء کے بواب اور ایجنٹ کا فریضہ انجام دیں۔

حضرت علامہ اقبال کی تشریف آوری ایک ایسے وقت میں ہوئی کہ پوری ملت اسلامیہ ابلیس کے ذریعہ نگل لی گئی تھی۔ سلطنت، اقدار، تہذیب، تمدن، افکار، علوم سب پر ابلیس کا مکمل قبضہ ہوگیا تھا۔ اسلامی علوم کے حاملین ـــــ روایتی علماء ـــــ اجنبی اور محصور ہو چکے تھے۔ ایک طرف ان کی باتیں خود ملت اسلامیہ کی اکثریت کے لیے اجنبی ہو چکی تھی تو دوسری طرف وہ خود اس نظام سے نابلد تھے جو ان کے اوپر پچھلے ڈیڑھ سو سالوں سے نافذ ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ روایتی علماء کھلے آسمان کے نیچے ہونے کے باوجود اپنے اردگرد سے اس سے زیادہ واقف نہ تھے جتنے اصحاب کہف۔

یہی سبب ہے کہ حضرت علامہ اقبال تو جیتا نبی الخضرم بنا کر بھیجے گئے یعنی ایک ایسا شخص جو بیک وقت نظام حق اور اس کی گہرائیوں سے بھی باخبر ہو اور موجودہ نظام ابلیس کی گہرائیوں سے بھی۔

بحیثیت مجموعی امت محمدیہ حضرت علامہ اقبال کے عہد میں بالآخر اس ہولناک حادثے سے دوچار ہو ہی گئی جس سے بچانے کے لیے پچھلے تین سو سالوں سے اس خطے کو اللہ پے در پے بلا رہا تھا۔ اس نبی الخضرم نے ۱۹۱۲ء میں صورت حال کی سنگینی کو پالیا تھا۔ اس نے پوری ملت اسلامیہ کو پکارا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

---

بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

---

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

---

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
پس از مدت گزار افتاد برما کاروانے را

لیکن برصغیر کی ملت اسلامیہ نے اور بطور خاص اس کے ملاء نے اس نبی المخضرم کی تکذیب کردی۔ قائدین، علماء، مشائخ، اہل مدرسہ اور عصری علوم کے دانش ور، سبھوں نے تکذیب کی۔ چنانچہ جب اس کی آنکھوں نے خلافت کا بکھرنا دیکھا تو اس نے پکارا :

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

لیکن یہ قوم ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ نہ علماء، نہ مشائخ، نہ قائدین نہ عصری علوم کے دانشور۔ چنانچہ اس نے اپنا خون جگر اس طرح سڑکوں پر بہادیا شاید کہ کوئی آنکھ نم ہو :

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہی طناب ادھر — کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات — کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

اس شخص کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت مجدد صاحب سے لے کر خود اس کی ذات تک یہ امت کیوں اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں ناکام ہوئی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اس صدی میں اپنی کوششوں کی ناکامی کے اسباب میں سے بنیادی سبب کی جو نشاندہی کی ہے وہ بیسویں صدی میں امت کی تاریخ کا دردناک باب ہے :

آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو — نکلے تری تلاش میں قافلہ ہای رنگ وبو

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ ومردہ ذوق　　خلوتیان میکدہ کم طلب وتہی کدو
میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ　　میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

چنانچہ آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے کر وہ نبی الخضرم اپنے رب سے جاملا۔

عقل ودل ونگاہ کا مرکز اوّلین ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرح ودیں، بتکدہ تصورات
تازہ میرے ضمیر پر معرکۂ کہن ہوا　　عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

## ارتداد کی شروعات :

۱۹۰۴ء میں یہودیوں اور مغرب میں ان کے حلیفوں ـــــ برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی وغیرہم کے مابین پورے عالم اسلام کو تہہ وبالا کر دینے، خلافت اسلامیہ کو ختم کر دینے، پورے عالم عرب اور عالم ترک وبربر پر قبضہ کر لینے اور مقامات مقدسہ کو چھین لینے ـــــ کے لیے جب سازش مکمل ہوگئی اور عالم عرب اور عالم ترک کے عامۃ المسلمین کو چھوڑ کر بقیہ پوری عربی اور ترکی اشرافیہ عملاً فری میسن ہو کر یہودی ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم اسلام کی حفاظت اور نگہداشت کی ذمہ داری عملاً برصغیر کے مسلمانوں کو دینی چاہی۔ حدیث کے الفاظ کے مطابق اللہ کی رضا فرشتوں کے ذریعے روئے زمین اور بطور خاص برصغیر کے صالحین کے قلوب پر منعکس ہوئی۔ اللہ کی رضا کا یہی وہ آفاقی فیصلہ تھا جس کا ظہور برصغیر میں کسی بھی مسلم علاقے سے زیادہ حتیٰ کہ خود عالم عرب اور عالم ترک سے بھی زیادہ ـــــ تحریک خلافت کے نام سے ہوا۔ برصغیر کی امت مسلمہ کے بعض صالح اذہان وقلوب نے اس ذمہ داری کا ادراک اور وجدان تو پایا جس کا اظہار ان مضامین سے ہوتا ہے جو الہلال میں ۱۹۱۵۔ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے اور اب مولانا آزاد کی کتاب مسئلۂ خلافت میں اور بطور خاص اس کے آخری حصے میں درج ہیں۔

لیکن برصغیر کے باقیماندہ مسلم حکمراں، دانشوران اور بطور خاص علماء ومشائخ کے بروقت اور درست ادراک کے باوجود ان کے اندر کی پرانی خرابی ان کے آڑے آئی۔ چونکہ انیسویں صدی میں ملت کی قیادت کی ذمہ داری علماء پر کلیتاً آگئی تھی اس لیے بحیثیت قائد علماء نے اس نئی اور آفاقی ذمہ داری کے تناظر میں اپنی معلومات، واقعات عالم پر علمی گرفت، قرآن وسنت میں رسوخ، اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے، اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری صلاحیتوں کا ادراک کرنے، پوری امت میں پائی جانے والی صلاحیتوں کو جمع کرنے

اور فقدان کی صورت میں صلاحیتوں کو Upgrade کرنے کے تعلق سے اپنا احتساب نہیں کیا۔ حسب سابق ان پر سرمستی طاری رہی ـــ کہ (۱) وہ قرآن وسنت کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ (۲) جو کچھ ان کے پاس ہے وہی اسلام کا علم ہے۔ (۳) جو بات ان کی عقل میں نہیں آتی یا ان کے دائرۂ علم سے باہر ہے وہ قرآن وسنت کا علم ہی نہیں ہے (۴) جو کچھ ان کی عقل کے مطابق ہے یا ان کے دائرۂ علم کے اندر ہے وہی علم دین ہے۔ (۵) آج بھی روایتی علماء اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں باطلانہ نظام کے اہل علم بطور خاص یہودی، عیسائی اور مشرک اہل علم اور علماء ہمیشہ مسلم علماء کی وسعت علم کے سامنے عاجز اور مبہوت ہوگئے اور کوئی بھی عالم دین کبھی بھی عاجز و مبہوت نہیں ہوا اور دوسری طرف تاریخ کی گواہی ہے کہ انہیں دنوں دنیا میں ہر جگہ اسلام اور امت مسلمہ مغلوب بھی ہوتے رہے (۶) جو علم وہ رکھتے ہیں وہ ہر کام کرنے کے لیے کافی ہے۔ (۷) چونکہ وہی اللہ کے برگزیدہ ہیں لہٰذا ان کا کام صرف پھونکوں سے چل جائے گا۔ (۸) کوئی کام صرف اس لیے نہیں ہو رہا ہے کہ ہم علماء اور مشائخ اس کے لیے نہیں اٹھے ہیں۔ جس دن ہم اٹھ جائیں گے دنیا کا نقشہ بدل ڈالیں گے۔ (۹) ان علماء اور مشائخ کے سوا بقیہ امت، اسلام کی مملکت کے دوسرے درجے کے شہری ہیں اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اور ان دوسرے درجے کے شہریوں میں وہ بہر حال غنیمت ہیں جو اسلام سے بالکل نابلد اور ان کے قدردان ہیں۔ ورنہ جو عصری علوم سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ سے بھی واقف ہیں اور امت اور اسلام کا درد رکھنے والے بھی ہیں وہ تو گویا کسی متعدی مرض والے ہیں جس سے ہر صحیح العقیدہ مسلمان کو دور رہنا چاہئے۔

ظاہر ہے یہ باتیں ان علماء سے متعلق نہیں جو قرآن واحادیث مبارکہ کی نظر میں فی الواقع علماء ہیں۔ ایسے علماء کرام ان علماء معروف کے ہاتھوں مخلص عامۃ الناس کے مانند اسی طرح اذیتیں اٹھا رہے ہیں جیسا کہ انبیاء بنی اسرائیل علماء بنی اسرائیل کے ہاتھوں اٹھاتے تھے۔

چنانچہ اس کا نتیجہ درج ذیل صورتوں میں نکلا:

(۱) برصغیر کی امت مسلمہ اس عظیم آفاقی اور امتی ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر لینے اور اس کا حق ادا کرنے میں بحیثیت ملت مجموعی طور پر ناکام ہوگئی۔

(۲) برصغیر میں موجود امت مسلمہ کی صالح اور مؤثر صلاحیتوں کو (Intensively)

اور (exterisively) یکسو نہیں کیا جاسکا۔اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح اور وقتی اور جذباتی نعرہ بازیوں میں مشغول بھیڑ کی طاقت کا مظاہرہ تو ہو گیا جس کے دو بڑے نقصانات ہوئے۔

(۱) بیدار دشمن کو امت کی حقیقی طاقت کو زیادہ Accuracy کے ساتھ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا۔

(۲) دیگر خوابیدہ دشمن، نادیدہ خطروں کے پیش نظر بیدار ہو گئے۔

(۳) برصغیر اور یہاں آباد امت مسلمہ ـــــ یہودیوں اور ان کے مغربی حلیفوں کی نظر میں ان کی اصطلاح International Threat کے اعتبار سے (Main Thrust Point) بن گئے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کے بعد جہاں یہ مسلم زعماء نعرہ بازیوں میں مشغول تھے ان کے عالمی دشمن ان کے خلاف عالمی سازش تیار کر رہے تھے جن پر عمل درآمد کے لیے ایک خصوصی عالمی ماہر فن اور بیسویں صدی کے یہودی اکابر میں سے ایک Lord Reading ہندوستان آیا۔اور اس نے صرف تین سالوں میں پوری ملت اسلامیہ ہند اور اس کے ساتھ ساتھ پوری ملت اسلامیہ عالم کی قسمت پر ایک سو سال کے لیے مہر لگادی۔ چنانچہ عالمی صیہونیت کا وہ جرنیل جب ہندوستان سے جارہا تھا تو اس کی جیب میں کتنے شیخ التفسیر، کتنے شیخ الحدیث، کتنے قطب الاقطاب، کتنے دانشور، سیاست داں اور فوجی جنرلوں کے عہد نامے تھے جن میں سے بیشتر نے طوعاً اور بعض نے مجبوراً عہد کیا تھا کہ اعلیٰ حضرت ہم عہد کرتے ہیں کہ عتبات اسلامیہ کو ڈھانے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے میں ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ (یہ موقع نہیں کہ اس عنوان پر یہ عاجز مزید کچھ لکھے)۔

(۴) اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ برصغیر اور اس کے تناظر میں پوری ملت اسلامیہ کی قیادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے علماء کی اس نسل کو معزول کر دیا۔اور در بدر بھٹکنے اور ٹھوکر کھانے کے لیے قوم کو اور ان کی ٹھوکریں کھانے کے لیے علماء کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے بعد برصغیر کی ملت اسلامیہ پر وہ دور شروع ہوا۔ جسے قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

**فاذا جاء وعد الآخرة ليسوءا وجوهكم وليدخلوا المسجد كما دخلوه اوّل مرة وليتبروا ما علوا تتبيرا۔** (بنی اسرائیل:۷)

ترجمہ: پھر جب دوسرے عذاب کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔

(۱) چونکہ برصغیر کی ملت اسلامیہ کے سواد اعظم نے اللہ کی رضا کے پورا کرنے میں

کوتاہی کی اور اب تک توبہ کرنے سے روگرداں رہی تھی لہٰذا سنت اللہ کے مطابق ۱۹۲۴ء کے بعد سواد اعظم میں جزر یعنی بھاٹا کا دور شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے۔ خواہ وہ ۱۹۴۷۔۱۹۴۶ء کے شمالی ہند کے فسادات ہوں یا ۱۹۴۷ء سے اب تک ہونے والے کلکتہ، جمشید پور، جبل پور، نیلی، مراد آباد، احمد آباد کے نہ ختم ہونے والے فسادات کا سلسلہ ہو یا ۱۹۷۱ء کا بنگلہ دیش کا قتل عام ہو یا گزشتہ دس سالوں سے جاری کراچی کی خونریزی ہو یا بابری مسجد کا انہدام ہو یا دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کی لٹکتی ہوئی تلوار ہو یا مساجد و مدارس کے ختم کر دینے کے لیے مذہبی مقامات بل کی منظوری ہو۔

قرآن کا ارشاد ہے:

واذ قال موسیٰ لقومه یقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم۔ (البقرہ:۵۴)

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان۔

(۲) چونکہ یہ بھی سنت اللہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے لیے ایک ملت کی کوتاہی کے بعد دوسری ملت کے برپا کرنے کا فیصلہ اسی وقت کرتا ہے جب اس امت کے ہر ہر طبقے پر اس کی حجت پوری ہو جاتی ہے۔ اور اس مدت میں اللہ اپنی رضا کو اس ملت کے چھوٹے سے چھوٹے گروہ پر پیش کرتا ہے کہ اگر وہ گروہ اسے اٹھالے تو اسی کے بارے میں اللہ کی نصرت کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے شمال مغربی حصے کو نصف صدی آتے آتے اپنی رضا پیش کر دی اور پورے پچیس سالوں تک اس ملت کے ردعمل کا اللہ نے انتظار کیا۔ افسوس کہ یہ ملت دوسروں سے کچھ مختلف ثابت نہیں ہوئی۔ اس ملت کو تو اپنے وجود اور مقصد وجود کا ہی ادراک نہ ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اپنی قدرت کاملہ (جس میں کسی انسانی طاقت کو دخل نہیں) سے وجود بخشا ہے تاکہ وہ پوری روئے ارض میں اللہ کی رضا کو پورا کرے۔

لیکن ابھی اس ملت کی پیدائش کو دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے قومیت کی بت پرستی شروع کر دی۔ قرآن نے اسی صورت حال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لهم قالوا یٰموسیٰ اجعل لنا الٰها کما لهم الهة قال انکم قوم تجهلون۔ ان هٰؤلاء متبرما هم فیه وبٰطل ما کانوا یعملون۔ قال اغیر الله ابغیکم اِلٰها وهو فضلکم علی العٰلمین۔ (الاعراف:۱۴۰۔۱۳۸)

ترجمہ: اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے تو پہنچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کو۔ کہنے لگے اے موسیٰ بنادے ہماری پوجا کے لیے بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں۔ کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو۔ یہ لوگ اس چیز سے لگے ہوئے ہیں جو تباہ ہونے والی ہے۔ اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ کہا کیا اللہ کے سواء ڈھونڈھوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود حالانکہ اس نے ساری دنیا میں اپنی بھلائی کے لیے تم کو منتخب کیا ہے۔

چنانچہ پاکستان کے سرداروں نے حضرت علامہ اقبال کے اسلامی محراب کے نیچے کھڑے ہو کر نیت باندھنے سے انکار کر دیا اور اسے بڑی چابکدستی سے اشتیاق حسین قریشی کے مسلمان محراب سے بدل دیا۔ لیکن جس کی آسودگی اسلامی محراب سے نہیں ہو سکتی تھی بھلا اسے مسلمانی محراب میں خاک لطف ملتا۔ اسے تو مرئی بت چاہئے تھا۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ایک بت بنایا جائے گا۔ اور اگر ایسا بت تراشنے کے لیے کوئی ماہر فن ملک میں نہ پایا جاتا ہو تو نہ سہی اس کار خیر کے لیے R.E.M. Wheeler یا J.Marshall، کو بلانا پڑے تو بلایا جائے۔

ظاہر ہے اس کا جو نتیجہ بر آمد ہونا تھا ہوا۔ قبلہ کے بدلتے ہی صفا اور مروہ کے بجائے سیٹو (SEATO)، سینٹو (CENTO) اور میڈو (MEADO) کے مابین سعی شروع ہو گئی۔ چنانچہ کعبۃ اللہ کے ڈھانے اور اسلام کے خاتمے کا جو عہد نامہ انفرادی حیثیتوں سے بر صغیر کے علماء، مشائخ اور دیگر ارباب حل وعقد نے (۱۹۲۴ء) میں لارڈ ریڈنگ سے کیا تھا اب اسی عہد کی تجدید بحیثیت مملکت خداداد نے کر دی۔ چونکہ ۱۹۲۳ء میں روئے ارض پر وہ جھنڈا گر گیا تھا جسے نبی آخر الزماں ﷺ نے ایستادہ کیا تھا اور اللہ کی نظر میں ابلیس کے مکر کبار کا جواب دینے اور اس جھنڈے کو پھر ایستادہ کرنے کی صلاحیت نہ عرب میں تھی نہ ترک میں اس لیے کہ ان دونوں کی قیادت کے مرتد اور باغی ہونے کے سبب ہی تو یہ جھنڈا گرا تھا اس لیے اللہ کی رضا، بر صغیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن جب بر صغیر کے علماء اور دیگر قائدین نے اس ذمہ داری کو ادا کرنا تو الگ رہا ابلیس کے جھنڈے کو اٹھانے کی حامی بھر لی تو اللہ کی نظر اپنی سنت کے مطابق اس ملت کے اندر موجود کسی بھی چھوٹے گروہ کی طرف دیکھنے لگی جو اس ذمہ داری کو اٹھانے کو آمادہ ہو۔

اس تاریخی گھڑی میں اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی اس ذمہ داری کو اٹھا لیتا اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے مٹھی بھر جمعیت کے ساتھ بھی صف آراء ہو جاتا اور اس جھنڈے کو اٹھا کر

ایستادہ کر دیتا تو اللہ اس خطے پر اپنی نعمتوں کی بارش کر دیتا۔ اس انتخاب الٰہی کے صرف ۱۵ دنوں بعد روئے ارض پر وہ سلسلہ شروع ہونے والا تھا جس کی خاطر رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا گرایا گیا تھا۔ چنانچہ ۲۹ اگست، ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے فیصلہ لے لیا کہ اب اس کام کا آغاز کر دیا جائے جس کے لیے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ برصغیر اور مشرق وسطیٰ میں صرف نو مہینوں کے وقفے سے دو غیر معمولی ظہور کا واقع ہونا در اصل اللہ اور ابلیس کے دو فیصلوں کے مظہر تھے۔ لیکن افسوس کہ برصغیر کی امت مسلمہ اس نازک اور فیصلہ کن گھڑی میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ناکام ہو گئی۔ قوم اور اس کے ملاء اپنے مقصد وجود کو ہی بھلا بیٹھے اور علماء اور دیگر اہل حق اللہ کی رضا کا حقیقی مفہوم سمجھ کر اقدام کرنے کے بجائے فقہی موشگافیوں میں ہی الجھے رہ گئے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ یہ قوم وہ کام کرتی ہے جس کے لیے اسے برپا کیا گیا تھا یہ وہ کام کرنے لگی جس کا ذکر قرآن میں یوں کیا گیا ہے:

> "یاد کرو کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعے سے سیدھا راستہ پاسکو۔ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے۔ لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔ اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
>
> یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے مگر پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔
>
> ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔ من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں کھاؤ مگر انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ظلم کیا۔
>
> پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا یہ بستی جو تمہارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ

ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا حطۃ حطۃ ہم تمہارے خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے مگر جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کر رہے تھے۔

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اللہ کا دیا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔ تو موسیٰ نے کہا: کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟

ٹھیک ہے، جاؤ، دفع ہو جاؤ، ہٹ جاؤ، اترو اور چلے جاؤ کسی جگہ۔ جو کچھ تم مانگتے تھے، وہاں مل جائے گا۔ اور اس طرح ذلت، خواری، پستی اور بدحالی ان پر مسلط کر دی گئی۔ اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگے، اور نبیوں کو قتل کرنے لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرنے لگے تھے۔ (البقرہ: ۶۱۔۵۵)

چنانچہ اللہ کی رضا پورے بیس سالوں تک بے قراری سے اس قوم کو دیکھتی رہی۔ اس مدت میں اس روئے زمین پر جہاں اس خدائے ذوالجلالی کے نبی مکرم نے ابلیس کو شکست دے کر حق کا جھنڈا ایستادہ کیا تھا۔ اور اعلان کیا تھا: حق آیا اور باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹ جانے کے لیے ہی ہے" ـــــ اس زمین پر اللہ کی مملکت اور اس کی اتھارٹی (Authority) یعنی خلافت ڈھا دی گئی تھی اور ابلیس نے روئے زمین پر اللہ کی مملکت کو ڈھا کر خلافت ابلیس قائم کر دی تھی۔ اور اب جسے اللہ نے ابلیس کی خلافت کے قیام سے ۹ ماہ قبل خلافت اللہ کی کنجی دی تھی اس نے اس کنجی کو ابلیس کے ہاتھوں میں گروی رکھ دی اور اس دوران اللہ کی رضا بے چینی سے دیکھتی رہی۔ یوں تو برصغیر کے مسلمانوں پر اللہ کے غضب کے اتر آنے کے لیے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو مکمل جواز پیدا ہو گیا تھا لیکن اللہ کی شان کریمی رحم پر رحم کرتی رہی۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ پاکستان

کی قسمت کا فیصلہ اسی دن ہو گیا تھا جب ۹ جون ۱۹۶۷ء کو اسحاق رابن کی قیادت میں ابلیس کی فوج المسجد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اہل دل کو پورا پورا اندازہ تھا کہ اب برصغیر کے مسلمانوں اور بالخصوص اہل پاکستان کی خیر نہیں ہے۔ اللہ کا غضب ان پر اتر کر رہے گا۔ جب اللہ کے گھر پر ابلیس کا قبضہ ہو گیا تو ان کے گھر کیوں سلامت رہیں؟ چنانچہ اللہ کے غضب کے فیصلے ۱۹۶۸ء سے نافذ ہونا شروع ہوئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ تک ان فیصلوں نے صورت حال واضح کر دی تھی کہ اب اس خطے کو اللہ تعالیٰ عبرتناک سزا دے گا۔ چنانچہ پہلے طوفان آیا اور لاکھوں اموات ہوئیں۔ غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ القدس کے اجڑے ہوئے مسلمانوں کو بے دردی سے کچلنے کے لیے یہودیوں کے خاندانی عمیل کی مدد اس قوم نے کی جس کو اللہ نے اپنے گھر اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے بچانے کی ذمہ داری دی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستانی فوجوں نے معصوم فلسطینیوں کو اسی طرح قتل کیا جس طرح یہودیوں اور شاہ حسین نے چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ امام مبین میں درج کر رہا تھا۔ چنانچہ ابھی تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ارباب حل وعقد کو اس دروازے کے کھولنے کی طرف بڑھا دیا جس کے کھلنے کے بعد آنے والی تازہ ہوا سے یہ قطعاً نابلد تھے۔ اور اسی ہوا میں ان کے لیے بلا تھی۔ اس سے پہلے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو یہ ایک اور دروازہ وا کر چکے تھے جس کے بعد ۷ دسمبر کا دروازہ انہیں وا کرنا ہی تھا۔ یحییٰ خان، بھٹو اور مجیب میں کون غلط تھا یا کون صحیح یہ بحث نہیں۔ پوری قوم کو جب سزا دی جاتی ہے تو اللہ کسی کو کسی پر مسلط کرتا ہی ہے۔ اللہ کا غضب ٹوٹا اور برصغیر کی نو سو سالہ اسلامی تاریخ میں پہلی بار عوامی سطح پر بھائی نے بھائی کا خون اس بے دردی سے بہایا کہ ساری حرمتیں پامال ہو گئیں۔ برصغیر کا کون گھر ہو گا جو خون کے آنسو نہ رو رہا ہو۔ لیکن اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔[1] آج بھارت ہو یا بنگلہ دیش یا پاکستان ـــــ مومن ہر جگہ ذلیل و رسوا ہو رہا ہے۔ اللہ کے احکام ہر جگہ پامال ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک کے ہاتھوں تو وہاں دوسرے کے ہاتھوں۔ آج اگر بدقسمتی سے جیسی کہ اطلاعات مل رہی ہیں (جسارت ۲۷ جون ۲۰۰۰ء)۔ حکومت پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا تو اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تاریخ میں نشان عبرت بنا دے گا۔ یا تو اس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا یا اس پر ایسی ذلت اور خواری مسلط کر دی جائے گی جو تاریخ میں بے نظیر ہو گی۔ یوں بھی خود پاکستان ہی کے ذریعہ

اسرائیل کو تسلیم کر لینے کے بعد پاکستان کا عند اللہ کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اگر ایسا ہوا تو کوئی ضروری نہیں کہ عذاب اسی عنوان سے آئے۔ عذاب اور اسکی شکل میں باطنی ربط کے باوجود ظاہراً فرق ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے آنے والا عذاب اب سندھ سے شروع ہو۔

## ارتداد اصلی کا آغاز :

حضرت علامہ اقبال توجیہاً نبی المخضرم تھے۔ اس لیے ان کے مخاطب دو اقسام کے ہو سکتے تھے۔ غالب مغرب نہاد اور غالب اسلام نہاد۔

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد سیشن میں ظاہر کیے گئے علامہ اقبال کے خیالات نے ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان کی شکل لے لی۔ لیکن جو طبقہ اس میں پیش پیش تھا وہ امت کا وہ طبقہ تھا جسے غالب مغرب نہاد کہا جاتا ہے اور اس وقت جس کی نمائندگی مسلم لیگ کر رہی تھی۔ یہ بتانا قطعاً مشکل ہے کہ یہ طبقہ فی الواقع مخلص بھی تھا یا محض عامۃ المسلمین کے جذبات کا استحصال کر رہا تھا اس لیے کہ ابھی پاکستان بنے چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے اس مقصد سے کفر کر دیا جس کی اس نے علم برداری کی تھی۔ اس طبقے کو پاکستان کے بن جانے کے بعد اسے مسلمانوں کا ایک قومی بت خانہ بنانے کی فکر لگ گئی اور انہوں نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کہ وہ ملک کیوں وجود میں لایا گیا تھا۔ اس طرح برصغیر کے ایک اور طبقے نے نہ صرف اللہ کی رضا پر لبیک کہنے میں کوتاہی کی بلکہ اس کاز سے علانیہ مرتد ہو گئی۔

سنت اللہ کے عین مطابق اسی کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ ایک دوسرے گروہ کی پرورش کر رہا تھا۔ جسے تحریک اسلامی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے انتقال اور قرار داد پاکستان پاس ہوتے ہی مسلم لیگ کے بیشتر علمبرداروں کے رویے سے اللہ تعالیٰ باخبر تھا کہ یہ حق کو پامال کر دیں گے۔ شاید اسی لیے ۱۹۴۱ء میں برصغیر میں اللہ تعالیٰ نے اسی علامہ اقبال کے متاثرین و مسترشدین کے ایک دوسرے طبقے کو آگے بڑھنے کی توفیق دی۔

واضح ہو کہ یہ ساری نشاتیں اللہ تعالیٰ کی اس رضا کی تکمیل کے لیے ہو رہی تھیں جس کا بنیادی مقصد تھا روئے ارض پر خلافت اللہ کے گرے ہوئے علم کی پھر سے اقامت۔

۱۹۴۱ء میں قائم ہونے والی تحریک اسلامی دراصل اسی کے لیے برپا کی گئی تھی جو غالب

اسلام نہاد لوگوں پر مشتمل تھی۔

احوال و آثار بتاتے ہیں کہ اس تحریک کا نقطۂ عروج ۴۳۔۱۹۴۴ء تھا۔ اللہ کی رضا کے لیے برپا ہونے والے کسی فرد یا جماعت کا نقطۂ عروج وہ لمحہ ہوتا ہے جب اس فرد یا اس کے پیچھے چلنے والوں کے قلوب پر عرش کی روشنی براہ راست منعکس ہو رہی ہو۔ جو اللہ چاہتا ہو وہی ان کے قلوب پر مترشح ہو رہا ہو۔ اور ان پر مرضیات الٰہی کی ایسی سرمستی طاری ہو کہ اگر راہ میں ہمالیہ پہاڑ بھی آجائے تو وہ اسے بھی روند ڈالنے کا عزم رکھتے ہوں۔ علامہ اقبال نے اسی کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

عرش معلّٰی سے کم سینہ آدم نہیں — گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ — سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کے شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

یہ کیفیت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ پر ۴۳۔۱۹۴۴ء میں طاری تھی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کا نقطۂ کمال ان کی وہ تقریر ہے جو روداد حصہ دوم میں درج ہے۔ یہ تقریر ایک حجۃ البالغہ تھی۔ یہ تقریر قول فیصل تھی۔ اور آج یہ تقریر برصغیر کے مسلمانوں کی بدبختی کی وہ دستاویز ہے جس پر ۱۹۴۷ء میں قدرت نے فیصلہ کر دیا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ کی تقریر سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ مولانا اس راز کو پا چکے تھے کہ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کی رضا برصغیر کے مسلمانوں کی طرف مائل ہے لیکن یہاں کے مسلمان اور ان کی چلی آرہی ذہنیت اور ان میں پایا جانے والا تصور مذہب اس عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ چنانچہ اس کا واضح اظہار مولانا نے ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو کر دیا:

> "میں آپ حضرات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ میری طرف سے دعوت کی ایک ہی صدا سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے موجودہ زمانے کی پر صعوبت

سفر کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہو گئے۔ اس طرح میری آواز پر لبیک کہہ کر آپ نے میری طاقت میں بھی اضافہ کیا اور اپنی طاقت میں بھی۔ ایسا نہ کرتے تو میں اپنی جگہ کمزور ہو جاتا اور آپ اپنی جگہ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری یہ تحریک جو ایک بہت بڑے عزم کا اظہار ہے خود بخود ٹھٹھر کر رہ جاتی۔ آپ جب کسی شخص کو کسی مقصد عظیم کے لیے خود اپنا امیر بناتے ہیں تو اس کی اطاعت کر کے دراصل اپنی ہی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ آپ کے اندر انانیت و خود پسندی ہو گی اور جتنی کم اطاعت کا اظہار آپ سے ہو گا اتنا ہی آپ کا اپنا بنایا ہوا امیر کمزور ہو گا۔ اور اسی قدر اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ کی جماعتی طاقت ضعیف ہو گی۔ اور اس کے برعکس جس قدر زیادہ آپ کے قلب و دماغ پر اپنے مقصد کا عشق حاوی ہو گا اور اس عشق میں جتنا زیادہ آپ اپنی خودی کو فنا کریں گے اور جتنی زیادہ اپنے مقصد کی خاطر اطاعت امر کا صدور آپ سے ہو گا۔ اسی قدر زیادہ آپ کا مرکز قوی ہو گا۔ اور آپ کی جماعتی طاقت زبردست ہو گی۔ میں دیکھ کر اکثر اپنی جگہ خوش ہوتا ہوں کہ ہماری اس جماعت میں شخصیت پرستی اور ذہنی غلامی موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کے اندر اچھی خاصی نقادانہ نظر موجود ہے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کی تنقیدی نگاہیں خود میرے اوپر پڑتی ہیں لیکن یہ خیال رکھئے کہ جتنی کڑی تنقیدی نگاہ آپ مجھ پر ڈالتے ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ ایسا کریں اتنی ہی کڑی تنقیدی نگاہ میں بھی آپ پر ڈالتا ہوں اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ ایسا کروں۔ آپ سے امر کی اطاعت اور ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی فائر نہیں کرتیں۔ اور ظاہر ہے ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہو گا جو کسی بڑے اقدام کا ارادہ کر بیٹھے۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ سوم، ۴۵۔۱۹۴۴ء صفحات: ۱۰۔۱۲)

کائنات میں معرکۂ خیر و شر کے مرحلوں میں سے یہ اس صدی کا سب سے سنگین مرحلہ تھا۔ ٹھیک اسی وقت، جب حزب اللہ بننے کے لیے منتخب کی جانے والی برصغیر کی امت مسلمہ ان داخلی کمزوریوں، بے یقینی اور بے پروائی کی صورت حال سے گزر رہی تھی روئے ارض پر حزب الشیطان بڑے بڑے فیصلے کر رہا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو ریاستہائے متحدہ امریکہ یعنی ریاست دجال کے پیش خیمہ کے صدر

فرینکلن ڈوائٹ روزولٹ (Franklin D. Roosevelt) نے اس عبوری ریاست دجال یعنی U.N.O کا خاکہ پیش کر دیا۔ ۲۵ اپریل تا ۲۶ جون ۱۹۴۴ء کو سان فرانسسکو میں اس کا چارٹر تیار کیا گیا۔ اگست۔ اکتوبر ۱۹۴۴ میں ڈمبرٹن اوکس (Dumbarton Oaks) میں اس پر بحث ہوئی۔ اور جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰ ابلیسی ملکوں نے اس عبوری دجالی ریاست کے چارٹر پر دستخط کر دیئے۔ اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ان ملکوں کی توثیق سے روئے ارض پر ابلیس اور یہودیوں کی ریاست دجال کی عبوری حکومت قائم ہو گئی۔[۳]

اس وقت اللہ، عرش اور السمٰوات والارض کی کیفیات کیا ہوں گی کوئی بھی شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس روئے ارض سے عرش بریں تک کیسا طوفان برپا ہو گا۔ ایک طرف حزب الشیطان ابلیس کے ایک اشارے پر خلافت اسلامیہ کو گرا کر ایک عالمی دجالی ابلیسی خلافت قائم کر رہا تھا اور دوسری طرف نام نہاد حزب اللہ اللہ کی طرف سے بار بار متوجہ کرنے اور فرشتوں کی ہر ممکن مدد کے وعدے کے باوجود اٹھ کر بیٹھنے تک کے لیے تیار نہ تھا۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کی مولانا مودودی کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ برصغیر کی امت مسلمہ اس عالمگیر ذمہ داری کے اٹھانے کے تعلق سے اللہ کی رضا کا ساتھ دینے کی منکر ہو گئی ہے اور ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو حزب اللہ نے اللہ کے حکم پر اٹھ کھڑا ہونے اور اس کی رضا پوری کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا جبکہ اس کے ٹھیک ۳۳ دن بعد حزب الشیطان ابلیس کی حکم کی تعمیل کے لیے عملی اقدامات کے عہد کی توثیق کر رہے تھے اور ٹھیک چھ ماہ بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو انہوں نے ابلیس کی حکومت عملاً قائم کر دی۔

بلاشبہ برصغیر کی امت مسلمہ حضرت علامہ اقبال کے دوسرے بازو 'غالب اسلام نہاد' کی دعوت پر بھی لبیک کہنے سے قاصر رہی اور اس طرح رضاء الٰہی کے کفر کی ایک بار پھر مرتکب ہو گئی۔ برصغیر کی امت مسلمہ نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک اللہ کی رضا پر لبیک کہنے اور اپنی آفاقی ذمہ داریاں ادا کرنے سے جن کا اظہار علامہ اقبال نے "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے" اور "لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر" سے کیا تھا ـــــ جو کفر کیا اس کی پاداش میں وہ اب تک اللہ کے عذاب میں گھری ہوئی ہے۔ اور ۱۹۴۸ء کے بعد سے آج ۲۰۰۰ء تک پورے برصغیر میں اسے اتنے عذاب کے طمانچے لگے ہیں کہ اس کی شکل پہچانی نہیں جا رہی ہے۔

اب مولانا مودودی اور ان کے ساتھ اس چھوٹی سی جمعیت کی ذمہ داریاں سوا ہو چکیں تھیں۔ تاریخ معرکۂ خیر و شر میں یہ گروہ ۱۹۴۵ میں ایک تاریخی مقام پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے پاس صرف دو راہیں تھیں ـــــ

(۱) یہ گروہ اپنی جگہ کتنا ہی بے بضاعت سہی مگر اللہ کی رضا کی تکمیل کے لیے اور اللہ کی رضا کے عین مطابق نکل کر صف آرا ہو جاتا۔ اور اس کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتا۔

(۲) یا علانیہ یا بالواسطہ پہلو تہی کر جاتا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ:

(۱) برصغیر کی امت مسلمہ اللہ کی رضا پر لبیک کہنے سے کافر ہو گئی تھی اور اب عذاب اس کا مقدر تھا۔

(۲) اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جس گروہ نے مولانا مودودی کی پکار پر لبیک کہا تھا اس میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کو اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی۔ (ملاحظہ ہو امیر جماعت کی تقریر: روداد اجتماع دار الاسلام حصہ دوم، دوسرا ایڈیشن)

(۳) اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر ان غیر یکسو یا نیم یکسو لوگوں سے یکسر الگ ہو جایا جاتا تو باقی رہنے والے مخلصین سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہوتے۔

ان سب باتوں کے باوجود اللہ کی رضا کے ادراک اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت اور ایسی صورت میں اس کی نصرت کے یقین کا تقاضا تھا کہ حضرت مولانا اوّل الذکر راہ اختیار کرتے۔ لیکن اس عاجز کی ناقص رائے ہے کہ حضرت مولانا مودودی عین اس وقت ضرور ایک تذبذب کا شکار ہو گئے اور یہ تذبذب معروف فقہ کی اجتہادی غلطی نہیں تھی بلکہ معرکۂ خیر و شر کی اجتہادی غلطی تھی جہاں دوسرا موقع نہیں ملتا کہ تلافی کی جائے۔ اب یا تو اللہ از خود معاف کر دے یا لوگ، توبہ کریں اور اللہ قبول کر لے ورنہ عذاب آ کر رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

**ماکان لنبی ان یکون له اسریٰ حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا والله یرید الآخره والله عزیز حکیم. لولا کتٰب من الله سبق**

لمسّکم فیما اخذتم عذاب عظیم۔ (الانفال:۶۷۔۶۸)

ترجمہ:

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے۔ اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔

اس عاجز کی ناقص رائے میں حضرت مولانا کے تذبذب کا بنیادی سبب یہی تھا کہ فیصلہ کرتے وقت ان کی نظر جتنی اللہ کی رضا کے تقاضوں اور اس کی عظمت پر مرکوز تھی خود اللہ کی رضا اور اس کی نزاکت پر نہیں رہ پائی۔

ایک مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں:

ایک شائستہ اور مہذب آدمی کو اپنے بیٹے کو کسی مشہور معالج سے جو ایک بڑے ہاسپٹل میں ہے دکھانا ہے۔ ظاہر ہے وہ شخص معالج سے اپوائنٹمنٹ لے گا۔ معقول کپڑے پہن کر بیٹے اور فیس اور دیگر اخراجات کے لیے مناسب رقم لے کر گھر سے نکلے گا اور تب جا کر کہیں معالج کو دکھلائے گا۔ ہر معقول آدمی سے اسی کی توقع کی جاتی ہے۔

لیکن اگر اسی شائستہ اور مہذب آدمی کا بیٹا گھر پر اچانک کسی سنگین حادثے کا شکار ہو جائے اور نوبت یہ آجائے کہ اگر اسے چند منٹوں کے اندر کسی مناسب ہاسپٹل تک نہ لے جایا گیا تو وہ دم توڑ دے گا۔ اب اس بیٹے کو بچانے کی فکر اور معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مہذب آدمی جس لباس میں ہے خواہ وہ تہبند اور بنیان ہی میں کیوں نہ ہو اسے لے کر جس صورت سے بھی ہو کسی قریبی ہاسپٹل تک پہنچ جائے۔ اب اگر اس صورت میں وہ شخص اپنی شائستگی اور رکھ رکھاؤ کا ویسا لحاظ رکھے گا جیسا وہ عام حالات میں کرتا ہے تو وہ غیر معقول اور جان بچانے کے تقاضے کے خلاف ہوگا۔ حالانکہ ایسی شائستگی بجائے خود قطعاً غیر معقول نہیں بلکہ ایک خوبی کہی جاتی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء میں تھی:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو سلطنت مغلیہ کے بادشاہوں ـــــ جہانگیر نے ٹھکرا دیا اور شاہجہاں اور عالمگیر نے اس کے کماحقہ تقاضے پورے نہیں کیے چنانچہ اللہ کا عذاب اترا اور برصغیر کے مسلم حکمرانوں کو معزول کر دیا گیا۔ اب برصغیر کا کوئی بادشاہ خلافت اسلامیہ

قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ممکن ہے یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہو گیا ہو کہ پوری روئے ارض کا کوئی مسلم بادشہ اب قیامت تک اس سعادت کو نہ پا سکے۔ تاریخ نے دیکھا کہ برصغیر سے صرف سلطنت مغلیہ ہی نہیں، اسلامی اقتدار کا بھی صفایا ہو گیا۔ اور غلامی مقدر بن گئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو برصغیر کے روایتی علماء نے ٹھکرا دیا۔ چنانچہ اللہ کا عذاب اترا اور برصغیر کے روایتی علماء معزول کر دیئے گئے۔ اب برصغیر کا کوئی روایتی عالم دین خلافت اسلامیہ قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ممکن ہے یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہو گیا ہو کہ پوری روئے ارض کا کوئی روایتی عالم دین اب قیامت تک اس سعادت کو نہ پا سکے گا۔ تاریخ نے دیکھا کہ برصغیر سے روایتی علماء کی قدر و منزلت ہی رخصت نہیں ہو گئی بلکہ اہل حکومت اور اہل ثروت اور ان کے مال حرام سے استفادہ ان کا مقدر بن گیا۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی پکار کو برصغیر کے "غالب مغرب نہاد" طبقے نے ۱۹۴۰ میں ٹھکرا دیا۔ چنانچہ اب اس طبقے سے اس کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اللہ کی رضا کو پورا کرتا۔ ظاہر تھا کہ اب اس غالب مغرب نہاد طبقے کا مقدر عذاب تھا۔

اور یہی وہ بات تھی جس کا ادراک حضرت مولانا مودودی کو کسی دوسرے سے زیادہ تھا جو سبب بنا تھا سیاسی کشمکش حصہ دوم کی تصنیف کا۔

چنانچہ جیسا کہ اس عاجز نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اور ان کے ساتھ مخلصانہ طور پر وابستہ اس چھوٹی سے جمعیت کی ذمہ داری تاریخی نقطے پر پہنچ چکی تھی۔ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے حوادث اور اللہ کی رضا کے ادراک کا تقاضا تھا کہ حضرت مولانا اس چھوٹی سی جمعیت کو ہی لے کر میدان میں آ جاتے اور وہ سب کر جاتے جس کا تقاضا اللہ پوری امت مسلمہ سے کر رہا تھا اور جس کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی نظر بار بار برصغیر پر پڑ رہی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اللہ کی رضا کے ادراک اور اس کی تعیین میں کیسے تذبذب کا شکار ہو گئے؟ اور یہ کہ وہ کوئی نبی تو نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر وحی بھیج کر انہیں واضح طور پر بتا دیتا کہ یہ میری مرضی ہے۔ اب اگر اللہ کی مرضی اس طرح معلوم ہونے کے بعد وہ پہلو تہی کرتے تو بلاشبہ مورد الزام ہو سکتے تھے۔ لیکن صورت موجودہ میں وہ کیونکر مورد خطاء ہو سکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن واحادیث میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بلاشبہ انبیاء وحی اور ارسال ملائکہ سے سرفراز ہوتے تھے اور بعض اوقات انہیں متعین طور پر بھی بتایا جاتا تھا کہ اللہ کی رضا کیا ہے اور یہ کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اکثر نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر انبیاء بھی آفاق وانفس پر غور کر کے اللہ کی رضا کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی اظہار رضا اور تعمیل کے درمیان توثیق ہوتی تھی اور کبھی تعمیل کے بعد۔

یہاں اس کی گنجائش تو نہیں کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ لہٰذا صرف دو مثالیں دی جاتی ہیں جن سے کئی باتیں ان شاء اللہ واضح ہو جائیں گی۔ مثلاً یہ کہ اللہ کی رضا بڑے نازک امور میں بھی کیسے ظاہر ہوتی ہے؟ وہ خفی ہوتی ہے یا جلی؟ متعین ہوتی ہے یا غیر متعین؟ بندہ یا گروہ اس کا ادراک کیسے کرتا ہے؟ یا کیونکر کرنا چاہئے؟ اس کی توثیق کیسے ہوتی ہے؟ وغیرہ۔ اس کی پہلی مثال انفرادی سطح یا سب سے پہلی اجتماعی سطح کی ہے اور دوسری اجتماعی سطح کی۔

(۱) فلما بلغ معه السعی قال یٰبنیّ انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذاتری. قال یا بت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شاء الله من الصٰبرین. فلما اسلما وتله للجبین ونادینٰه ان یٰابراهیم قد صدقت الرء یا انا كذٰلك نجزی المحسنین. ان هذا لهو البلٰؤا المبین وفدینٰه بذبح عظیم وتركنا علیه فی الآخرین سلٰم علی ابراهیم كذٰلك نجزی المحسنین انه من عبادنا المؤمنین. (الصافات: ۱۰۲-۱۱۱)

ترجمہ:

وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا، "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا، "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف وتوصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے

ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔

(۲) كما اخرجك ربك من بيتك بالحق وان فريقاً من المؤمنين لكٰرهون. يجادلونك فى الحق بعد ماتبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون. واذ يعدكم الله احدى الطائفتين انها لكم وتودون ان غير ذات الشوكة تكون لكم ويريد الله ان يحق الحق بكلمته ويقطع دابر الكٰفرين. ليحق الحق ويبطل الباطل ولو كره المجرمون اذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم انى ممدكم بالف من الملئكة مردفين. وماجعله الله الا بشرى ولتطمئن به قلوبكم وما النصر الا من عندالله ان الله عزيز حكٰيم. (الانفال : ۶۔۱۰)

ترجمہ:

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور ایک جماعت اہل ایمان کی راضی نہ تھی۔ وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کر دے سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کر دے جھوٹ کو اور اگرچہ ناراض ہوں گنہگار۔ جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے اور یہ تو دی اللہ نے خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے بے شک اللہ زور آور ہے حکمت والا۔

چنانچہ کسی وقت خاص میں اللہ کی رضا کا ادراک ضروری ہے۔ قوت، صلاحیت اور وسائل پر غور ثانوی ہیں اور جب اللہ کی رضائے خاص کا معاملہ ہو تو اس صورت میں قوت، صلاحیت اور وسائل پر غور کرنا حرام ہے بلکہ کفر ہے۔ اس لیے کہ اس میں اپنی بے بضاعتی کا تصور باقی نہیں رہتا اور اللہ کی قوت و قدرت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اللہ کی ایسی رضا پر لبیک نہ کہنا حزم و احتیاط کے دائرے میں نہیں آتا بلکہ خواہش کرنے والے اللہ کی قوت و قدرت پر عدم اعتماد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

یہ عاجز ایسا ہی سمجھتا ہے کہ اگر ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء کے مابین زمین پر اللہ کی مرضی پوری

ہو جاتی اور ایک مٹھی بھر جمعیت ایک گاؤں میں ہی سہی اس کائناتی Paradigm کے ساتھ برپا ہو جاتی تو:

(۱) نہ جاپان کو شکست ہوتی۔

(۲) نہ روئے ارض پر امریکہ سپر پاور بنتا۔

(۳) نہ اقوام متحدہ کے نام سے عبوری حکومت دجال قائم ہوتی۔

(۴) نہ ریاست اسرائیل کا قیام ہوتا۔

(۵) نہ بعد کی دنیا اس معنی میں (Bi-Polar) ہوتی۔

(۶) نہ آج نیو ورلڈ آرڈر کا قیام ہوتا۔

یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ جاپان کو عملاً شکست نہیں ہوئی۔ یہ تو محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا کہ جاپان نے مزید تباہی سے بچنے کے لیے جنگ بندی کر لی اور ہتھیار ڈال دیے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ:

(۱) پہلا ایٹم بم Little Boy جو ۵ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر B-29 کے ذریعہ فضا سے گرایا گیا ـــــ اور جس کی Height of Burst (Ft) ـــــ 1900+50 تھی اور جو 15 کیلوٹن کی طاقت کا تھا اور

(۲) دوسرا ایٹم بم Fat Man جو ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو ناگاساکی پر B-29 کے ذریعہ فضا سے گرایا گیا اور جس کی Height of Burst (Ft) ـــــ 1650+33 تھی اور جو 21 کیلوٹن کی طاقت کا تھا امریکہ کے اسلحہ خانہ کے آخری ہتھیار ہیں اور اب یہ دونوں ہی ایٹم بم گرا دیے گئے ہیں، اور اس طرح اس کے پاس تیار نوکلیائی مادے کے 55 کیلوٹن مواد میں سے 36 کیلو ٹن ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ہو چکے ہیں اور بقیہ 19 کیلوٹن مواد۔

(۳) اس کے پہلے تجرباتی ایٹم بم Trinity میں جس کا تجربہ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو نیو میکسیکو کے Alamogordo نامی جگہ میں ناور میں کر لیا گیا ہے جس کی Height of Bursit (Ft) 100 تھی ـــــ اور جو ۱۹ کیلوٹن کا تھا ـــــ ختم ہو چکا ہے اور کم از کم کسی اگلے ایٹم بم کو تیار کرنے میں اس کی واحد تجربہ گاہ LANL کو کم از کم چھ ماہ لگیں گے ـــــ[۴]

جب کہ اس وقت جاپان کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ صرف ۲۴ گھنٹوں میں پورے

امریکہ کو خاک و خون میں غلطاں کر سکتا تھا کہ نہ LANL کا نام و نشان باقی رہتا نہ آئندہ کسی ایٹم بم کے استعمال کا موقع۔

جاپان کے ارباب حل و عقد کے دل میں اتنی سی بات ڈال دینا اللہ کے لیے کیا مشکل تھا۔ لیکن زمین پر اس کی نصرت کیوں اترتی؟ اس کے لیے روئے ارض پر کون برپا تھا جس کے لیے اس کے فرشتے اترنے کی زحمت کرتے۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ نے اللہ کی رضا سمجھنے سے زیادہ اس کی عظمت اور اس کام کی مشکلات کا اور اپنے رفقاء کی حالت، برصغیر میں امت مسلمہ کے دیگر طبقات کے رویئے اور لوگوں کے طعنوں کا زیادہ لحاظ کیا اور بہت ممکن ہے انہیں اس کا احساس ہوا ہو کہ یہ نسل شاید اس ذمہ داری کو اٹھا نہ سکے گی اس لیے اسے ایک تحریک کی صورت میں اگلی نسل تک لے جانا چاہئے تاکہ شاید اس اگلی نسل میں لوگ اس قابل مل جائیں۔ بہر حال جو بھی ہو اس وقت انہیں اللہ کی رضا کے سمجھنے میں التباس ہو گیا اور انہوں نے تیاری کے عنوان سے طویل راستہ اختیار کر لیا۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بایں ہمہ یہ حادثہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ اور ان کے ساتھ برپا مخلصین کی کوتاہیوں سے زیادہ اس قوم کی کوتاہیوں پر دلالت کرتا ہے جس میں یہ تحریک برپا ہوئی تھی۔ اس مرحلے میں واقع ہونے والے تذبذب کے بعد پھر یہ تحریک کہیں سنبھل نہ سکی۔ وقت کے مدوجزر میں برصغیر کے دیگر تمام طبقات کی طرح رجعت اس کا بھی مقدر بن گئی۔ ابتداءً روئے ارض پر اپنے آفاقی تناظر میں یہ ایک صالح جماعت کی طرح برپا ہوئی تھی۔ پھر قومی ریاست کے اندر اپنے آفاقی تناظر میں کوشاں جماعت بن گئی۔ پھر تیسرے مرحلے میں قومی ریاستی تناظر میں اسلام کے لیے کوشاں جماعت بن گئی اور چوتھے مرحلے میں قومی ریاستی دائرے میں قومی ریاستی تناظر میں معروف و مروجہ اقدار کے اندر اسلامی توجیہ میں کام کرنے والی جماعت بن کر رہ گئی۔

ارتداد :

ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کو پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ برصغیر کی

امت مسلمہ نے حضرت مجدد صاحب، حضرت شاہ صاحب اور اب حضرت علامہ اقبال کی پکار کو جھٹلادیا ہے۔ پہلے ان کے 'غالب مغرب نہاد' گروہ نے اور اب 'غالب اسلام نہاد' گروہ نے۔ اور وہ اس طرح کہ اب اس قوم کی تکذیب کی سان پر خود ان کی دعوت چڑھائی جاچکی ہے۔

دقت نظر سے مطالعہ کرنے والا انسان صاف محسوس کرلے گا کہ ۱۹۴۵ء کے بعد مولانا مودودی علیہ الرحمۃ کے تمام اقدامات کی بنیادی روح Rescue Operation تھی۔

یقیناً ان سے ۱۹۴۴ء میں اپنے چھوٹے سے گروہ کو لے کر کھڑے نہ ہونے میں ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں جو کچھ انہوں نے کیا اس سے بہتر کسی بات کا سوچنا اور کرنا ممکن نہیں تھا۔

چنانچہ ان کی وہ تقریر برصغیر میں مسلمانوں کے اس تاریخی حادثے کی آئینہ دار ہے جو مولانا نے ۲۶ ،مارچ ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام پٹھان کوٹ میں کی تھی:

> "اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا، جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے، کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں، ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو جو امت مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کرلے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دو ٹوک فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اٹھنے تک دیکھتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا روش اختیار کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخر کار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ لیکن مسلمان اگر حق سے منہ موڑیں اور اپنے

مقصد وجود کی طرف صریح دعوت سن کر الٹے پاؤں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی امت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے۔ اس لیے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لیے آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے۔ رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں ناکامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ ممکن ہے ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لیے مقدر ہوں۔ لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت، دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو امت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا اکابر امت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا یا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اتر آنا اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکتے اور جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا، میرے نزدیک ایک نہایت بری علامت ہے اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے۔ خوب جان لیجئے کہ اگر اس وقت اس قوم میں سے کچھ آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو امۃ وسط اور شہداء اللہ بننے کے قابل ہوں اور وہ خدمت انجام دے سکیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر ایک صالح اور مصلح گروہ کو کمر بستہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر:

**فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔**

ترجمہ: بعید نہیں کہ اللہ کسی دوسری ایسی قوم کو لے آئے جو اللہ کو محبوب ہو اور اللہ اسے محبوب ہو، جو اہل ایمان پر نرم اور کفار پر سخت ہو جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے یہ اللہ کا فضل ہے جسے اللہ

عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور علیم ہے۔

آپ حضرات یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ آپ دراصل امۃ وسط بننے کے امیدوار ہیں۔ آپ کا مقصود یہ ہے کہ اس مقام بلند کو حاصل کریں۔ اتنے بڑے منصب کی امیدواری کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اور پھر نہ اس کی عظمت کو محسوس کرنا نہ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا، ایک عظیم الشان بے خبری ہے اور اس سے بڑھ کر بے خبری یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ ان کم سے کم صفات سے بھی ابھی تک متصف نہ ہوئے ہوں جو اس کار عظیم کے لیے ضروری ہیں اور دوسری طرف آپ تقاضا کریں کہ فوراً ہی کوئی بڑا قدم اٹھا دیا جائے۔ کیا آپ اتنا نہیں سمجھتے اور اس سے ڈرتے نہیں کہ اگر آپ نے کوئی ایسا قدم اٹھایا جس کے لیے ضروری استعداد آپ نے اپنے اندر پیدا نہیں کی ہے تو آپ منہ کی کھا کر پسپا ہوں گے۔ اور اس راہ میں پیچھے ہٹنا فرار من الزحف ہے جو خدائی شریعت میں بہت بڑا گناہ ہے؟ (روداد جماعت اسلامی: روداد اجتماع دار الاسلام: حصہ دوم صفحات: ۱۷۔۲۰)[۵]

اس طرح برصغیر کی امت مسلمہ نے پچھلی تین صدیوں کی ہر دعوت کو جھٹلا دیا۔ چنانچہ اس پورے خطے پر اللہ کا عذاب اترنا شروع ہو گیا جن کی بے شمار صورتیں تھیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں سے سب سے خطرناک عذاب تھا ازاغت قلب کا۔ اور جب یہ عذاب اجتماعی صورت لے کر نازل ہوتا ہے تو پھر قوم کی تباہی کے علاوہ کچھ بھی بر آمد نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

**واذ قال موسیٰ لقومہٖ یقوم لم تؤذوننی وقدتعلمون انی رسول الله الیکم فلما زاغوا ازاغ الله قلوبهم والله لا یهدی القوم الفسقین.**
(الصف:۵)

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس پھر جب وہ پھر گئے تو پھیر دیئے اللہ نے ان کے دل اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

چنانچہ برصغیر میں امت مسلمہ کے دلوں کا پھیر دیا جانا پہلے فرار من الزحف اور بعد میں ارتداد کی صورت میں سامنے آیا۔

چونکہ اللہ کی سنت یہ بھی رہی ہے کہ سب سے آخری مامور قوم کے احوال پر اس کے احکام مرتب ہوتے ہیں اس لیے برصغیر کی امت مسلمہ پر ۱۹۴۵ء کے بعد جو بھی احکام مرتب

ہوئے وہ تحریک اسلامی یعنی "غالب اسلام نہاد" طبقے کے احوال پر مرتب ہوئے۔اس سے پہلے برصغیر کی امت مسلمہ پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء جو احکام مرتب ہوئے تھے وہ "غالب مغرب نہاد" طبقے کے احوال پر مرتب ہوئے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے ۱۷۶۳ تا ۱۹۲۴ء کے مابین برصغیر کی امت مسلمہ پر جو احکام مرتب ہوئے تھے وہ 'روایتی علماء' کے احوال پر مرتب ہوئے تھے۔ جن میں بالاکوٹ، ثورۃ الہندیہ ۱۸۵۷ء، تباہیٔ خانوادۂ صادقپور اور ناکامیٔ ریشمی رومال تحریک کے حادثات فاجعہ ہیں۔[۶]

اپنے اپنے زمانے میں ہر مامور طبقے کے احوال پر اللہ کے احکام مرتب ہوئے اور بقیہ قوم تبعاً اس میں شمار کی گئی:

## فرار من الزحف :

فرار من الزحف سے مراد ہے دل کے ایسے داعیات پر عملی اقدام کرنا جن سے کسی کی تحریکی اور اسلامی ذمہ داریاں ثانوی حیثیت اختیار کرلیں حتی کہ وہ ذہناً ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی تحریکی محاذ سے ہٹ جائے۔

تحریک اسلامی کے اندر فرار من الزحف کا آغاز کلی سطح (Macro level) پر ۱۹۴۸ میں اور جزوی سطح (Micro Level) پر ۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہوا اور ۱۹۷۰ء آتے آتے اس نے طوفان کی صورت اختیار کرلی۔ لیکن اس کا آغاز عملاً ۱۹۴۸ء سے ہو گیا تھا۔

تحریک اسلامی میں داخل جس طبقے نے اسے سند جواز عطا کرنے میں پیش قدمی کی وہ ایک چھوٹا سا طبقہ تھا جس نے سب سے پہلے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں 'اسلامی معاشیات' نام کی بدعت ایجاد کی۔ اور اس کے سہارے پہلے مرحلے میں تحریک اسلامی کی اصل رو کو اپنی خدمات سے محروم کر کے یونیورسٹیوں اور دانشورانہ ماحول میں رہنے کا جواز ثابت کیا اور پھر اسی خدمت کے لیے بعض نے مشرق وسطیٰ اور بعض نے براہ راست یوروپ اور امریکہ کا رخ کرلیا۔ اسی دوران مشرق وسطیٰ میں پیٹرو ڈالر کی چمک نے سارے بند توڑ دیئے۔ عالم عرب میں کیا ہو رہا تھا اور خود ان پر اللہ نے کیا ذمہ داریاں ڈالی تھیں ان سے بے پرواہ ہو کر یہ لوگ مشرق وسطیٰ جانے لگے اور اس مقام کے محاذ کو چھوڑ کر جہاں فی زمانہ تحریک برپا ہوئی تھی دیگر مقامات پر بخیال خویش اسلام کی خدمت کرنے لگے۔

فرار من الزحف کی دو بنیادی روئیں اٹھیں:

(۱) پہلی رو برصغیر سے براہ راست یوروپ اور امریکہ کو جاتی تھی۔

(۲) دوسری رو برصغیر سے براہ مشرق وسطیٰ یوروپ اور امریکہ جاتی تھی۔

یوں تو پوری دنیا میں کہیں بھی بے شعوری طور پر نوکری، تجارت اور سیاحت کے لیے جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور اس میں امت کا ہر طبقہ ہمیشہ کم یا بیش رہا ہے۔ لیکن باشعور طبقے کی بڑے پیمانے پر اور سند جواز کے ساتھ محاذ سے ہٹنے کا آغاز تحریک اسلامی میں ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ تحریک کے بعض نمایاں اہل علم کا تحریکی ذمہ داریوں کو چھوڑنا اور مشرق وسطیٰ یا یوروپ اور امریکہ چلا جانا خلاف اولیٰ نہیں ٹھہرا تو پھر دوسروں نے بھی اپنی اپنی 'ضروریات' کے تحت فیصلے لینے شروع کر دیئے۔ جب ملت نے دیکھا کہ یہ بات ایسے طبقے میں شروع ہو گئی ہے، جو 'دار' کی بحثوں میں علماء سے بھی شدید تھے تو پھر بے چارے عام لوگ اور ان کے بعد علماء کرام بھی پیچھے کیوں رہتے خاص طور پر اس صورت میں کہ ان حضرات کی مشرق وسطیٰ اور یوروپ کے قیام نے ملک میں ان کی مالی اور معاشرتی حیثیت کو واضح طور پر نمایاں کرنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۶۰ء کے بعد تحریک اسلامی کے افراد کا، ۱۹۷۰ء کے بعد روایتی علماء کرام کا اور ۱۹۸۰ء کے بعد عامۃ الناس کا فوج در فوج مشرق وسطیٰ اور یوروپ وامریکہ جانا اور وہاں بسنا شروع ہو گیا۔

تحریک اسلامی کے افراد ہوں یا بعد میں علماء کرام ان میں سے ہر ایک کا جانا کسی بھی شرعی دلیل کے بغیر تھا۔ ممکن ہے ان میں سے بعض بڑی مضبوط دلیلیں پیش کریں جو بادی النظر میں معقول بھی معلوم ہوں لیکن حقیقتاً ان میں کوئی وزن نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ جانے والے بیشتر لوگوں کے پاس صرف ایک ہی دلیل تھی اور ہے کہ وہ وہاں پیسہ اور پھر اس سے دنیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن یوروپ اور امریکہ جانے والوں کا مرض تو اس سے بھی زیادہ پیچیدہ تھا۔ عام طور پر ان کی تہہ میں چار ہی جذبے کار فرما تھے۔ جو ممکن ہے نیک اور خیر کے خوشنما جزدانوں میں لپیٹ کر رکھے گئے ہوں۔ یہ چار جذبے تھے:

(۱) دنیا کمانا

(۲) ہوئی کا اتباع کرنا

(۳) میدان عمل سے فرار اختیار کرنا

(۴) مغربی تہذیب کی لطافتوں سے فیضیاب ہونا اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا 'مستقبل' سنوارنا۔

واضح ہو کہ یہاں بحث صرف تحریک اسلامی کے افراد اور پھر ان کے بعد جانے والے علماء کرام کے تعلق سے ہو رہی ہے۔ ان سے پہلے، ان کے ساتھ، اور ان کے بعد جانے والے امت مسلمہ کے عام لوگ جو خواہ از خود گئے ہوں یا ان کی تتبع میں گئے ہوں وہ اس بحث میں شامل نہیں۔

اسی طرح اس بحث میں وہ بھی شامل نہیں جو پچھلی صدیوں میں یوروپ گئے اور وہاں بس گئے یا جو یوروپی یا امریکی نژاد مسلمان ہیں اور ان کا تعلق وہیں کی نسلوں سے ہے۔

مشرق وسطی یا یوروپ جانے والے یہ افراد خواہ کتنی ہی بڑی ڈگریاں رکھتے ہوں یا اپنی جگہ شیخ التفسیر، شیخ الحدیث یا شیخ الفقہ ہوں لیکن انہوں نے کبھی بھی قرآن اور سنت سے استفتاء نہیں کیا۔ جو لوگ ہوئی کے گھوڑے پر چڑھ کر استفتاء کرتے ہیں انہیں نہ قرآن منہ لگاتا ہے نہ آنحضور ﷺ کی سنت۔ بلکہ جو بھی حکمت اس گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے پائی جاتی تھی وہ بھی چڑھتے ہی چھین لی جاتی ہے۔

اگر انہوں نے مخلصانہ طور پر جاننا چاہا ہوتا:

(۱) کہ جب نبی آخر الزماں ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے

(الف) انا ارسلنا بالحق بشیرا ونذیرا۔ (البقرہ:۱۱۹)

(ب) تبارك الذی نزل القرآن علی عبده لیکون للعالمین نذیرا۔ (الفرقان:۱)

(ج) وما ارسلناك الا مبشرا ونذیرا۔ (الفرقان:۵۶)

(د) یایها النبی انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذیرا۔ (احزاب:۴۵)

(ہ) وما ارسلنا ك الا كافة للناس بشیرا ونذیرا۔ (سبا:۲۸)

(و) وما ارسلنك إلا رحمة للعلمین۔ (الانبیاء : ۱۰۷)

(ز) إن هو الا ذكر للعالمین۔ (ص:۸۷)

(ح) وما هو إلا ذكر للعلمین۔ (القلم:۵۲)

کہا تو پھر:

(۱) مکے میں آپؐ اور آپؐ کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اصحاب اس وقت تک اہل مکہ کی اذیتیں کیوں سہتے رہے جب تک وہاں سے نکل جانے کی اجازت نہیں مل گئی؟

(۲) عرب کے کسی اور گاؤں، شہر علاقہ یا عرب سے باہر کسی اور ملک کی جانب آپ کیوں نہیں چلے گئے تاکہ وہاں تبلیغ دین فرماتے؟ کیا انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ سارے جہاں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں؟ اور یہ کہ ان کے پاس جو ذکر یعنی قرآن ہے وہ ساری روئے زمین کے ایک ایک فرد کے لیے ہے؟ کیا انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ روئے ارض کی ساری زمین اللہ کی ہے؟ اور وہ ساری روئے زمین کے لیے ہی نہیں بلکہ آخری نبی بھی ہیں؟ کیا انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اللہ کا یہ دین سارے جہان کے لوگوں کے لیے ہے اور ان پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرف دعوت دیں؟

آپ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ جب مکہ والے سننے کے بجائے اذیتیں دینے لگے تو انہوں نے فیصلہ کیا ہو کہ ٹھیک ہے مکہ والے نہیں سنتے ہیں نہ سنیں ـــــ یہ دین تو سارے جہان کے لیے بھیجا گیا ہے چلتے ہیں کسی اور شہر اور ملک آخر یہ ان کے لیے بھی تو ہے۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

(۳) جب مکے میں ظلم بڑھ گیا تو صرف کمزور اور زیادہ مضطر لوگوں کو ہی کیوں اجازت ملی۔ سبھوں کو حتی کہ آنحضور ﷺ کو بھی اجازت کیوں نہیں ملی؟

(۴) اس وقت کی (Geo-Political) صورت حال میں یہ اجازت عام کیوں نہ تھی؟ اجازت عام سے مراد یہ بات کہ جن کمزور یا زیادہ مضطر لوگوں کو اجازت دی گئی انہیں آزادانہ اجازت کیوں نہیں دی گئی کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ مشرق میں کسریٰ کی مملکت میں، شمال میں رومی سلطنت میں، جنوب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، مصر میں، چین میں، ہندوستان میں حتی کہ نجران میں۔ انہیں اجازت بھی ملی تو صرف حبشہ کے لیے۔ آخر ایسا کیوں؟

(۵) جن کمزور اور مضطر لوگوں کو اجازت ملی ان کو بھی یہ اجازت کیوں نہ ملی کہ ٹھیک ہے حبشہ جاتے ہو تو جاؤ، وہاں جا کر بس جاؤ، کوئی کام یا تجارت کرنا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا، اپنا بہترین کردار پیش کرنا، ان کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کرنا اور اس طرح تبلیغ دین کرنا، آخر وہ

بھی تو اس نبی آخر الزماں کی امت ہیں اور کیا ہی بہتر ہو کہ تم لوگ وہاں زیادہ سے زیادہ کسب کرنا تاکہ اس سے یہاں مکے کی تحریک اور افراد کی مدد ہو سکے۔ بلکہ نہایت متعین الفاظ میں انہیں ہدایت دی گئی:

**لوخرجتم إلى ارض الحبشة فان بها ملكا لا يظلم عنده احد وهي ارض صدق حتى يجعل الله لكم فرجا مما انتم فيه.**

ترجمہ: (۱) اگر تم لوگ نکل جانے پر ہی مجبور ہو تو زمین حبش کی طرف نکل جاؤ۔

(۲) (زمین حبش کی طرف نکلنے کی تمہیں اس لیے اجازت ہے) کہ وہاں کا بادشاہ جو لوگ ان کے ہاں ہیں ان کے ساتھ عدل کرتا ہے اور وہاں اس کی بادشاہت ایسی ہے کہ ظلم ہونے نہیں دیتا۔

(۳) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ارض صدق ہے۔

(۴) (اور تم لوگ وہاں اس وقت تک ٹھہرے رہو) جب تک کہ اللہ تمہارے لیے یہاں مکے (لوٹ آنے اور رہنے کی) راہ نہ بنادے تاکہ تم اس صورت حال سے نکل آؤ جو تمہیں درپیش ہے۔

آخر انہیں کیوں پابند کیا گیا کہ وہ اگر جانے پر مجبور ہوں تو صرف حبشہ جائیں۔ وہاں عارضی طور پر رہیں۔ اس وقت تک ہی رہیں کہ جب تک کہ مکے میں واپس آجانے کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ 'حتی' میں یہاں ایک اور نزاکت ہے اور اس طرح 'حتی' اپنا مفہوم بیان کرنے کے ساتھ ساتھ 'لو' کے مفہوم کو بھی متعین کرتا ہے۔ یعنی آنحضور ﷺ کی خواہش اور ترجیح تو یہی تھی کہ وہ لوگ کہیں نہ جاتے اور مکے کے مظالم کو انگیز کرتے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ مومنوں کے لیے رؤف ورحیم تھے اور آپ ان کی تکلیفوں پر بے حد رنجیدہ ہوتے تھے اس لیے بادل ناخواستہ ہی سہی آپ نے اجازت دے دی۔ اور اس لیے 'لو' فرمایا۔ دوسری بات یہ کہ حتی کا مطلب یہ نہیں کہ جب ہم مکے کے حالات کے بارے میں خبر دیں اور باضابطہ اطلاع ملے اور تمہیں اس کی تصدیق ہو جائے کہ ہاں اب مکہ لوٹ آنے میں کوئی حرج نہیں تو مکہ لوٹ آنا بلکہ صورت یہ تھی کہ تم سے یہاں کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی تو ٹھیک ہے جاؤ ہم اجازت دیتے ہیں اب جیسے ہی تم سمجھو کہ تمہیں لوٹ آنا چاہئے لوٹ آؤ۔ چونکہ یہ سبھی لوگ مخلصین تھے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے مکہ سے نکل جانے میں ایک شمہ برابر بھی کمزوری کو دخل نہیں بلکہ

فی الواقع مظالم ان کی برداشت سے باہر ہو چکے ہیں اس لیے آپ نے اجازت دی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ایک ایسی اطلاع ملی (جو اگرچہ بعد میں غلط ثابت ہو گئی) یہ مخلصین واپس چلے آئے۔ اور آکر اس سے زیادہ اذیت میں گرفتار ہوئے۔

ان تمام سوالوں کے جواب میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا اس لیے تھا کہ آنحضور ﷺ کی ذات گرامی مکہ میں تھی اس لیے ان کا مکہ لوٹ آنا ضروری تھا۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود آنحضور ﷺ ہی مکہ میں کیوں تشریف رکھتے تھے؟ وہ خود تمام مومنین کے ساتھ مکہ سے باہر حتی کہ عرب سے باہر کیوں نہیں تشریف لے گئے؟

ممکن ہے، کوئی شخص یہ کہے کہ آنحضور ﷺ اس وقت تک صرف ام القریٰ کے لیے مبعوث کے گئے تھے اور نبی العالمین بعد میں بنائے گئے۔ ہر چند کہ یہ سوال منصب رسالت سے نا آشنا شخص ہی کر سکتا ہے تو اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کا قول درست ہے تو کیا وہ اس سوال کا جواب دے سکتا ہے کہ جب وہ ام القریٰ کے لیے نبی ہو کر تشریف لائے تو انہوں نے ام القریٰ کے لوگوں پر دعوت و اقامت کی حجت پوری کر دی۔ تو جب اس کے قول کے مطابق آنحضور ﷺ پورے جہان کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے سارے جہاں والوں پر وہ حجت کب پوری کی؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ انہوں نے حجت پوری نہیں کی۔ اگر نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے کیسے سند دے دی کہ

(۱) انا اعطینك الكوثر۔

(۲) اليوم يئس الذين كفروا من دينكم فلا تخشوهم واخشون۔

(۳) اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا۔

اور اس سے پہلے فرمایا گیا:

(۱) ان فتحنا لك فتحا مبينا۔

اور اس کے بعد فرمایا گیا:

اذا جاء نصر الله والفتح ورايت الناس يدخلون فى دين الله افواجا فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کی برکات اور رحمتیں نبی کے عہد میں نازل ہونا شروع ہوں اور

نبی کی وفات کے بعد بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سالوں تک جاری رہیں لیکن نبی اپنا فرض منصبی نہ ادھورا چھوڑ کر جاتا ہے نہ کسی دوسرے کے ذمے لگا کر جاتا ہے۔ وہ پورا کر کے ہی جاتا ہے۔ اور آنحضور ﷺ بھی اپنا فرض منصبی احسن طریقے سے پورا فرما کر ہی تشریف لے گئے۔ اور اس کی اللہ نے انہیں سند بھی دی ہے۔

ظاہر ہے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی جو یہ نہیں جانتا کہ قرآن نے ارض کا کیا مفہوم لیا ہے۔ اور یہ کہ دین اللہ اور اسکی حکمت عملی کو ارض سے کیا نسبت ہے اور ارض کیا ہے؟ اور اسکے حدود اور مراتب کیا ہیں اور اس کی تزکیہ اور توسیع کسے کہتے ہیں؟

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ ٹھیک ہے یہ تو عہد نبوی کی بات ہو سکتی ہے کہ اقامت دین ہو جائے اور اسلامی مملکت ہو تو کوئی شخص کہیں بھی جا سکتا ہے اور کہیں بھی رہ سکتا ہے۔

جی ہاں اوّل تو اگر اسلامی مملکت ہو تب۔ دوم یہ کہ یہ تو درست ہے کہ اسلامی مملکت ہو تو کوئی شخص اس کے اندر کہیں بھی جا سکتا ہے اور کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ لیکن ایسا کہنے والے کو قرآن و سنت کی یہ گہرائی بھی جاننی چاہئے کہ ہر شخص جہاں چاہے نہ جا سکتا ہے اور نہ جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔ اور قرآن اور کائنات کے تعلق سے یہ فہم اللہ کا وہ خصوصی فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

چنانچہ عہد صدیقی ہو یا عہد فاروقی کئی مناظر سامنے آتے ہیں:

(۱) حکم بن ابی العاص کو آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ وہ مدینہ چھوڑ دے اور طائف چلا جائے اور وہاں رہے۔

ابن عبد البر نے الاستیعاب میں جو اسباب بیان فرمائے ہیں وہ محض قیاس ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسے واقعات بھی ہوئے ہوں۔ لیکن آنحضور ﷺ نے اسے تعزیز اً طائف نہیں بھیجا تھا۔ بات تعزیر سے زیادہ گہری تھی۔ اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ ابن عبد البر نے جو وجوہ بیان فرمائے ہیں وہ محض قیاس ہیں۔ تعزیر کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب عہد صدیقی میں یہ معاملہ دوبارا سامنے لایا گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے واپسی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس حکم کو برقرار رکھا۔ حکم نے یا اس کے کسی رشتے دار نے یہ تو کہا کہ اسے مدینہ واپس

آنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اسے بغیر سبب بتائے کیوں مدینہ سے باہر رکھا جارہا ہے یہ قانون اسلامی کے خلاف ہے اور یہ کہ اگر کوئی مقدمہ خود خلیفہ کے خلاف بھی پیش کیا جائے تو قانون اسلامی اس کا Cognizance لیتا ہے اور حضرت ابو بکر و عمر تو اس معاملے میں سب سے زیادہ فائق تھے۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام بڑے صحابہ کو مدینے میں اور وہ بھی اپنے پاس رکھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے افراد کو عمال کی حیثیت سے متعین کرتے رہے۔ بہت ناگزیر مواقع پر اور وہ بھی دین اللہ کی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہی کبھی اس ضابطے میں تبدیلی کی۔ چنانچہ غالباً واحد استثناء وہ واقعہ ہے جب آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے کوفہ بھیجا۔ چنانچہ آپ نے غیر معمولی الفاظ اس کی وجہ بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

> اے اہل کوفہ! تم جُمْجُمَةُ العرب ہو۔ اور میرا وہ تیر ہو جس کو میں اقتاد پڑنے پر ادھر ادھر پھینکتا ہوں۔ میں نے تمہارے پاس عبد اللہ بن مسعود کو بھیج کر اپنے نفس پر تم کو ترجیح دی ہے۔ (ابن سعد: الطبقات الکبریٰ، جلد ۔۶، صفحہ: ۷)

یہ اکابر صحابہ نہ ہر جگہ اپنی مرضی سے جاسکتے تھے اور نہ جاکر بس سکتے تھے۔ جو بات حیرت کی اور سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے حضرت عمر سے یہ شکایت نہیں کی کہ آپ کو دار الاسلام میں کہیں بھی جانے اور جاکر بس جانے سے روکنے کا کیا حق ہے؟ اور یہ کہ ہم نہیں مانیں گے یا یہ کہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ کم از کم اس عاجز کو کسی ایک اجل صحابی کی طرف سے ایسی کسی بات کا علم نہیں۔

(۳) اکابر قریش کو حضرت عمر نے پابند کیا تھا کہ وہ مدینے میں رہیں اور یہ کہ وہ مدینہ سے باہر بغیر اجازت سکونت پذیر نہیں ہو سکتے۔ طبری نے لکھا ہے کہ جب بعض لوگوں نے اس پابندی کے خلاف شکایت کی تو آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا: "لوگو! اسلام بھی اپنی عمر کے منازل و مدارج طے کر کے اب نشو و نما اور ترقی کی آخری منزل کو پہنچ چکا ہے یعنی بازل ہو گیا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

> "ہاں مجھے معلوم ہے کہ قریش اب یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے دوسرے بندوں کو نظر انداز کر کے اموال پر قبضہ کر لیں۔ خبردار! جب تک میں زندہ ہوں ہرگز ایسا ہونے نہیں دوں گا۔

طبری نے مزید لکھا ہے کہ حضرت عمر کو اس امر میں اتنا اصرار تھا کہ ان اکابر قریش کی بات تو جانے دیجئے اکابر مہاجرین میں سے اگر کوئی غزوہ میں شریک ہونا چاہتا تھا تو حضرت عمر اس کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (طبری، ج:۴، ص:۳۹۶۔۳۹۷)

اسی لیے اس عاجز نے کہا کہ یہ قرآن اور آفاق وانفس کی وہ معرفت ہے اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ان اکابر صحابہ نے کبھی شکایت نہیں کی کہ حضرت عمر کسی شخص کا ذاتی حق کیسے سلب کر سکتے ہیں کہ وہ دارالاسلام میں جہاں چاہے رہے اور جہاں چاہے جائے۔

نہیں یہ سب وہ عباقرہ تھے جن کو اس کا بخوبی علم تھا کہ دین اللہ کیا ہے؟ آفاق وانفس کی گہرائیاں کیا ہیں؟ قرآن کی معرفتیں کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ شخص جو روک رہا ہے یہ کون ہے؟ اور یہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کیا ہے؟ آج کے وہ لوگ جن کے بارے میں ختمی مرتبت سرور کائنات حضرت محمد ﷺ نے خبر دی تھی:

وہ قرآن پڑھیں گے لیکن ان کے حلقوم کے نیچے وہ نہیں اترے گا۔ (او کما قال)

ان کا یہ کہنا کہ مشرق وسطیٰ، یوروپ اور امریکہ جا کر اسلام، دین اللہ اور مسلمانوں کو فلاں فلاں فائدے ہوئے ہیں درست نہیں۔ ممکن ہے بظاہر یہ فائدے ہوئے ہوں۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ فائدے عنداللہ بھی فائدے ہوں۔

چنانچہ اس فرار من الزحف کے کم از کم درج ذیل نقصانات بر آمد ہوئے:

(۱) تحریک اسلامی میں صلاحیتوں کا بحران پیدا ہو گیا۔

(۲) برصغیر میں تحریکات اسلامی ویسی معاشرتی کشمکش پیدا کرنے کی حالت میں باقی نہیں رہی جیسی ہونی چاہئے تھی اور اسکی کوششیں ٹھٹھر کر رہ گئیں۔

(۳) جو لوگ یوروپ یا امریکہ گئے تو انہوں نے اس کا Craze پیدا کر دیا کہ صلاحیتیں پیدا ہو کر تحریک کو ملنے کے بجائے یوروپ اور امریکہ منتقل ہو جائیں اور کسی معترض کو ساکت کرنے کے لیے خدمت اسلام، بہترین جواب قرار پایا۔

(۴) اس Craze نے ایسے نوجوانوں کو جو معاشرے میں خالصتاً Careerist طبیعت کے مالک تھے تحریک اسلامی کی طرف مائل کر دیا اس لیے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ

یوروپ اور امریکہ۔ بآسانی جانے کے زینوں میں سے ایک زینہ اب تحریکات اسلامی بھی ہے اور دیگر زینوں کے مقابلے میں ہم خرما وہم ثواب کے مصداق بھی۔ لہٰذا اس نے تحریکوں کو سڑے ہوئے افراد سے بھر دیا ہے۔ جو اپنا مفاد پورا ہوتے ہی اس طرح تحریک کے لیے اجنبی ہو گئے گویا کبھی اس سے دید شنید ہی نہ ہو۔ ان Careerists کی موجودگی نے تحریک میں دیگر مفاسد پیدا کئے سو الگ۔

(۵) بطور خاص پیٹروڈالر نے تحریک اسلامی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ چنانچہ ۱۹۷۵ آتے آتے درج ذیل امور میں تحریکات اسلامی شدید بحران کا شکار ہو گئی۔

(۱) نصب العین تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔

(۲) قیادت کی صفات تحلیل ہونا شروع ہو گئیں۔

(۳) کلمۂ جامعہ تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔

(۴) تحریکات مرئی نصب العین سے غیر مرئی نصب العین کی طرف جانے لگیں۔

(۵) باطلانہ معاشرے سے کشمکش اور تصادم کے بجائے مفاہمت اور بقائے باہم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

(۶) تحریکات کی ترجیحات بدل گئیں۔

(۷) منہج اور طریقہ کار میں سنت سے کھلا انحراف کیا جانے لگا۔

(۸) حتی کہ قرآن و سنت کے الفاظ ان کی معنویت اور تعبیرات میں تبدیلی کی جانے لگی۔

(۹) چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ تحریکات اسلامی کے بعض افراد اور بعض حلقوں کے ذریعہ ایک ایسا اسلام پیش کیا جانے لگا جو اسلامی اور مسلم معاشرے کا ملغوبہ تھا اور وہ بھی اس مسلم معاشرے کا جو مغربی معاشرے کا کاشتہ وہ پرداختہ تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ العروۃ الوثقیٰ کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو سیدھے تباہی کی طرف جاتا ہے۔ مگر اسی کوئی اضافی شئے نہیں کہ کوئی کہے کہ میں زید سے کم گمراہ ہوں اس لیے کہ مثلاً زید اور میں ایک رسّی کو تھامے ہوئے دو پہاڑوں کے بیچ کی گہری وادی کو پار کر رہے تھے چنانچہ زید نے رسّی چھوڑ دی اور وہ رسّی سے دو سو فٹ دور وادی کی طرف گر رہا ہے اور میں نے بھی رسّی چھوڑ دی لیکن میں زید سے بہتر ہوں اس لیے کہ میں رسّی سے صرف دس

فٹ دور ہی گیا ہوں۔

چنانچہ جن داعیات وضرورات نے تحریک اسلامی کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں معاشروں اور نظاموں کے ساتھ مفاہمت کر لے وہ اس پر قانع کیسے رہ سکتی تھیں۔ اس کی اگلی منزل مشرق وسطیٰ اور یوروپ اور امریکہ کے معاشرے، نظام اور تہذیبیں تھیں۔ چنانچہ جلد ہی یعنی ۱۹۷۵ء سے واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ اب ان کی داعیات وضرورات کا مرکز اسلام اور تحریکات اسلام کو مغرب اور اہل مغرب کی پسند کے مطابق تراش خراش کر قابل قبول بنانا تھا۔ یہ سب کچھ اسلام اور دین اللہ کی خاطر نہیں ہو رہا تھا بلکہ صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ مغرب کی فضاؤں کی طرف جانے اور وہاں اس طرح رہنے کے لیے جواز فراہم ہو سکے کہ یہ ایک داعیانہ اقدام ہے اور عین مقاصد شریعت کے مطابق ہے بلکہ اولیٰ ہے۔ جب کہ پوری تاریخ انسانی اس کی گواہ ہے کہ کوئی مرعوب قوم نہ کبھی داعی ہوئی ہے نہ دعوت اس کا کام ہے۔ اور نہ کبھی تاریخ میں فکری طور پر غالب کسی قوم نے کسی مرعوب قوم کی دعوت قبول کی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ۱۹۴۵ کے بعد پورے برصغیر پر اللہ کے جو احکامات صادر ہوئے اور جو اثرات مرتب ہوئے وہ سب تحریک اسلامی کے احوال پر ہوئے۔ اس لیے کہ بقیہ طبقات تو پہلے ہی عند اللہ معزول ہو چکے تھے۔

چنانچہ برصغیر میں تحریک اسلامی کے اس فرار من الزحف کا پہلا شعوری اثر روایتی علماء نے قبول کیا اور ۱۹۹۰ء کے بعد وہ بھی جوق در جوق یوروپ اور امریکہ جانا شروع ہو گئے۔ وہاں کی چمک نے انہیں بھی مسحور کر دیا۔ وہ پہلے ہی کس کام کے رہ گئے تھے کہ اب اسلام کے لیے دنیا پر اور وہ بھی مغرب کی دنیا پر لات مار دیتے۔ چنانچہ برصغیر کو انہوں نے خیر باد کہنا شروع کر دیا اور انہیں جو ہنر آتا تھا وہ اس میں یوروپ وامریکہ جا کر مشغول ہو گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے مناظرے ہونے لگے اور مسجدوں میں تالے ڈالے جانے لگے۔ چونکہ یہ سب بداعمالیاں نہیں تھیں کہ اس کے لیے تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کو مطعون کیا جائے۔

دقت نظر سے دیکھا جائے تو بداعمالیوں کی دو قسمیں تاریخ انسانی میں پائی جاتی رہی ہیں۔ پہلی قسم مجرد بداعمالی ہوتی ہے اور دوسری درحقیقت ان بداعمالیوں پر آئے ہوئے عذاب کی ایک شکل ہوتی ہے۔

چنانچہ سورہ اعراف نے ان دونوں کو یکجا بیان کر کے خوب واضح کر دیا ہے۔ قرآن کا ارشاد

ہے:

**فلما عتوا عن مانهوا عنه قلنا لهم كونوا قردة خاسئين.**

(الاعراف:۱۶۶)

ترجمہ: پھر جب بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے حکم کیا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل۔

چنانچہ پہلا عمل از قسم بداعمالی ہے اور بعد میں قردۃ خاسئین ہو کر کیے گئے اعمال عذاب کا نتیجہ۔ اس لیے اہل نظر جانتے ہیں کہ ۱۹۷۵ء کے بعد یوروپ اور امریکہ میں تحریکات اسلامی اور علماء جو کچھ کرنے لگے تھے وہ بداعمالی نہیں بلکہ ان پر آئے ہوئے عذاب کا نتیجہ تھا۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ وہاں موجود تمام لوگ اور تمام کام برے نہیں بلکہ مخلصانہ بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست بھی ہو لیکن میں فقہی احکام اور فقہی مقاصد شریعت کی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دینی، قرآنی، نبوی اور اسلامی مقاصد شریعت کی بحث کر رہا ہوں۔ چنانچہ قرآن اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اس پر گواہ ہے کہ جب انبیاء بنی اسرائیل نے لوگوں کو دعوت دی تو ان کے اسی دینی، قرآنی، نبوی اور اسلامی مقاصد شریعت کے جواب میں علماء بنی اسرائیل اور صدوقیوں نے فقہی احکام اور فقہی مقاصد شریعت کے دلائل پیش کیے تھے۔ جن کا ظاہر ہے عند اللہ کوئی وزن نہیں پایا گیا اور ان علماء بنی اسرائیل کے دلائل کو اللہ اور اس کے رسولوں نے ان کے منہ پر مار دیا۔

چنانچہ ۱۹۸۰ء کے بعد اس فرار من الزحف نے مکمل ارتداد کی شکل لے لی۔ اور اس کا ظہور سب سے پہلے تحریکات اسلامی کے اس طائفے میں ہوا جو اسلامی معاشیات کی بدعت پہلے ہی ایجاد کر چکا تھا۔ تاریخ اسلامی کے ان چودہ سو سالوں میں چار عظیم ارتداد وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ان ارتدادات میں چوتھا ارتداد معاشی ہے جو اس صدی کی آٹھویں دہائی میں پوری طرح راسخ ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ امت محمدیہ میں پیدا ہونے والا آخری اور سب سے بڑا ارتداد ہے جو اس کی اکثریت کو دجال کے قید خانے میں جھونک کر ہی دم لے گا۔ عربوں کی بے حد و حساب دولت کی آمدنی، آخرت، اپنے فرض منصبی اور اپنی موجودہ ذلت و خواری سے بے پرواہو کر عیش کوشی کی ہوس اور یوروپی اور امریکی بینکوں کے اربوں کے سود نے اس ارتداد میں مہمیز کا کام کیا۔ اسلامی معاشیات سے شغل فرمانے والے طبقے نے اس ارتداد کو برپا کیا اور بطور خاص عربوں کو ہم خرما

وہم ثواب کا سبق دیا۔ اور انہوں نے بھی اپنے بے قابو ہوس کے لیے اس نسخۂ حلالہ کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ اور پھر اس طرح پوری تاریخ اسلامی میں پہلی بار ابلیس نے ہر گھر ہر مسجد ہر مدرسہ کو سود کے فضلے سے بھر دیا۔ سود کا اس عمومی طریقے سے امت کے رگ وپے میں جانے کی دیر تھی کہ دعائیں بے اثر ہو گئیں، عبادات بے جان ہو گئیں، طبیعت میں بے حیائی آگئی اور دلوں پر شیطان کا قبضہ ہو گیا۔ حق سے تنفر بڑھ گیا۔ فحش از خود گوارا لگنے لگا۔

جب دلوں کو اللہ کے حوالے کیا گیا تھا تو اسلامی معاشرے میں مسجدوں کے استنجا خانے بھی مال حرام سے، بکراہیت ہی بنائے جاتے تھے اور ساری زندگی مال حرام کھانے والے بھی پیری میں کسی نیک کام میں حصہ لینے کے لیے حلال آمدنی کسب کر کے یا حلال دولت سے خدمت کیا کرتے تھے۔ اور اب جب دلوں پر ابلیس کا قبضہ ہو گیا تو مسلم معاشروں میں گھروں کے ذاتی استنجا خانے تو حلال اور محنت کی کمائی سے بنائے جاتے ہیں اور مال حرام مسجدوں اور مدرسوں کو بخش دیا جاتا ہے تاکہ اللہ کا گھر بقعۂ نور ہو جائے اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ عرب اپنی کمائی یا تو مغربی بینکوں کے حوالے کرتے ہیں یا مونتے کارلو لے جاتے ہیں تاکہ زمینی آقا خوش رہیں اور سود کی کمائی اللہ کے گھر اور اللہ کی راہ میں دیتے ہیں تاکہ آسمانی آقا بھی ناراض نہ ہو۔

چونکہ تحریک اسلامی کے ماہرین معاشیات زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے تھے وہ ان امور کی علمی تنقیح اور توضیح تھی۔ لیکن ان کی تنقیح اور توضیح کو مذہبی اتھارٹی حاصل نہیں تھی۔ ٹھیک یہی وقت تھا جب علماء نے پایا کہ وہ تو اب بھی بڑے کام کے ہیں۔ ان کے پاس حرام کو حلال کرنے کی خراد مشین موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی عالم عرب اور عالم مغرب کو اپنی امیدواری پیش کر دی۔ ابلیس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سارے عالم اسلام میں علمی اور فقہی اکیڈمیوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ دوسری طرف مغرب میں ایسے بینک قائم کیے جانے لگے جن کی سودی عمارت میں ایک کمرہ غیر سودی مال کا بھی تھا۔ اور اس کے لیے سارے برصغیر سے بالخصوص ایسے علماء اور ماہرین اسلامی معاشیات بھرتی کیے جانے لگے جو اسے چلا سکیں۔ تیسری طرف بڑے منافعوں کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ سارے مسلم معاشروں میں سودی کاروبار کو غیر سودی کاروبار کے نام پر پھیلایا جانے لگا۔ چوتھی طرف ان تمام کوششوں سے پورے عالم اسلام کو مغربی سودی مالی نظام کا زیادہ سے زیادہ حصہ بنانے کی مہم شروع کی گئی۔

## متعدی ارتداد:

یہ وہی گھڑی تھی (۱۹۹۱ء) جب ایک طرف مغرب اور اس کے آقا یہودی اس نتیجے تک پہنچ چکے تھے کہ اب یہ اسلام جو رسول اللہ سے امت کو ملا ہے اور جو قرآن اور سنت میں پایا جاتا ہے اور ہم (یعنی یہودی اور مغرب) ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے اور یہ کہ ہماری بقا کے لیے اسلام کو مرنا ہوگا ـــــ وہی گھڑی مشرق وسطیٰ، یوروپ اور امریکہ جانے والے تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کے لیے بھی فیصلہ کن تھی ـــــ وہ پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ ٹینی سن (Tennyson) کے لوٹس ایٹر (Lotus Eater) کی طرح وہ بھی اب اس مغربی جنت سے جانا بھی چاہیں تو نہیں جا سکتے اور اگر یہاں رہنا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے اسلام کے ساتھ رہنا مشکل ہے لہٰذا یہاں رہنے کے لیے اسلام کو چھوڑنا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اسلام کا چھوڑنا ابھی اس نسل کے لیے جو مشرق سے مغرب گئی تھی ممکن نہیں تھا لہٰذا بات یہی ٹھہری کہ ٹھیک ہے اسلام کو ہی بدل دیا جائے۔ اور اسکی ایک ایسی تعبیر کی جائے کہ وہ اسلام بھی کہلائے اور مغرب کو قابل قبول بھی ہو۔ لیکن مغرب کو ان مسلمانوں کی خواہش سے کیا مطلب۔ وہ بھی جانتے تھے، کہ یہ لوگ صرف مغرب سے فیضیاب ہونے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ ان کا تو فائدہ جب تھا کہ یہ سارے عالم اسلام کو مغرب کا Backyard اور کارخانہ بنانے میں مددگار ہوتے۔ جو اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک عالم اسلام میں بسنے والی، اسلام اور دین اللہ سے مجنونانہ طور پر چمٹی رہنے والی، رسول اللہ کی ذات کو اپنی جان سے زیادہ چاہنے والی قوم کو رام نہیں کیا جاتا اور اسے مغربی سانچے میں نہ ڈھال دیا جاتا جن کو مغربی استعمار اپنی زنجیروں سے ڈیڑھ سو سال تک اور ان کے بعد ان کے عمیل بادشاہ، آمر اور حکام، ملوکیت، آمریت، جمہوریت اور سیکولرزم کی تلواروں سے اب تک رام نہ کر سکے تھے نہ انہیں ان سانچوں میں ڈھال سکے تھے۔

چنانچہ انہوں نے مغرب میں رہنے والے ان تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء سے کہا کہ اگر مغرب میں رہنا ہے اور یہاں کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونا ہے تو عالم اسلام کی ان تاریک وگندی بستیوں میں رہنے والی "پاگل" قوم کو مسلمانِ مغرب بنانا ہوگا۔ جس طرح اسمیک کا عادی

اسمیک فراہم کرنے والے کی ہر شرط قبول کر لیتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور ہمہ جہت کارروائی شروع ہو گئی۔

صرف سو سال قبل مغرب کے ایک مبلغ نے دعویٰ کیا تھا:

"East is East and West is West, the twain Shall never meet."

آج وہی مغرب عالم اسلام کو سمجھا رہا ہے کہ نہیں دونوں مل سکتے ہیں۔

چنانچہ یہودیوں کے ایک 'تھو' نے مغرب میں جا بسنے والے ان تحریکات اسلامی کے افراد اور علماء کو پاگل بنا دیا۔ مغرب میں بس جانے والا برصغیر کا ہر تحریکی اور ہر عالم دین اس ایک تھو سے چشم زدن میں مفکر اور ہادی بن گیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ صرف مغرب آتے ہی اس قابل ہو گئے ہیں کہ برصغیر میں جو لوگ دینی کوششیں کر رہے ہیں خواہ تحریکی ہوں یا علمی ان کو اب وہی رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں پر ان کی تاریخی کوتاہیوں کے سبب آئے ہوئے عذاب نے ان کا یہ حال بنا دیا کہ صرف قرآن ہی اسے بیان کر سکتا ہے:

وضربت عليهم الذلة والمسكنة وباء وا بغضب من الله۔

(البقرہ:۶۱)

ترجمہ: اور ڈالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر۔

چنانچہ حال یہ ہو گیا کہ مغرب کی سیر کا ایک ٹکٹ برصغیر کے بڑے سے بڑے قومی، ملی اور دینی زعیم کو خواہ وہ شیخ الحدیث ہوں یا یا شیخ التفسیر، شیخ شریعت ہوں یا شیخ طریقت پاگل بنا دینے کے لیے کافی بن گیا۔

چنانچہ جہاں ایک طرف عالم مغرب میں رہنے والے مفکرین برصغیر کے مسلمانوں کو علم و دانش سکھانے کے لیے فکری دورے کرنے لگے وہیں دوسری طرف برصغیر کے زعما مسترشدین تربیت کے لیے یوروپ اور امریکہ بلائے جانے لگے تاکہ وہاں سے فیضیاب ہو کر زیادہ اچھی طرح برصغیر میں خدمت دین کر سکیں۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

(۱) چنانچہ سوال پیدا ہوا: کیا یہی وہ وقت ہے جس کی خبر آنحضور ﷺ نے اس طرح

دی تھی کہ:

"قال اخبرنی أبوذر قال کنت امشی مع رسول الله ﷺ فقال لغیر الدجال أخوفنی علی امتی قالها ثلاثاً قلت یا رسول الله ما هذا الذی غیر الدجال اخوفك علی امتك قال آئمة المضلین۔

(رواہ ابوذر الغفاری، مسند احمد جلد:۵، صفحہ:۱۴۴)

ترجمہ: روایت کی حضرت ابوذر غفاری نے: فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جارہا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی امت کے اوپر میں دجال کے علاوہ ایک اور چیز سے ڈرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ میں نے پوچھا یارسول اللہ! دجال کے علاوہ وہ کون سی چیز ہے جس کے تعلق سے اپنی امت کے بارے میں آپ ڈرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

گمراہ کرنے والے قائدین ــــــ ے

کیا یہی وہ وقت ہے کہ امت مسلمہ پر ائمۃ المضلین کا غلبہ ہو گیا ہے؟

عبار اتنا شتیٰ وحسنك (؟) واحد

كل إلى ذاك الجمال (؟) يشير

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

یہ ہیں وہ اسباب جو اس کے متقاضی ہوئے کہ ایک تجزیہ فوری طور پر امت کے سامنے لایا جائے تاکہ امت اپنی صورت حال کا جائزہ لے سکے اور اپنی ترجیحات مقرر کر سکے۔

○○

## باب دوم

# ستارہ وصلیب

قیامت سے قبل وقوع پذیر ہونے والے ان واقعات میں جو بات عجیب لگتی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاملے کے تینوں فریق ـــ یہودی ـــ عیسائی اور مسلمان ـــ ایک ہی مسئلے کو اپنا محور قرار دیتے ہیں یعنی ـــ (۱) آمد مسیح (۲) ظہور دجال اور (۳) حکومتِ عدل کا قیام۔ ان تینوں کے دعوے بظاہر یکساں لگتے ہیں لیکن کیا وہ فی الواقع یکساں ہیں؟ ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے۔ اس باب میں ان تینوں امور کے تعلق سے نصرانیت اور یہودیت کے نظریات اور عقائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر چونکہ کتاب کا اصل موضوع ہے اس لیے اس کا تذکرہ بعد میں اور کسی قدر تفصیلی ہوگا۔ یہودیت اور نصرانیت کے مباحث مختصر ہوں گے۔ (اس تعلق سے علمی اور تفصیلی بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں ہوگی) یہاں صرف بقدر ضرورت بحث کی جائے گی۔

اس مسئلے کے تعلق سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے تین بنیادی عقائد ہیں۔ مسئلے کو یکسانیت دینے کے لیے میں نے انہیں تین الگ الگ نام دیئے ہیں تاکہ ان ہی تین عنوانات کے تحت یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے عقائد زیر بحث لائے جائیں۔ یہ تین عقاید ہیں:

(۱) حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد

(۲) دجال کا ظہور

(۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ دجال کا خاتمہ اور روئے ارض پر نظام عدل کا قیام۔

مذکورہ ان تین عنوانات کی تین الگ الگ شکلیں اور پہلو یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان تین گروہوں کے ذیل میں ان کے الگ الگ پہلو اور شکلیں زیر بحث آئیں گی۔

# حصہ اوّل : یہودیت

جہاں تک یہودیت کی بات ہے تو ان تینوں مسئلوں پر ان کے عقائد، ان کے صحائف میں درج تفصیلات اور ان پر ان کا ردعمل بے حد پیچیدگی کے حامل ہیں۔ لہٰذا ہم ان شاءاللہ مختصر لیکن الگ الگ ان پر بحث کریں گے۔

**(۱) حضرت مسیح کی آمد:** یہ مسئلہ یہودی تاریخ میں تین الگ الگ ادوار میں تین الگ الگ معنوں میں لیا گیا ہے۔ یہ تین ادوار ہیں:

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام سے حضرت یرمیاہ علیہ السلام تک

(۲) حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام تک

(۳) حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے اب تک

**پہلا مرحلہ:** اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسیح کے بھیجے جانے کا معاملہ دراصل اس وقت شروع ہوتا ہے جب پہلی بار بنو اسرائیل اجتماعی طور پر اللہ کے انکار اور ابلیس سے کلی تحالف کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے انبیاء کی نافرمانی کا آغاز کیا۔ ظاہر ہے یہ وہ مرحلہ تھا جب ہر چند کہ بنو اسرائیل نے بحیثیت قوم اللہ کی علانیہ بغاوت کر دی تھی لیکن ان میں کچھ لوگ حق پر قائم اور حق کے لیے کوشاں تھے۔ ان میں اللہ کے وہ انبیاء بھی تھے جو اس وقت موجود تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تنبیہاً عذاب اور مصائب سے گزارنا شروع کیا۔ یہ واقعہ اغلباً ۹۳۱ قبل مسیح کا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں بشارت بھی دی کہ اگر انہوں نے گناہوں سے اپنے کو الگ کر لیا، توبہ و استغفار کی روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا، ان کی مصیبتوں کے خاتمے کے لیے ان کی مدد کرے گا اور ان کی بحالی کے لیے ایسے انبیاء بھیجے گا جو مسیح ہوں گے جن کا اتباع کر کے وہ مصیبتوں سے نکل جائیں گے۔ چنانچہ یہ دور کسی ایک مسیح کی آمد کے تصور کا نہیں بلکہ ایک سے زائد مسیح کے آنے کے تصور کا ہے۔ چنانچہ یہی ہے وہ تصور مسیح جو اس عہد کے صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں ہر چند کہ قوم گناہ عظیم میں آلودہ ہو چکی تھی لیکن ان سے خیر کی امید ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اس کی مدت ۵۸۶ قبل مسیح تک ہے جب اس تعلق سے حضرت یرمیاہ نے انہیں آخری بار سمجھایا۔

**دوسرا مرحلہ:** دوسرا مرحلہ اور دوسرے تصور مسیح کا آغاز حضرت یرمیاہ کے بعد اور بیت المقدس کی تباہی کے نتیجے میں ہوا۔ اہل حق کم ہوتے گئے، پوری بنی اسرائیلی قوم پورے تمرد کے ساتھ اللہ کی بغاوت پر کمربستہ ہوگئی اور ظاہر ہے غایت بے شرمی کے ساتھ انبیاء کو قتل کرنے لگی۔ توریت اور زبور کو کلیتاً محرف کردیا گیا اور تمام مشرکانہ اور فاسدانہ خیالات کو دین کا حصہ بنالیا گیا۔ گویا وہ تمام فاسدانہ خیالات جو گزشتہ ۴۰۰ سالوں سے ابھرتے رہے تھے لیکن جو حقیقی دین کے متوازی تھے اب ان کی سرکاری اور دینی حیثیت ہوگئی۔ حقیقی اور انبیائی دین فاسد، باطل اور غیر قانونی قرار پایا اور جعلی اور ابلیسی دین خالص، حق اور قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ دور ہے جب مسیح کے حقیقی تصور کی کتابیں جعلی قرار پائیں مثلاً اسدراس کی کتابیں (Books of Esdras)، انوخ (Enoch)، بارہ انبیاء کے وصایا Testament of Twelve Patriarchs وغیرہ۔ چنانچہ اب اس رائج جعلی دین نے اس تصور مسیح کو اختیار کرلیا جس کی درج ذیل بنیادیں تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ یہودیوں کی مصیبتوں کے خاتمے اور ان کی سربلندی کے لیے مسیح بھیجے گا۔

(۲) یہ مسیح ان کے موجودہ دین کی توثیق کرے گا۔

(۳) جو اس موجودہ (فاسد، باطلانہ اور مشرکانہ) دین کی توثیق نہ کرے اور حقیقی دین کی طرف بلائے وہ جھوٹا مسیح (دجال) ہے اور قابل گردن زدنی ہے۔

چنانچہ یہ تصور مسیح دراصل دجالوں کی پاسداری کرنے اور انبیاء کے انکار کرنے اور ان کو قتل کرنے کا باعث ہوا۔ یہ تصور اس وقت پورے بنو اسرائیل میں ہیجانی کیفیت برپا کرنے کا سبب ہوا اور جس کے نتیجے میں بنو اسرائیل اہل حق کے خلاف بے انتہا بے شرمی اور شقاوت قلبی پر اتر آئے جب انہیں انبیاء و صلحاء کے ذریعہ یہ تنبیہ کی گئی:

> دیکھو! میں تمہارے مابین ایلیاہ نبی کو بھیجوں گا جو خدا کے سخت اور خوفناک دن سے قبل آئے گا۔ وہ آبا کے دل کو اولاد کی جانب اور اولاد کے دل کو آبا کی جانب موڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور زمین پر قہر توڑ دوں۔" (ملاکی ۳:۲۳)
>
> (یہودی صحائف کے شمار کے مطابق رنصاریٰ کے مطابق ہے ملاکی ۴:۴-۶)

چنانچہ اس عہد میں دو تصور مسیح پائے جاتے رہے: (۱) پہلا سرکاری یہودیت کا تصور

مسیح۔ یعنی اصلی مسیح جھوٹا اور یہودیت کا دشمن ہے اور اس کا خاتمہ یہودیت کی آبیاری ہوگا اور (۲) غیر سرکاری اہل حق اور اس وقت آنے والے انبیاء کا تصور مسیح ـــ جس میں اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر دی گئی تھی اور جس کی تکذیب پر سخت وعید کی دھمکی دی گئی تھی۔

**تیسرا مرحلہ:** تیسرا تصور مسیح وہ ہے جس کا آغاز حضرت عیسیٰ کی آمد، یہودی علماء وربانیین کے ذریعہ ان کی تکذیب اور پھر اپنے علم کی حد تک ان کو صلیب دیئے جانے کے بعد ہوتا ہے جو اب تک جاری ہے۔ جب عام اور سرکاری یہودیت نے توحید اور رسالت ـــ اور ظاہر ہے ان کے نتیجے میں ـــ آخرت سے اپنا ہر رشتہ منقطع کر لیا تب کہیں جا کر روئے زمین پر وہ ہولناک حادثہ رونما ہوا جسے ان کے علم کی حد تک حضرت عیسیٰ ابن مریم المسیح علیہ السلام کو صلیب دیا جانا کہا جاتا ہے۔ یہ تکذیب اور صلیب دیا جانا صرف عیسیٰ ابن مریم کا نہیں تھا بلکہ عیسیٰ المسیح اور عیسیٰ روح القدس کی تکذیب اور ان کو صلیب دیا جانا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اب یہودیوں کا رشتہ اپنے تمام انبیاء اور ان کی کتابوں سے آخری بار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ کے یہاں، ملائکہ کے یہاں، آسمانوں اور زمین میں ان کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے البقرہ ۹۸ میں بیان کیا ہے۔ وہ اب پورے کے پورے صرف اور صرف ابلیس کے لیے ہو گئے ہیں اور ابلیس ان کے لیے ہے۔ یہ مرحلہ سابقہ انبیاء کی بشارتوں اور صحیفوں میں درج آمد مسیح کے تصور اور انتظار سے کلی مایوسی کا مرحلہ ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب نہ ان کے لیے کوئی مسیح آئے گا نہ کوئی مسیح بھیجا جائے گا اور جو آئے گا وہ ان کے لیے قہر بن کر آئے گا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو انہوں نے مسیح بن کر آنے والے تمام انبیاء کا قتل کیا یہاں تک کہ اس مسیح کی بھی تکذیب کی اور اسے اپنے علم کی حد تک صلیب دے چکے جو مسیح بن کر آیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا بھی انکار کر دیا جسے یوحنا کی انجیل میں "وہ نبی" کہا گیا ہے۔ یوحنا میں آیا ہے:

> "یوحنا کی گواہی یہ ہے، کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو اس (یوحنا یعنی حضرت یحییٰ) سے یہ پوچھنے کے لیے بھیجا کہ تو کون ہے؟ تو اس نے یہ مان لیا، اور انکار نہیں کیا لیکن مان لیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا تو پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ تو کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں۔ تو اپنے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں جیسا یشعیاہ

نبی نے کہا ہے "جنگل میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں تاکہ تم خدا کی راہ کو درست کرو۔" یہ فریسیوں کے جانب سے بھیجے گئے تھے۔" (یوحنا ۱:۱۹۔۲۴)

لہٰذا اب کائنات میں ان کے لیے کوئی راہ نہیں رہ گئی تھی چنانچہ ان کا موجودہ تصور مسیح درج ذیل نکات پر قائم ہے:

(۱) وہ عیسیٰ ابن مریم جو مسیح بن کر آیا تھا اور جسے انہوں نے صلیب دے دیا تھا اور اب جس کے بارے میں عیسائی اور اہل اسلام کہتے ہیں کہ وہ دوبارا آئے گا وہ ان یہودیوں کا دشمن ہوگا اس لیے وہ مسیح نہیں دجال ہے۔

(۲) اب چونکہ عرش سے زمین تک یہودیوں کے لیے کوئی معین ومددگار نہیں اس لیے اب ان تمام بشارتوں کے حصول کے لیے واحد امید وہ دجال ہے جسے ابلیس نے تیار کر رکھا ہے۔ جو مسیح بن کر آئے گا لہٰذا وہ سب سے بڑا دجال ہی ان کا مسیح ہے۔

(۳) چونکہ اب اللہ کے فرشتے ان کی مدد نہیں کریں گے اس لیے انہیں ابلیس اور اس کے دجالوں کی مدد سے اور بطور خاص اس دجال اکبر کی مدد سے انہیں خود وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

(۴) لہٰذا اب ان کے قدیم صحیفوں میں مذکور بلائیل، ستاناس، دائبولوس، پٹیوما اَ ایریون ہی ان کے لیے مسیح ہے۔ اسی کی حکومت مسیح کی حکومت ہے۔ اسی کی حکومت کا دن خدا کا دن ہے۔ وہی اسرائیل کی نجات کا دن ہے۔ اسی روز ہیکل کی تعمیر ہوگی اور صیہون آباد ہوگا۔

چنانچہ یہی وہ بنیادی تصور ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب دیئے جانے (30AD) سے شروع ہوتا ہے اور جسے ربی یوحانان بن ذکائی نے (68AD) میں باضابطہ شکل دے دی۔ ٹائٹس نے (70AD) میں یروشلم کو تباہ اور ہزاروں یہودیوں کو تہہ تیغ اور ہزاروں کو ہمیشہ کے لیے دربدر کر دیا۔ لیکن وہ تصور مسیح جو (68AD) میں منضبط ہو گیا اب پوری یہودیت کا تصور مسیح تھا۔ اس تصور مسیح میں ــــ اللہ اور اللہ کے ملائکہ سے مایوسی، ساری دنیا سے غصہ اور نفرت اور اپنی طاقت اور ابلیس اور اسکے دجالوں کی مدد سے کھوئی ہوئی چیزوں اور آئندہ کی بشارتوں کو حاصل کرنے کی کوشش ــــ اہم اجزاء ہیں۔ چنانچہ یہی وہ تصور ہے جسے چند ہی سالوں میں یہودیت اور اس کے احبار وروحانیین نے پروان چڑھایا ــــ اور اس کے مطابق اقدامات کرنا شروع

کر دیئے۔

یہودیوں کے مطابق سب سے پہلے چار یہودی روحانیین نے اپنی روحانی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اور ابلیس اور دیگر شیاطین کی مدد لے کر اور اللہ کے فرشتوں کو دھوکا دے کر یا انہیں زیر کر کے روحانی طور پر فردوس (جنت) میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ ان چاروں میں سے ان کے مطابق پہلا ربی عقبہ Rabbi Akiva (50-135AD) اس میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا۔ بن زوما (Ben Zoma 2nd Century AD) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے اسے ناکام بنادیا) اور مارا گیا۔ تیسرا ابن عزائی (Ben Azzai) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے ناکام بنادیا) اور پاگل ہو گیا۔ چوتھا ایلیشا بن ابویہ (Elisha Ben Abuyah) ناکام ہوا (یا فرشتوں نے ناکام بنادیا) اور وہ مرتد ہو گیا۔[1]

۳۰ کے بعد ربی یوحانان بن ذکائی کے ذریعہ منضبط کیا گیا یہ وہ تصور مسیح ہے جو اس دن سے دو راستوں سے، آگے بڑھ رہا ہے تاکہ اس روئے زمین پر وہ دنیا قائم کر دے جو خدا کا مسیح آکر کرتا جو اب یہودیوں کے لیے نہیں آئے گا۔ یہ دو راستے ہیں:

(۱) غیر، دہ یا ماوراء مادہ پر یہودی روحانیت کا استعمال کر کے اور ابلیس اور اسکے شیاطین کی مدد لے کر ویسی دنیا بنانا جیسی مسیح ان کے لیے بناتا۔

(۲) مادہ پر یہودی روحانیات کا استعمال کر کے اور ابلیس اور اس کے شیاطین کی مدد لے کر ویسی دنیا بنانا جیسی مسیح ان کے لیے بناتا۔

چنانچہ یہ پوری مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر، مغربی سائنس کی ترقی اور اسکی ترجیحات، صیہون کی واپسی کے لیے ساری دنیا پر عسکری اور معاشی عمل داری قائم کرنا، صیہون کا قیام، جنگ عظیم اوّل، خلافت کا خاتمہ، لیگ آف نیشنز کا قیام، دوسری جنگ عظیم کا انعقاد، اقوام متحدہ کا قیام، اسرائیل کا قیام اور اب مسجد اقصیٰ کو ڈھانے، ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی کوشش اور عظیم ریاست اسرائیل کا قیام اسی دجالی مسیح کے کاموں کو انجام دینے اور اس کی سلطنت کو قائم کرنے یا بالفاظ دیگر یہودیوں سے واپس لے لی گئی بشارتوں کو اللہ اس کے فرشتوں اور مومنین کے برخلاف زبردستی حاصل کر لینا ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے قیام اسرائیل کے بعد مقرر کیے جانے والے پہلے ربی اعظم اور اپنے وقت کے سب سے بڑے یہودی عالم، روحانی اور مفکر ربی ابراہام اساق کک (Rabbi

(Abraham Isaac Kook نے بیان کرتے ہوئے لکھا:

"To regard Eretz Yisrael as merely a tool for establishing our national unity or even for sustaining our religion in the Diaspora by preserving its proper character and its faith, piety and observances --- is a sterile notion; it is unworthy of the holiness of Eretz Yisrael. A valid strengthening of Judaism in the Diaspora can come only from a deepened attachment to Eretz Yisrael. The hope for the return to the Holy Land is the continuing source of the distinctive nature of Judaism. The hope for the Redemption is the force that sustain Judaism in the Diaspora; the Judaism of Eretz Yisrael is the very Redemption."[۲]

ترجمہ:

ارض اسرائیل کے تصور کو محض اپنی قومی وحدت کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھنا حتی کہ انتشار کی حالت میں مذہب کی مخصوص صورت اور ایمان، تقویٰ اور اس پر عمل کو محفوظ رکھ کر مذہب کو باقی رکھنے کا ذریعہ سمجھنا ایک بانجھ خیال ہے۔ یہ خیالات اس قابل نہیں کہ انہیں ارض اسرائیل کے تقدس سے نسبت دی جائے۔ انتشار میں یہودیت کی قابل لحاظ تقویت اسی میں مضمر ہے کہ ارض اسرائیل کے تصور سے گہری وابستگی ہو۔ ارض مقدس کو واپس ہونے کی امید یہودیت کی وہ بلا انفصال ماخذ و منبع ہے جس سے اس کی انفرادیت برقرار ہے۔ نجات کی امید وہ طاقت ہے جو یہودیت کو انتظار میں بانٹ رکھتی ہے۔ ارض اسرائیل کی یہودیت ہی دراصل حقیقی نجات ہے۔

چنانچہ ساری دنیا کے یہودی اب جس مسیح کی آمد کا انتظار اور جس کے لیے راہیں ہموار کر رہے ہیں وہ دراصل دجال اکبر یعنی المسیح الدجال ہے۔ اور وہ جس مسیح سے خائف اور جس کا مقابلہ کرنے اور جسے ختم کر دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں وہ دراصل حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہیں۔

(۲) دجال کا ظہور: یہودیت میں دجال کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ دجال کے تعلق سے یہودیت کے تصورات مسیح کے تعلق سے تصورات کے بالکل علی الرغم ہیں یعنی متناسب

۔ (Proportional)

یہودیت کے موجودہ صحیفوں میں صرف دانیال ہی وہ کتاب ہے جس میں دو ایسے تذکرے ملتے ہیں جن سے دجال اکبر کی کسی قدر نشاندہی ہوتی ہے۔ چنانچہ دانیال باب ۲ آیت ۴۰ میں لکھا ہے۔

"اور چوتھی مملکت لوہے کی طرح مضبوط ہوگی۔ لوہے سے تو ساری چیزیں چور چور ہو جاتی اور پس جاتی ہیں۔ لہٰذا جس طرح لوہے سے وہ سب کچلی جاتی ہیں اسی طرح اس چوتھی مملکت سے سب کچھ چور چور ہو کر پس جائے گا۔"

اس سورۃ کے باب ۷ آیت ۷ میں ہے:

پھر اس کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چوتھا جانور ہے جو خوفناک اور ڈراؤنا اور بہت طاقتور ہے۔ اور اس کے بڑے بڑے لوہے کے دانت ہیں۔ وہ سب کچھ کھا ڈالتا ہے اور چور چور کر دیتا ہے اور جو باقی رہتا ہے اسے پیروں سے روند ڈالتا ہے۔ اور وہ تمام پہلے جانوروں سے مختلف ہے۔ اور اس کے دس سینگ ہیں۔ میں ان سینگوں کو دھیان سے دیکھ رہا تھا تو کیا دیکھا کہ اس کے درمیان ایک اور چھوٹا سا سینگ نکلا اور اس کی طاقت سے ان پہلے کی سینگوں میں سے تین اکھاڑے گئے۔ پھر میں نے دیکھا سینگ میں انسانوں کی جیسی آنکھیں اور بڑا بول بولنے والا منہ بھی ہے۔ میں نے دیکھتے دیکھتے آخر میں کیا دیکھا کہ تخت رکھے گئے اور کوئی نہایت قدیم متمکن ہوا۔ اس کا لباس برف کی طرح سفید اور سر کے بال نرم اون کی طرح تھے۔ اس کا تخت آتشیں اور اس کے پہیے دھکتی ہوئی آگ جیسے لگتے تھے۔ اس قدیم کے منہ سے آگ کی موج نکل کر بہہ رہی تھی۔ پھر ہزاروں ہزار لوگ اس کی خدمت کر رہے تھے اور لاکھوں لوگ اس کے سامنے حاضر تھے۔ پھر عدل کرنے والے بیٹھ گئے اور دفاتر کھولے گئے۔ اس وقت اس سینگ کا بڑا بول سن کر میں دیکھتا رہا اور دیکھتے دیکھتے آخر میں دیکھا کہ وہ جانور مار ڈالا گیا۔ اور اس کا جسم دھکتی ہوئی آگ میں راکھ ہو گیا۔"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو اور بنو اسرائیل کے انبیاء نے بنی اسرائیل کو دجال اور بطور خاص دجال اکبر سے ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ لیکن جب یہودیوں نے علانیہ طور پر ابلیس سے تحالف کر لیا اور خدا، رسول اور آخرت کے علانیہ باغی ہو گئے تو انہوں نے اس پوری خبر کو چھپا لیا یا ضائع کر دیا۔ چنانچہ اب اس تعلق سے دو قسم کی معلومات دستیاب ہیں۔

(۱) پہلی قسم کی معلومات وہ ہیں جو دانیال میں درج ہیں۔ اور چونکہ ـــــ وہ یہودیوں کے مطابق۔ تنک (TaNaK) کے تیسرے حصے کتوبیم کا حصہ ہے اس لیے اس کی حیثیت ویسے بھی ان جیسی نہیں جو حیثیت نبیئیم اور اس سے زیادہ تورہ کی ہے۔ یعنی ایسا لگتا ہے کہ دجال کے تعلق سے ہر معلومات جو تورہ یا نبیئیم میں تھی اسے ختم کر دیا گیا۔ اور دانیال میں شاید اس لیے درج ہے یا درج رہنے دیا گیا کہ یہاں اسکی صورت ایک نبی یا صالح کے رویاء کی ہے۔ لیکن اس پر بھی بس نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تاویل کی گئی اور اسے فارس کی ایک ظالم مملکت اور ظالم بادشاہ سے جوڑ دیا گیا۔

(۲) دوسری قسم کی معلومات وہ ہیں جو ان کتابوں میں موجود ہیں جنہیں یہودی پیشین گوئی ادب (Jewish Apocalyptic Literature) کہا جاتا ہے اور جس میں بیشتر وہ مواد ہیں جو یہودیوں میں ممنوع اور ناجائز (Apocrypha) قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً:

(1) Testament of the Twelve Patriarchs

ظاہر ہے یہ کتابیں چونکہ ممنوع اور ناجائز ہیں اس لیے ان کے عقائد میں ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

یہودیوں کے مطابق تمام جائز لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے کئی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

پہلی بات یہ کہ ان کی موجودہ کتابیں اور ذخیرۂ علوم مسیح کے ذکر سے ـــ جسے وہ کبھی مسیح (Messiah) کبھی (Son of God) اور کبھی (Son of Man) کہتے ہیں ـــ سے بھرے ہوئے ہیں اور ہر ہر قدم پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں اور ان کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ جہاں مسیح کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا جاتا ہے وہیں دجال کا ذکر بالکل غائب کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی سرسری طور پر پورے یہودی دینی ادب کو یہاں سے وہاں تک پڑھ جائے تو کسی دجال کے ذکر سے یکسر نابلد رہے گا۔ لیکن تحقیق اور یہودی علوم کی پرتیں اکھاڑنے کے بعد محقق اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہاں دجال کا ذکر بڑی چابک دستی سے چھپایا جا رہا ہے بطور خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد۔

اس اخفاء کے تین راستے ہیں:

(۱) بعض تذکروں کی تاویل کی جاتی ہے کہ وہ سابق میں ان بادشاہوں سے متعلق ہیں

جنہوں نے یہودیوں کو ستایا یا اذیتیں دیں۔

(۲) بعض تذکروں کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ ان قوتوں سے متعلق ہیں جو یہودیوں کو ستائیں گی یا ان کی دشمن ہوں گی۔

(۳) بعض تذکروں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ باتیں اصلاً دین موسیٰ کی نہیں بلکہ دیگر قوموں سے قربت کی وجہ سے دین موسیٰ کی کتابوں میں در آئی ہیں۔اس تعلق سے بطور خاص زردشتیوں کا نام لیا جاتا ہے۔

لیکن ان تمام کوششوں کا ماحصل دراصل دجال کے تذکرے کو بے اصل قرار دینا ہے۔ دجال کا تذکرہ ان ساری کوششوں کے باوجود اس طرح آجاتا ہے کہ وہاں مسیح کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ مسیح کا ذکر ہو اور دجال کا ذکر نہ ہو جب بھی دجال محذوفاً موجود ہوتا ہے۔اسی طرح دجال کا ذکر کیا جائے اور مسیح سے اخفاء جب بھی مسیح محذوفاً موجود ہوتا ہے۔لہٰذا دجال کے اخفا کے باوجود دجال محذوفاً ہی سہی موجود رہتا ہے۔

لیکن دجال کے تذکرے کو جو چیز سب سے زیادہ چھپانے والی ہے وہ ایک عجیب و غریب بات ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے مسیح کے سارے تذکرے کو بحال رکھا ہے اور اسے بیان کرتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد دجال اکبر ہوتی ہے۔(اس پر کچھ مزید بحث ان شاءاللہ بعد میں ہوگی)اور جب وہ اصلی مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل اسے دجال اکبر میں مشخص کرتے ہیں۔اس تعلق سے دو الفاظ نہایت اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) ھعلمۃ (ha almah) اور (۲) بلیعل (Belial)۔

پہلے کا تعلق حضرت مسیح اور ان کی پیدائش سے ہے اور دوسرے کا دجال سے۔ (ان پر تفصیلی بحث ان شاءاللہ احادیث کے ذیل میں ہوگی۔

## (۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ دجال کا خاتمہ اور روئے ارض پر نظام عدل کا قیام۔

یہ مسئلہ سابقہ دو مسئلوں سے کم الجھا ہوا اور پیچیدہ نہیں۔اس تعلق سے نظام عدل کی جسے 'ھایوم' کہا جاتا ہے کم از کم ۹ الگ اور ایک دوسرے سے بالکل جدا تاویلات پائی جاتی ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک کی ذیلی قسمیں اور تاویلات ہیں۔جسے یہودی حسب منشا استعمال کرتے ہیں۔لیکن

ہم یہاں ان میں سے صرف ایک تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے تاکہ یہ صورت حال زیادہ واضح ہو سکے۔ بلکہ اس بحث کو زیادہ محدود کرنے کے لیے ہم اسے صرف "ھایوم ھا مسیح" یعنی "مسیح کا دن" تک محدود رکھتے ہیں۔

چنانچہ "مسیح کا دن" ہی دراصل وہ اصطلاح ہے جس میں حضرت مسیح کی آمد اور نظام عدل کا قیام متصور ہے۔

سبعین (Septuaginta) تو خیر کیا — بلکہ خمسین (Pentateuch) تک کی موجودہ محرف حالت — سے ہر چند کہ اس بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ دجال اکبر اور حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور دجال کے خاتمے کے تعلق سے حضرت اسحٰق کے بعد بنو اسرائیل کے انبیاء نے کیا خبریں دی تھیں اس لیے کہ حضرت یرمیاہ سے قبل اور حضرت عزیر کے بعد ہی بنو اسرائیل نے ایک سے زائد بار تمام صحائف آسمانی اور انبیاء کی احادیث اور علماء کے آثار کو محرف کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ خمسین (Pentateuch) کلیتاً قوم حدیٰ کے بجائے ایک نسلی قوم کا تصور پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں جو تصور مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل پایا جاتا ہے وہ بنی اسرائیل کی اسیری اور اس سے نجات کے تصور میں مضمر ہے۔ (یہاں اس بات سے مراد یہ نہیں کہ اس وقت بنو اسرائیل میں یہ تصور پایا جاتا تھا بلکہ اس سے یہ بات مراد ہے کہ اس وقت موجود خمسین میں موجود اس وقت مسیح کے بارے میں تصور یہ پایا جاتا ہے جو یقیناً محرف ہے۔) چنانچہ اس جلوت (Galuth) یعنی اسیری کے بارے میں تورات کے باب پیدائش کے باب ۱۵ کی آیت ۱۳ یہ کہتی ہے کہ: "ابراہیم کی نسل میں مصیبت کے دن ۴۰۰ ہیں۔" اس طرح منصفین باب:۱۱ (Judges 11[26]) آیت ۲۶ میں ہے کہ خروج اور افتاح کے درمیان مدت ۳۰۰ سال ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح پہلے بادشاہ باب ۶ آیت ۱ میں درج ہے:

"خروج اور ہیکل کی تعمیر کی درمیانی مدت ۴۸۰ سال ہے"

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ "مسیح کا دن" کے تعلق سے یہودیوں کے تصورات اور عقائد کو تین بڑے حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلا تصور: اس تصور میں 'مسیح کا دن' کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی بنو اسرائیل اپنی شامت اعمال سے اور اللہ تعالیٰ سے علانیہ بغاوت کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کیے گئے انہوں

نے سابق سے چلے آنے والے تصور کو اس طرح نئی شکل دی جس سے یہ بات ابھر گئی کہ یہ مصیبت کے دن چند روزہ ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی آزادی کے لیے ایک مسیح ارسال کرے گا جو انہیں اس ابتلا سے نجات دلادے گا اور ان کے دن پھر جائیں گے۔ یعنی آمد مسیح کا یہ وہ تصور ہے جو مستقبل بعید کے تصور یا دنیا کے ختم ہونے کے تصور سے مربوط نہیں تھا۔ بلکہ مستقبل قریب میں مصیبتوں سے نجات پانے اور خوشحالی کے بحال ہونے کے تصور سے مربوط تھا۔ اول بابلی اسیری سے قبل کے، انبیاء کے جو تذکرے سبعین (Septuaginta) میں ملتے ہیں ان سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ ہر چند کہ یہودی علماء کا اس بات پر اصرار ہے کہ بخت نصر کی بابل اسیری کے بعد پہلی بار اس تصور مسیح کے واضح ثبوت ملنے لگے جو مستقبل بعید اور آخری نجات کا تصور ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں یہ بات درست نہیں حضرت عزیر سے لے کر حضرت یرمیاہ تک تو یہ بات قطعاً درست نہیں ہے۔ اور اگر اس تعلق سے دلیل کے بطور حضرت یسعیاہ کا حوالہ دیا جاتا ہے تو وہ درست نہیں ہے۔ ان شاء اللہ حضرت یسعیاہ کی عبارت پر اسی باب میں بعد میں بحث ہوگی۔ اس طرح میری رائے ـــــ جس کا اظہار میں کر چکا ہوں ـــــ کہ یہودیت کی دو متوازی صورت حال کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جب یہودیت کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ انحراف دین موسوی ہے جو حضرت یرمیاہ کے وقت سے ہی باضابطہ سرکاری حیثیت اختیار کر گیا تھا اور جس کے بعد ہی تمام انبیاء بنی اسرائیل، ان پر کی جانے والی وحی اور ان کے اقوال یہودیوں کے ذریعہ غیر قانونی (Outlaw) قرار پائے اور جن کی پاداش میں یکے بعد دیگرے انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب سبعین (Septuaginta) کی تدوین کو آخری شکل دے دی گئی اور اس کے بعد آنے والے انبیاء بنو اسرائیل میں غیر قانونی اور ان پر اتری وحی اور ان کے اقوال گمراہی قرار دے دیئے گئے۔ سبعین (Septuaginta) یعنی یہودیت کی موجودہ اصطلاح میں تنک (TaNaK) دبری هیمیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ترتیب وقت اور انبیاء کا لحاظ کیا جائے تو سب سے آخری اندراج ملاکی ہے جو عبیئم کی آخری سورت ہے اور ملاکی کا زمانہ ۴۴۴ قبل مسیح کا ہے۔ اس طرح حضرت نحمیاہ اور ملاکی کا ایک ہی زمانہ ہے۔ گویا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۴۰۰ قبل مسیح کے بعد ہر نبی بنی اسرائیل کے ذریعہ غیر قانونی گمراہ اور قابل گردن زدنی مان لیا گیا اور پورے ۴۰۰ سالوں تک یہودیوں نے اپنے انبیاء کا بے دریغ خون بہایا۔[۳]

فی الواقع اس تصور کا زمانہ حضرت عزیر تک نہیں بلکہ حضرت یرمیاہ تک دراز ہے۔

**(۲) دوسرا تصور:** "مسیح کا دن" کا دوسرا تصور بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں تین اقوال مل کر ایک عجیب ملغوبہ بناتے ہیں۔ ان تین اقوال اور ان کی باضابطہ گمراہ یہودی تاویل کی صورت درج ذیل ہیں:

(۱) یہودیوں کی بغاوت اپنے عروج کی طرف جا رہی تھی اور ان میں اہل حق اور بالخصوص انبیاء انہیں ایک طرف گناہوں پر سخت سے سخت تنبیہ کر رہے تھے۔ اور بڑی بڑی مصیبتوں کی وعیدیں دے رہے تھے دوسری جانب رجوع کرنے والوں کو بڑی بڑی بشارتیں دے رہے تھے اور تیسری طرف دجال اکبر کے آنے اور حضرت مسیح کے آنے کی خبر دے رہے تھے۔

(۲) ان انبیاء کے برخلاف اب باضابطہ گمراہ اور باغی یہودیت بغاوت پر مصر اور حق سے شدت کے ساتھ گریزاں تھی۔ وہ آنے والے دجال کی خواہش مند تھی اور مسیح کو اپنا دشمن تصور کر رہی تھی اور انبیاء نے مسیح کی آمد سے جن بشارتوں کو جوڑا تھا اسے دجال اکبر سے اور دجال اکبر پر جن ابتلاء و آزمائش کو جوڑا تھا ان کو مسیح پر منطبق کرنے لگی تھی۔

لہٰذا اس Dovetailing کا نتیجہ درج ذیل برآمد ہوا:

(۱) گمراہ اور خدا کا باغی یہودی معاشرہ جس میں احبار و ربانیین سبھی شامل تھے مسیح کے منتظر رہے اور دجال اکبر سے خائف۔

(۲) ان کا مسیح منتظر دجال رہا اور اس طرح ہر نبی کا وہ قتل کرتے رہے تاکہ کہیں ان میں سے کوئی وہ دجال اکبر نہ ہو یعنی خدا کا حقیقی مسیح۔

(۳) اپنے مزعومہ مسیح یعنی دجال اکبر کے تعلق سے امیدوار رہے کہ وہ آئے گا اور انہیں تمام ابتلاء سے نجات دلائے گا اور ان پر جنت نما خوشحالی کے دن لے آئے گا۔

یہاں یہ بات برمحل لگتی ہے کہ حضرت یسعیاہ کی بشارتوں کا ذکر کر دیا جائے۔

ہر چند کہ اس کا نصف حصہ متصل تیسرے تصور میں آئے گا۔ حضرت یسعیاہ نے فرمایا:

"آموس کے بیٹے یشعیاہ کا قول جو اس نے یہودا اور یروشلم کے بارے میں مشہد میں پایا:

آخر کے دنوں میں ایسا ہوگا کہ یہوا کی عمارت کا پہاڑ.....

.....نہ لوگ مستقبل میں جنگ کا فن سیکھیں گے۔"

(ملاحظہ فرمائیں اس کتاب کا صفحہ:۷۵)

اس اقتباس میں صرف ایک ہی عبارت ہے جس کی تاویل کی جاتی ہے اور جسے قیامت سے قبل حضرت مسیح سے، جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ عبارت ہے: "آخر کے دنوں میں۔"

حالانکہ غور کیا جائے تو یہ دراصل اس آخر کے دنوں کا تصور ہے جو اس سلسلۂ ابتلاء سے متعلق تھا۔ یعنی جب یہودیت دو مملکتوں میں بٹ چکی تھی اور دونوں ہی گمراہی کی راہ پر بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے اور دونوں جگہ اللہ کے انبیاء انہیں اس روش سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس بات کے خواہاں تھے کہ دنیوی مفادات کی یہ تقسیم ختم ہو جائے اور بنو اسرائیل اپنے فرض منصبی کو سمجھیں اور اللہ سے رجوع کر کے اپنے کاموں کی طرف لوٹ جائیں۔ ۴۱۳ قبل مسیح آتے آتے یہودیوں کے سنبھلنے کی ہر صورت بظاہر ختم ہو چکی تھی۔ ان کی اکثریت ابلیس کی گرویدہ اور خدا کی دشمن ہو چکی تھی۔ ان کے صلحاء یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور ان کی بشارتوں کے منتظر تھے اور دجال اکبر سے خائف اور اس سے گریزاں۔ اور یہی وہ تذکرہ ہے جو یہودی پیشین گوئیوں Jewish Apocalyptic Literature میں پایا جاتا ہے جسے ربیانی یہودیت (Rabbinical Judaism) جعلی اور گمراہی قرار دیتی ہے۔ لیکن میری اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ ان Apocrypha میں درج ہر بات درست اور صحیح ہے۔

**(۳) تیسرا تصور:** جیسا کہ تصور مسیح کے ذکر میں واضح کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد کے بعد اور ان کے ساتھ یہودیوں کے بدبختانہ رد عمل کے بعد اب یہودیوں کو خدا سے، اس کی بشارتوں سے اور حضرت مسیح سے کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔ انہیں نہ یہ امید رہی کہ حضرت مسیح اب ان کے لیے آئیں گے۔ نہ یہ امید رہی کہ اللہ کے فرشتے ان کی مدد کریں گے۔ نہ یہ امید رہی کہ اب کبھی ان کے لیے خدا کی رحمتوں سے "مسیح کا دن" آئے گا۔ لہٰذا اب انہوں نے اس پورے تصور کو تین نئی شکلوں میں منجمد کیا جو درج ذیل ہے:

(۱) اب 'مسیح کے دن' کو دراصل 'دجال اکبر کے دن' سے منسلک کر دیا جائے۔

(۲) چونکہ اب کسی ربانی مدد کا کوئی سوال ہی نہیں اور نہ اس کا کہ ان کا مزعومہ مسیح آ کر ان کے لیے سلطنت قائم کرے گا اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرے گا اس لیے انہیں اسکی آمد سے قبل

خود اپنی طاقت اور جدوجہد سے اسی صورت کی جس کا ذکر اصلی مسیح کے ذیل میں آیا ہے اپنی سلطنت قائم کرنی اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنی چاہیے۔

(۳) اس کام کے لیے اپنی صلاحیتوں اور اللہ کی دشمن قوتوں ـــــ ابلیس، شیاطین انس و جن اور اس دجال اکبر سے مدد لینی چاہیے۔ یہی تصور اور اس پر عمل در آمد درج ذیل صورتوں میں ظاہر ہوا۔

(۱) ۴۴ قبل مسیح میں تھیوداس (Theudas)

(۲) وہ مصری یہودی جو فیلکس (Felix) کے عہد میں ہوا۔

(۳) برکوخبہ (132-135 AD) Bar Kochba

(۴) سباتائی زیوی (1666 AD) Sabbatai Zevi

(۵) تھیوڈور ہرٹزل (1860-1904) Theodore Hertzl

(۶) ربی ابراہام اساق کک (1865-1935) Rabbi Abraham Issac Kook

(۷) ربی یوسف سونن فلڈ Rabbi Joseph Sonnenfeld

(۸) ربی یہودالیب میمون (فش مین) Rabbi Judah Leib Maimon(Fishman)

(۹) راوزیوی یہودا کک (1979) Rav Zvi Yehuda Kook

(۱۰) راوا سرائیل ابوحضرہ (پیدائش 1890) Rav Israel Abu-Hatzera

(۱۱) مناخم شنیرسون (پیدائش 1902) (Menachem Schneerson)

(۱۲) ربی شلومو گورین (اسرائیل کے 1970 سے ربی اعظم) Rabbi Shlomo Goren

یہ وہ چند اشخاص ہیں جو عملی مادی اور روحانی قوتوں سے یہودیوں کو آزاد کرانے، عظیم ریاست اسرائیل قائم کرنے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ فکری تشکیل کو دو صورت دی گئی جن کی بنیادیں یہودیت کے قدیم محرف صحائف میں تلاش کی گئیں۔ یہ دو شکلیں درج ذیل ہیں:

## (۱) پہلی فکری تشکیل:

(۱) صورت اوّل: اس تشکیل میں اس حاصل کردہ آزادی، قیام اسرائیل اور دجالی تہذیب کو یسعیاہ نبی کے قول سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اور اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ ایک عالمی دجالی حکومت کا قیام دراصل اسی بشارت کی تعمیل ہے۔

(۲) صورت ثانی: قائم ہونے والی اس دجالی حکومت کے اندرونی خدوخال پر ان علامات کو منڈھ دیا گیا جو اب تک یہودیت میں غیر قانونی قرار دیئے گئے تھے۔ لیکن اب انہیں علامات اور بیانات کو سامنے رکھ کر اور موجودہ سبعین (Septuaginta) کے الگ الگ ٹکڑوں کو باہم مربوط کر کے وہی حقیقت دوسرے قالب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وہ ترتیب ہے جس کا ذکر UNO کے ذیل میں صفحہ: ۱۴ میں آیا ہے۔[۴]

(۳) قدیم صحائف میں جو کچھ دجال سے متعلق درج ہے اور اس عہد میں اللہ کی جانب سے علامات قیامت ظاہر ہونے کی جو خبر دی گئی ہے اسے اس عہد میں مسیح سے جوڑ دیا گیا ہے جو ان یہودیوں کی نظر میں دجال اکبر ہے۔

## حصہ دوم: عیسائیت

جہاں تک عیسائیت کی بات ہے تو اس تعلق سے ان کے نظریات سادہ اور سہل ہیں۔ کم از کم جہاں تک آرتھوڈکس اور کیتھولک عیسائیوں کی بات ہے۔ جو کچھ پیچیدگی وہاں پائی جاتی ہے وہ یا تو کیتھولک عیسائیت کی فلسفیانہ تعبیرات کے سبب ہیں یا پھر صرف اور صرف پروٹسٹنٹوں کی یہودیائی ہوئی عیسائیت (Judaised Christianity) کے سبب۔

## عیسائیت

(۱) مسیح کی آمد: جب رومن کیتھولک عیسائیت میں 'مسیح کی آمد' کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد صرف حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی دوبارہ آمد ہوتی ہے۔ جسے عام طور پر حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد (Second Coming of Jesus) یا آمد و موجودگی (Parousia) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ درج ذیل صحیفوں سے استدلال کرتے ہیں۔

(۱) متی 24:36 جس میں کہا گیا:

"اس دن اور اس گھڑی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ـــــ نہ فرشتے نہ بیٹا

—— بلکہ صرف باپ۔"

(۲) متی 24:44 جس میں کہا گیا:

"اس لیے تم بھی تیار رہو کیونکہ جس گھڑی کے بارے میں تم سوچتے بھی نہیں ہو اسی گھڑی 'انسان کا بیٹا' آجائے گا۔"

(۳) متی 25:31 جس میں کیا گیا:

جب "انسان کا بیٹا" اپنی شان میں آئے گا اور سارے فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے تو وہ اپنی شان کے تخت پر جلوہ افروز ہوگا۔"

(۴) 1 تھسلونیکیوں 5:2 جس میں کہا گیا:

"کیونکہ تم آپ ٹھیک جانتے ہو کہ جیسے رات کو چور آتا ہے ویسے ہی خدا کا دن آنے والا ہے۔"

(۵) 2 تھسلونیکیوں 2:2 جس میں کہا گیا:

"کہ کسی روح یا کلام یا خط کے ذریعہ جو کہ گویا ہماری جانب سے ہو، یہ سمجھ کر کہ خدا کا دن آپہنچا ہے۔ تمہارا دل اچانک ساکن نہ ہو جائے اور نہ تم گھبرا جاؤ۔"

جیسا کہ ان عبارات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بنیادی طور پر "خدا کے دن" یا "خدا کے فیصلے کے دن" سے متعلق ہے۔ جسے "Day of the Lord" کہا جاتا ہے۔

یہاں عیسائی عقائد —— یعنی Parousia اور دوبارہ آمد مسیح Second Coming of Jesus میں —— دو تعبیرات کے مدغم ہو جانے کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) پہلی تعبیر یہ ہے کہ بالآخر وہ دن قائم ہوگا جو قیامت کے بعد آنے والا ہے جب حساب کیا جائے گا —— یہ گویا یوم الحساب اور یوم الدین ہے۔

(۲) دوسری تعبیر یہ ہے کہ بالآخر وہ دن قائم ہوگا جب قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ دوبارہ تشریف لائیں گے، دجال کو قتل کر دیں گے اور اس کے بعد زمین پر نظام عدل قائم ہوگا۔

مذکورہ تمام عبارتوں سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہاں 'خدا کا دن' سے کیا مراد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عیسائی عقائد میں بات —— حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد اور قتل دجال اور نظام عدل کے قیام سے زیادہ یوم الحساب کے تصور Parousia کی شکل اختیار کر گئی۔

جہاں تک حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد سے متعلق کسی عبارت کا تعلق ہے تو وہ گویا صرف

ایک جگہ واضح طور پر ملتی ہے۔ یعنی پیشین گوئی۔ وہاں 19:11-21 میں عبارت اس طرح ہے:

"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے، اور اس پر ایک سوار ہے، جو "امین" اور "صادق" کہلاتا ہے اور وہ دین کے ساتھ عدل اور جہاد کرتا ہے، اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں، اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں، اور اس کا ایک نام لکھا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اور وہ خون آلودہ لباس پہنے ہوئے ہے اور اس کا نام "کلمۃ اللہ" ہے۔ اور آسمان کی فوج سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور خالص طمل پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہے۔ اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے اور وہ لوہے کا عصا شاہی لیے ہوئے ان پر حکومت کرتا ہے، اور وہ خدائے قادر مطلق کی ہیبت ناکی اور غصے کی شراب نچوڑنے والے اوزار کی طرح رونڈ ڈالتا ہے، اور اس کے لباس اور اس کی جانگھ پر یہ نام لکھا ہے:

شاہوں کا شاہ

مالکوں کا مالک

پھر میں نے ایک فرشتے کو سورج پر کھڑے دیکھا اور اس نے اونچی آواز میں آسمان میں اڑنے والے تمام پرندوں کو پکارا: آجاؤ: عظیم خدا کے کھانے کے لیے جمع ہو جاؤ! تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت، سرداروں کا گوشت، طاقتور لوگوں کا گوشت، اور گھوڑوں کا، اور ان کے سواروں کا گوشت اور کیا آزاد کیا غلام، کیا چھوٹے کیا بڑے سب لوگوں کا گوشت کھاؤ۔

پھر میں نے اس جانور اور زمین کے بادشاہوں اور ان کی فوجوں کو اس شہسوار اور اس کی فوج سے لڑنے کے لیے اکٹھے دیکھا۔ اور وہ "جانور" اور اس کے ساتھ وہ "کذاب نبی" پکڑا گیا۔ جس نے اس کے سامنے ایسی نشانیاں دکھائی تھیں جن کے ذریعہ اس نے ان کو فریب دیا، جنہوں نے اس جانور کی نشانی کو حاصل کیا تھا اور جو اسکے بت کی پرستش کرتے تھے۔ یہ دونوں زندہ اس آگ کی جھیل میں جو گندھک سے جلتی ہے ڈالے گئے۔ اور بقیہ لوگ اس شہسوار کی تلوار سے جو اس کے منہ سے نکلتی تھی مار ڈالے گئے اور سب پرندے اس کے گوشت سے سیر ہو گئے۔"

اپنی اندرونی پیچیدگیوں کے باوجود یہ وہ اقتباس ہے جسے کسی قدر "حضرت مسیح کی دوبارہ آمد" کے تعلق سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ (اس اقتباس میں تصنیف (Redaction) کا ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اس کی اور بھی تعبیریں ہو سکتی ہیں اور جن سے ہم انشاءاللہ حصہ احادیث میں

بحث کریں گے۔ یہاں ہم اس تعبیر کو من و عن قبول کرتے ہیں جو عیسائیت قبول کرتی ہے اور جس کے مطابق یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کی پیشین گوئی ہے۔ اور ظاہر ہے یہ عبارت قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ کی آمد کی طرف واضح رجحان رکھتی ہے اور اس طرح یہ Parousia سے زیادہ Second Coming کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب اس اقتباس کے ساتھ تین اور اقتباسات کو شامل کیا جاسکتا ہے:

(۱) متی 24:27-31

(۲) مرقس 13:24-27 اور

(۳) لوقا 21:25-28

یہ اقتباسات سارے کے سارے متناسبی اناجیل (Snoptic Gospels) کے ہیں اور اپنے آپ میں غیر متعین اور گنجلک ہیں بطور خاص اس لیے کہ ان میں مذکورہ علامات کو اگر لغوی طور پر لیا جائے تو یہ ناممکن معلوم ہوتے ہیں اور اگر تمثیلا لیا جائے تو کسی درجے میں دوبارہ آمد مسیح پر دلالت کرتے ہیں۔

نہایت عجیب اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ تینوں بیانات جو حضرت مسیح کی دوبارہ آمد سے متعلق ہیں صرف متی، مرقس اور لوقا میں مذکور ہیں اور ان میں شاید ہی کوئی فرق ہو۔ یہ تینوں اناجیل اسی لیے متناسب اناجیل Synoptic کہلاتی ہیں۔ حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کے تعلق سے کوئی بات چوتھی انجیل یعنی یوحنا کی انجیل (Gospel According to John) میں نہیں۔ دوسری طرف یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان سے ان کے بعد آنے والے عظیم الشان نبی کی آمد کی بشارت دیتی ہے۔ اس نبی کی آمد کی بشارت سے متناسبی اناجیل یکسر خالی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دراصل Redaction کے مرحلے کی تحریفات ہیں جن پر یہاں بحث غیر موزوں ہوگی۔ اگر ان دونوں قسموں کے اناجیل کو باہم مدغم کردیا جائے تو "یوحنا کی پیشین گوئی" (Revelation) کے اس طویل اقتباس کا اصلی مطلب بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

اب جہاں تک متناسبی اناجیل Synoptic Gospel میں مذکور اس دن کا معاملہ ہے تو اس تعلق سے چند علامات کا ذکر کیا جاتا ہے جو تین جگہ مذکور ہیں:

(۱) متی 24:3-26

(۲) مرقس 13:5-23

(۳) لوقا 21:5-24

ان بیانات میں آفات سماوی وارضی، جنگ، بدامنی، خلفشار، بداخلاقی اور ساری دنیا میں عیسائیت کے پھیل جانے کا تذکرہ ہے۔ یہاں قابل ذکر بات اور سوال یہ ہے کہ ان علامات میں جب تمام نشانیاں منفی طور پر مذکور ہیں ان میں عیسائیت کے پھیلنے کو مثبت طور پر لیے جانے کا کیا جواز ہوگا؟ اور اگر اسے بھی منفی علامت تصور کیا جائے تو اس سے مراد دین عیسیٰ نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے بعد محرف شدہ دین عیسیٰ ہونا ہی ممکن ہے۔

ان علامتوں کے علاوہ اور متناسب اناجیل سے الگ یوحنا کی پیشین گوئی اور دیگر عیسائی صحیفوں میں چند اور علامات کا ذکر ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) آنتائی کرائست (Anti-Christ) کا ظہور۔

اس کا ذکر 2 تھسلونیکیوں 2:3 میں کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس نام یعنی آنتائی کرائست کے اعتبار سے ذکر کا معاملہ ہے تو یہ صرف دو جگہ مذکور ہے یعنی

(۱) 1 یوحنا 4:3 میں اور

(۲) 2 یوحنا 7 میں

لیکن ہم آنتائی کرائست پر بحث ظہور دجال کے ذیل میں انشاءاللہ کریں گے۔

اس طرح حضرت مسیح کی آمد کے تعلق سے جو تفصیلات ملتی ہیں وہ دو خطوط پر ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) پوری عیسائیت اور بطور خاص رومن کیتھولک چرچ عقیدے کے اعتبار سے اس کی قائل ہے کہ حضرت مسیح دوبارہ تشریف لائیں گے۔ یہاں اس تفصیل سے چنداں بحث کی ضرورت نہیں کہ اس آمد کی صورتیں کیا کیا ہوں گی اور اس باب میں ان کے یہاں کیا مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔

(۲) عیسائیت کی عام رائے یہی ہے کی آپ علیہ السلام کی آمد Parousia ہے جو دراصل (Redempt on) 'نجات' کے لیے ہوگی۔

(۳) نجات کے تعلق سے عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ نجات تمام لوگوں کے لیے

بالعموم اور عیسائیوں اور بنی اسرائیل کے لیے بالخصوص نجات ثابت ہوگی۔ عقیدۂ نجات (Redemption) عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ جدابات ہے کہ نجات کے معنی میں متعدد آرا ہیں۔

(۴) نجات تین کیفیتوں سے مربوط مگر منفرد ہے۔

(۱) Atonement یعنی At-one-ment ـــــ یعنی متحد کرنا۔ خدا اور بندوں کو جوڑنا ـــــ اس کا اصطلاحی مفہوم ہے باہم جدا ہو جانے والے فریقوں کو یکجا کرنا۔

(۲) Reconciliation یعنی تعلقات بحال کرنا۔ یعنی ایسے دو فریقوں کو جو آپس میں اجنبی ہو کر الگ الگ ہو گئے تھے انہیں یکجا کرنا۔

(۳) Salvation یعنی زخم بھرنا یا اچھا کرنا۔ یعنی صحت یاب کرنا۔

ان تینوں مفاہیم میں جو کیفیت مشترک ہے وہ ہے: ایک حالت سے دوسری حالت کو منتقلی ـــــ چنانچہ Redemption کا مفہوم ہے ایک حالت سے آزاد ہو کر دوسری حالت میں منتقل ہونا ـــــ اس طرح عیسائیت میں Redemption کو درج ذیل دو باتوں میں ملخص کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کائنات میں دو حالتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) انسان ـــــ گناہ، موت، قانون، جسم (طبعی)، شیطان، ظلم، دنیا کی طاقتیں اور تاریکی کا غلام ہے۔ یہ ایک حالت ہے۔

(۲) مغفرت، ابدی حیات، آزادی، قلب ماہیت، ربانی ولدیت، خلاصی، پیدائش جدید، زندگی اور روشنی کا حصول ـــــ یہ دوسری حالت ہے۔

اس طرح حضرت عیسیٰ کی آمد دراصل اسی نجات (Redemption) کے لیے ہوگی جو مغفرت، ابدی حیات، آزادی، قلب ماہیت، ربانی ولدیت، خلاصی، پیدائش جدید اور روشنی سے عبارت ہے۔ ہر چند کہ نجات (Redemption) موجودہ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ ہے لیکن جیسا کہ ہم لوگوں نے دیکھا کہ متناسبی اناجیل (Synoptic Gospel) جب آمد مسیح کا ذکر کرتی ہیں تو وہ مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے۔ اور اس میں سب سے بڑا خلا آمد کے مقصد کا پایا جاتا ہے۔ جسے Redemption کے عقیدے سے پر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ

کی زبان سے اپنے بعد آنے والے شخص کا ذکر کرتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کا بظاہر کوئی ذکر نہیں کرتی۔ تیسری طرف پیشین گوئی (Revelation) کا اقتباس ـــــ اگر اس کا انطباق حضرت عیسیٰ پر کیا جائے ـــــ تو وہ حضرت عیسیٰ کی اس دوبارہ آمد کا ذکر کرتی ہے جو Second Coming سے زیادہ قریب ہے جو Anti Christ کے خاتمے کے لیے ہوگی۔

چنانچہ درج ذیل باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

(۱) عیسائیت حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد پر یقین رکھتی ہے اور اس کا مقصد نجات (Redemption) قرار دیتی ہے۔

(۲) متناسبی اناجیل واضح طور پر حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کے بجائے Son of man کی آمد کا ذکر کرتی ہیں مگر نجات (Redemption) کا واضح ذکر نہیں کرتیں۔

(۳) چوتھی انجیل یعنی یوحنا کی انجیل حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کا ذکر نہیں کرتی بلکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سے اپنے جانے تاکہ دوسرا آئے کا ذکر کرتی ہے اور کسی نجات (Redemption) کا ذکر نہیں کرتی۔

(۴) پیشین گوئی (Revelation) حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کا ذکر کچھ ابہام کے ساتھ کرتی ہے مگر اس کا مقصد نجات (Redemption) کے بجائے آنتائی کرائسٹ کا خاتمہ بتاتی ہے۔

(۵) بلاشبہ یہی پیشین گوئی (Revelation) اس کا بھی اظہار کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ آنتائی کرائسٹ کا خاتمہ کر کے زمین پر مثالی نظام عدل قائم فرمائیں گے۔

**(۲) دجال کا ظہور:** دجال کے تعلق سے کئی باتیں عیسائیت میں حیرت ناک ہیں جن کی تلخیص درج ذیل ہے:

(۱) کسی ایسے ایک یا ایک سے زائد اشخاص کے بارے میں تینوں متناسبی اناجیل ـــــ یعنی متی، مرقس اور لوقا ـــــ بالکل خاموش ہیں۔ جب کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی وہ اناجیل ہیں جو عیسائیوں کے بقول حضرت عیسیٰ کے دوبارا آنے کی بات کہتی ہیں۔

(۲) اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یوحنا کی انجیل ـــــ جو چوتھی انجیل کہلاتی ہے ـــــ کسی ایسے تذکرے سے خالی ہے جس کا انطباق دجال پر ہو سکتا ہو۔

(۳) دجال کا تذکرہ متعین طور آنتائی کرائست (Anti-Christ) کے اعتبار سے ان دو مراسلوں میں ملتا ہے جسے یوحنا نے لکھا تھا اور جو یوحنا کا پہلا مراسلہ (First Epistle of John) اور یوحنا کا دوسرا مراسلہ (Second Epistle of John) کہلاتے ہیں۔

چنانچہ یوحنا کے پہلے مراسلہ کے حصہ دوم کی 18 تا 22 سطر میں ہے:

"بچو! یہ آخری وقت ہے اور جیسا تم نے سنا ہے کہ 'آنتائی کرائست' آنے والا ہے۔ اس کے مطابق اب بھی بہت سے 'آنتائی کرائست' اٹھے ہیں۔ اس سے ہم جانتے ہیں کہ یہ آخری وقت ہے۔ وہ نکلے بھی تو ہم ہی میں سے لیکن ہم سے تھے نہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم میں سے ہوتے تو ہمارے ساتھ رہتے۔ لیکن نکل اس لیے گئے کہ یہ ظاہر ہو کہ وہ ہم سے نہیں ہیں۔ اور تمہارا تو اس مقدس سے مسح ہوا ہے اور تم سب کچھ جانتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم صدق کو نہیں جانتے بلکہ اس لیے کہ اسے جانتے ہو۔ اور اس لیے کہ کوئی جھوٹ سچائی کی طرف سے نہیں۔ کذاب کون ہے؟ صرف وہ جو عیسیٰ کے مسیح ہونے کا انکار کرتا ہے۔ اور 'آنتائی کرائست' وہی ہے جو باپ اور بیٹے کا انکار کرتا ہے۔"

اسی طرح یوحنا کے دوسرے مراسلے کی سطر ۷ میں لکھا ہے:

"کیونکہ بہت سے ایسے فریب دینے والے دنیا میں نکل آئے ہیں جو یہ نہیں اقرار کرتے کہ عیسیٰ مسیح مجسم آنے والے ہیں۔ یہی فریب دینے والا ہے۔ یہی آنتائی کرائست ہے۔"

(۴) ایک اور تذکرہ ملتا ہے جہاں کسی ایسے آنے والے کو "لادینیت کا آدمی" (Man of Lawlessness) اور "تباہی کا بیٹا" (The Son of Perdition) کہا گیا ہے۔ چنانچہ تھسلونی کیوں حصہ دوم کی سطر ۱ تا ۱۰ میں لکھا ہے:

"بھائیو! ہم اپنے آقا عیسیٰ مسیح کے آنے اور اس کے پاس اپنے اکٹھے ہونے کے بارے میں تم سے عرض کرتے ہیں۔ کہ کسی فرد (نفس) یا کلام یا خط کے ذریعہ جو گویا ہماری طرف سے ہو یہ سمجھ کر کہ خدا کا دن آگیا ہے تمہارا دل اچانک متزلزل نہ ہو جائے اور نہ تم گھبراؤ۔ کسی طریقے سے کسی کے فریب میں نہ آنا کیونکہ وہ دن نہیں آئے گا جب تک دین کا ترک نہ ہو لے، اور وہ "لادینیت کا آدمی" یا "تباہی کا بیٹا" ظاہر نہ ہو جائے۔ جو مخالفت کرتا ہے اور ہر ایک سے جو خدا یا معبود ہے اپنے آپ کو بڑا ٹھہراتا ہے یہاں تک کہ وہ بیت اللہ میں متمکن ہوتا ہے ایسے جیسے وہ خدا ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں

کہ جب میں تمہارے یہاں تھا تو تم سے یہ باتیں کہا کرتا تھا۔ اور اب تم اس شئے کو جانتے ہو جو اسے روک رہی ہے کہ وہ اپنے ہی وقت میں ظاہر ہو۔ کیونکہ لادینیت کا راز برسرکار ہے لیکن ابھی ایک روکنے والا ہے اور جب تک وہ دور نہ ہو جائے وہ روکے رہے گا۔ تب وہ "لادین" ظاہر ہوگا جسے آقا عیسیٰ اپنے منہ کی پھونک سے مار ڈالے گا اور اپنی آمد کے نور سے تباہ کر دے گا۔ اس "لادین" کا آنا شیطان کے عمل کے مطابق ہے۔ پوری طاقت، نشانیوں اور کرشموں کے ساتھ۔ اور فانی (لوگوں) کے لیے تمام ناجائز فریبوں کے ساتھ اس لیے کہ انہوں نے سچائی کی محبت کو اخذ نہیں کیا جس سے وہ محفوظ رکھے جا سکتے تھے۔

(۵) ایک اور تذکرہ ہے جو دو جانوروں سے متعلق ہے اور پیشین گوئی (Revelation) میں 13:1-18، 17:7-18 اور 19:17-21 میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک جانور "زمینی" ہے اور دوسرا "بحری"۔ یہ دونوں دجال کی طرح پیش کیے گئے ہیں جو انسانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

چنانچہ ان دونوں جانوروں میں سے پہلے جانور کا تذکرہ جو "بحری جانور" ہے پیشین گوئی کے حصہ سیزدھم سطر ۱ تا ۱۰ میں اس طرح ہے:

"اور میں نے ایک جانور کو سمندر سے نکلتے ہوئے دیکھا، جس کی دس سینگیں اور سات سر تھے۔ اور اس کی سینگوں پر دس تاج تھے اور اس کے سروں پر اہانت کے نام لکھے تھے۔ اور جو جانور میں نے دیکھا وہ چیتے کی طرح تھا اور اس کے پاؤں بھالو کی طرح اور منہ شیر کا سا تھا اور اژدھا نے اسے اپنی طاقت، اپنا تخت اور عظیم اقتدار دے رکھا تھا۔ اور میں نے اس کے سروں میں سے ایک پر ایسا بھاری زخم لگا دیکھا گویا وہ مرنے والا ہو، پھر اس کا مہلک زخم اچھا ہو گیا اور ساری زمین کے لوگ اس جانور کے پیچھے پیچھے حیرت کرتے ہوئے چلنے لگے۔ اور وہ اژدھا کی پرستش کرنے لگے کہ اس جانور کی طرح کون ہے؟ کون اس سے لڑ سکتا ہے؟ اور اسے بڑے بول بولنے اور اہانت کرنے والا ایک منہ دیا گیا۔ اور اسے بیالیس مہینے کام کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اور اس نے خدا کی اہانت کرنے کے لیے منہ کھولا تاکہ اس کے نام اور اس کے خیمے اور جو آسمانوں میں رہتے ہیں کی اہانت کرے۔ اور اسے یہ اختیار دیا گیا کہ مقدس لوگوں سے لڑے اور ان پر فتح پائے، اور اسے ہر ایک قبیلے، زبان اور قوم پر اختیار دیا گیا اور زمین کے وہ سب رہنے والے جن کے نام میمنے کی ـــ جو دنیا کی بنیاد (ابتداء) سے قتل کر دیا گیا ـــ زندگی کی کتاب میں لکھے

نہیں گئے اس جانور کی پرستش کریں گے۔ جس کے کان ہوں وہ سنے! جو قید کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو قید میں پڑے گا، جو تلوار سے مارتا ہے ضرور تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ پاک لوگوں کا صبر اور ایمان اسی میں ہے۔"

دوسرے جانور کا تذکرہ جو "زمینی جانور" ہے اس کے بعد اس طرح ہے:

"پھر میں نے ایک اور جانور کو زمین سے نکلتے دیکھا، اس کے میمنے کے سے دو سینگ تھے، اور وہ اژدھا کی طرح بولتا تھا۔ اور یہ اس پہلے جانور کا سارا اختیار اس کے سامنے استعمال کرتا تھا، اور زمین اور اسکے رہنے والوں سے اس پہلے جانور کی جس کا مہلک زخم اچھا ہو گیا تھا پرستش کراتا تھا، اور وہ بڑی بڑی نشانیاں دکھلاتا تھا، یہاں تک کہ انسانوں کے سامنے آسمان سے زمین پر آگ برسا دیتا تھا اور ان نشانیوں کے سبب جنہیں اس جانور کے سامنے دکھلانے کا اسے اختیار دیا گیا تھا وہ زمین کے رہنے والوں کو اس طرح فریب دیتا تھا کہ زمین کے رہنے والوں سے کہتا تھا کہ جس جانور کو تلوار لگی تھی وہ زندہ ہو گیا ہے اس کا بت بناؤ اور اسے اس جانور کے بت میں جان ڈالنے کا اختیار دیا گیا کہ جانور کا بت بولنے لگے اور جتنے لوگ اس جانور کے بت کی پرستش نہ کریں انہیں مروا ڈالے۔ اور اس نے چھوٹے، بڑے، امیر، مفلس، آزاد، غلام سب کے داہنے ہاتھ یا ان کی پیشانی پر ایک، ایک نشان لگوا دیئے تاکہ وہ لوگ جن کے وہ نشان ہے یا ان پر اس جانور کا نام لکھا ہے یا اس کے نام کے عدد ہیں کوئی دوسرا خرید و فروخت نہ کر سکے۔ یہیں حکمت ہے۔ جس کے پاس فہم ہے وہ حساب کر لے، جانور کے عدد کا اس لیے کہ یہ ایک آدمی کا عدد ہے۔ اس کا عدد ہے 666۔"

جہاں تک آنتائی کرائسٹ (Anti-Christ) کی بات ہے تو یہ ایک یونانی اصطلاح ہے جس میں Anti کا مفہوم ہے۔ "کسی کی مخالفت میں" (Over against) یا "بجائے" (Instead of)۔ چنانچہ یوحنا کی مراسلت میں اس فرد کا تذکرہ جس تناظر میں ہوا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شخص حضرت عیسیٰ کی مخالفت میں بھیجا گیا ہے یا بھیجا جائے گا یا ان کی بجائے۔ یہ مفہوم بہت واضح اور احادیث نبویہ ﷺ سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ جہاں "المسیح الدجال" کہا گیا ہے۔

1 تھسلونیکیوں میں جو تذکرہ پایا جاتا ہے، اس میں اس "فرد" کی ـــــ جو حضرت عیسیٰ کا مخالف اور ان کے بجائے آئے گا ـــــ کئی صفات ابھری ہوئی ملتی ہیں۔ مثلاً (۱) جھوٹا (۲) فریبی (۳) خدائی کا دعویدار (۴) حیرت ناک کرشموں اور نشانیوں کو دکھلانے والا (۵) طاقت ور

(۶)دین مخالف (۷)تباہی لانے والا (۸)خدا کا مخالف اور(۹)ناجائز طریقوں کا استعمال کرنے والا وغیرہ۔

یہاں شیطان اور اس کی بندش سے متعلق ایک خاص بات ہے جو پیشین گوئی (Revelation) میں ملتی ہے۔ پیشین گوئی کے حصہ بیستم میں درج ہے:

"پھر میں نے ایک فرشتے کو آسمان سے اترتے دیکھا جس کے پاس اتھاہ گڑھے کی کنجی اور ایک بڑی زنجیر تھی۔ اور اس نے اس اژدھا یعنی قدیم سانپ کو جو کہ دائی بولوس اور شیطان ہے پکڑا اور ایک ہزار سال کے لیے باندھ دیا۔ اور اسے اتھاہ گڑھے میں پھینک دیا اور اس (گڑھے) کو بند کر دیا اور اس پر ایک مہر لگا دی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قوموں کو ایک ہزار سال پورا ہونے سے پہلے فریب دے دے، لیکن اس کے بعد وہ ضرور تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔"

یہاں ایک بات کا ذکر افادیت سے خالی نہیں ہوگا کہ یوحنا اپنی انجیل میں آنتائی کرائست کے وفاداروں اور پیروؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوحنا کی انجیل حصہ ۵ سطر ۴۳ میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "میں اپنے باپ کے نام سے آیا ہوں اور تم مجھے قبول نہیں کرتے، اگر کوئی اپنے ہی نام سے آئے تو اسے قبول کر لو گے۔"

یہ تمام بیانات دجال سے متعلق ان بیانات سے ملتے جلتے ہیں جو احادیث میں درج ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت نے تاریخ میں اپنے تمام مخالفین کو ــــ حتیٰ کہ خود اپنے اندر کے فرقوں کو جن میں باہم اختلاف تھا آنتائی کرائست کا لقب دیا۔ تاہم جہاں تک عقائد کے اظہار اور تصور آخرت (Eschatology) کا تعلق ہے تو آنتائی کرائسٹ کا مسئلہ عیسائیت میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ عیسائیت کی معتبر معجم Lexikon Für Theologie und Kirche میں K. Rahner نے لکھا ہے:

"This teaching gives Christians a permanent right not merely to wage war upon anti-Christian powers and ideas in the abstract, but to recognize and to flee from men and powers in the concrete as its representatives."

(K.Rahner: Lexikon für Theologie und Kirche (LTK) 1957-67 as quoted by Rudolf Pesche in

Sacramentum Mundi: Herder & Herder, New York.)

ترجمہ:

"(آنتائی کرائسٹ سے متعلق) یہ تعلیم عیسائیوں کو نہ صرف عیسائی مخالف قوتوں اور خیالات کے خلاف معروضی طور پر جنگ کرنے کا مستقل اور دائمی حق دیتی ہے بلکہ اس بات کا بھی کہ ایسے افراد اور قوتوں کی جو متعین طور پر اس کی نمائندگی کرتی ہیں تعیین کی جائے اور ان سے دور بھاگ جایا جائے۔"[۵]

اس سے آگے بڑھ کر مشہور عیسائی مفکر اور عالم فرور (Frör) کہتے ہیں:

"Among the traditions concerning the last days, the doctrine of Anti-Christ has a special pastoral function to fulfil. It serves to arm the believing community to do battle with the compact forces of darkness, in the form in which they encounter them in their own age."

(K.Frör: Biblische Hermeneutik (2nd ed 1964) as quoted by Rudolf Pesche in Sacramentum Mundi, Herder & Herder, New York.)

ترجمہ: "آخری ایام سے متعلق روایات میں عقیدۂ آنتائی کرائسٹ ایک مخصوص راعیانہ مشن ہے جس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ عبارت ہے اہل ایمان کو مسلح کرنے سے تاکہ وہ ظلمات کی منظم قوتوں سے جنگ کرے۔ اسی طرح جس طرح (پہلے وہ عہد مسیح میں کرتے۔)"[۶]

عیسائی علماء کو یہ تسلیم ہے کہ ہر چند کہ آنتائی کرائسٹ کا آنا یقینی ہے لیکن اس کی آمد کی علامات مبہم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ضروری امر ہے۔ تاہم ان کے مطابق یہ بات یقینی ہے کہ حضرت مسیح کی آمد سے قبل آنتائی کرائسٹ کا آنا لازمی ہے جو تباہی، بددینی، فریب، جھوٹ، جنگ اور غارتگری لے کر آئے گا۔

## (۳) حضرت مسیح کے ذریعہ دجال کا خاتمہ اور روئے زمین پر نظام عدل کا قیام:

عیسائیت میں حضرت مسیح کے ذریعہ دجال کے خاتمے اور روئے زمین پر نظام عدل کے

قیام کے مسئلے پر جو عقائد اور نظریات پائے جاتے ہیں ان کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے تین عنوانات کے تحت لیں۔ پہلا حضرت عیسیٰ کی آمد دوسرا حضرت عیسیٰ کے ذریعہ آسمانی کرائست کا خاتمہ اور تیسرا حضرت عیسیٰ کے ذریعہ نظام عدل کا قیام۔

حضرت مسیح کی آمد:

حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کا معاملہ بھی کم الجھا ہوا نہیں ہے۔ اسے پہلے دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں پھر اس کی تنقیح کے لیے مزید تقسیم کی جائے گی۔

سب سے پہلے یہ بات عیسائیت کس طرح لیتی ہے جاننا ہوگا کہ جس روز حضرت مسیح تشریف لائیں گے، وہ کون سا دن ہوگا؟

وہ دن جسے "یہ دن" "This aeon" (متی ۳۲:۱۲) یا "وہ دن" "That aeon" (لوقا ۳۵:۲۰) یا "آئندہ دن" "Coming aeon" (مرقس ۳۸:۱۰ اور لوقا ۳۰:۱۸) یا "مستقبل کا دن" "Future aeon" (متی ۳۲:۱۲) کہا گیا ہے۔

اگر اس سے مراد "وہ دن" ہے اور اس "وہ دن" سے مراد "آخرت کا دن" ہے تو یہ اخروی تصور سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا تعلق "آئندہ دنیا" سے ہے۔

اگر اس سے مراد وہ اصطلاحیں ہیں جسے اناجیل میں "حکومت الٰہیہ یا "حکومت سماویہ" اور یونانی میں بے۔ سی۔ لیا۔ تاؤ۔ تھی۔ اُو ـــــ یا ـــــ بے۔ سی۔ لیا۔ تو۔ وُن۔ اُو۔ رَا۔ نُون۔ کہا گیا ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟

عیسائیت کو اس سے اتفاق ہے کہ اس امر کے بنیادی ہونے کے باوجود اس کی کوئی واضح اور متعین تعریف پائی نہیں جاتی۔ [۷] چنانچہ بعض تو اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے اسے صرف علامت تک قرار دے دیا۔ [۸]

اس تعلق سے کئی باتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات صرف متناسبی اناجیل Synoptic Gospel میں ہی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ تمام متناسبی اناجیل میں یہ اصطلاحات تقریباً ۱۵۰ بار استعمال کی گئیں ہیں۔ ان میں سے متی میں بے۔ سی۔ لیا۔ تو۔ ون۔ او۔ را۔ نون اور مرقس اور لوقا میں بے۔ سی۔ لیا۔ تاؤ۔ تھی۔ او۔ جہاں تک یوحنا کی انجیل کی بات ہے تو وہاں صرف ایک بار مگر تکرار کے ساتھ اس اصطلاح یعنی بے۔ سی۔ لیان۔ تاؤ۔ تھی۔ او۔ کا

استعمال کیا گیا ہے۔(ملاحظہ فرمائیں یوحنا ۳:۳۔۵)

اب جہاں تک خود اس بات پر غور کیا جانا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد بعثت سے ان کے ذریعہ بیان کردہ "حکومت الٰہیہ" کی کیا تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے تو اس کا جائزہ لینے سے تین امور سامنے آتے ہیں:

## (۱) "حکومت الٰہیہ" بطور تجربۂ مغفرت:

چنانچہ متا بی اناجیل میں جابجا اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت مغفرت کا ایک غیر معمولی تجربہ تھی۔ مثلاً

(۱) بنی اسرائیل کو توبہ کی دعوت دی گئی ـــــ اس لیے کہ حکومت الٰہیہ قریب آرہی ہے (مرقس ۱:۱۴۔۱۵)

(۲) حکومت الٰہیہ غریبوں کے لیے خوشخبری ہوگی۔(متی ۱۱:۵ لوقا ۴:۱۸)

(۳) ہر روحوں سے شفا اور نجات حکومت الٰہیہ کی آمد ہے۔(متی ۱۲:۲۸ لوقا ۱۱:۲۰)

## (۲) حکومت الٰہیہ بطور اخروی واقعہ:

حکومت الٰہیہ کی آمد کا "وقت" شاید وہ سب سے الجھا ہوا مسئلہ ہے جو عالم عیسائیت میں ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے اور جس نے بڑا ہیجان برپا کیا ہے۔

چنانچہ ابتدائی عیسائیت میں "حکومت الٰہیہ" کو حضرت مسیح علیہ السلام میں مرکوز کیا گیا اور اس تناظر میں اسے دو اعتبار سے دیکھا گیا:

(۱) حضرت مسیح یعنی ذات مسیح ـــــ اور

(۲) حضرت مسیح یعنی مقصد بعثت، رحم (Passion)، موت، نشاۃ ثانیہ (Ressurrection)، ارتفاع (Exaltation) اور رجعت (Return)۔

دونوں ہی صورتوں میں اس سے مراد اخروی امر ہے۔ لیکن اس اخروی امر سے مراد یہ ہے کہ حضرت مسیح کی قربانی ہی دراصل حکومت الٰہیہ کا تجربہ ہے۔ مابعد فتح عقیدے (Post Pascal Faith) کے تحت حضرت عیسیٰ کا رحم (Passion) اور ان کی موت (Death) حکومت الٰہیہ کا غفرانی واقعہ ہے جس کا اعلان حضرت مسیح نے کیا۔

۱۸۹۲ء میں یوحانیس ویس (Johannes Weiss) کی کتاب نے ایک بار پھر اس بحث میں تلاطم پیدا کر دیا کہ حضرت مسیح کی آمد کا 'وقت' کون سا ہے۔

چونکہ مرقس میں کہا گیا: "جب یوحنا کو قید میں ڈال دیا گیا تو عیسیٰ گلیلی آیا اور حکومت الٰہیہ کی خدائی خبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: وقت پورا ہو چکا ہے اور حکومت الٰہیہ قریب ہے۔ توبہ کرو اور خدائی خبر پر ایمان لاؤ (مرقس ۱:۱۴۔۱۵)۔ چنانچہ حواریوں کو تلقین کی گئی:

"اور اس نے ان سے کہا: بلاشبہ میں تم سے کہتا ہوں یہاں جو لوگ کھڑے ہیں ان میں سے بعض موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے مگر یہ کہ اس سے قبل حکومت الٰہیہ کو مقتدر موجود دیکھ لیں۔" (مرقس ۹:۱)

ان باتوں سے ویس (Weiss) شوائزر (Schweitzer) اور دوسروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خود حضرت عیسیٰ کو وقتِ آخر یعنی قیامت کے برپا ہونے کی امید تھی[9]

لیکن چونکہ بعض دوسری جگہوں پر وہ قربت ان کی موجودگی کو ثابت کر رہی ہے مثلاً:

"لیکن اگر میں شیاطین کو روح القدس سے باہر نکال دوں تو سمجھ لو واقعی حکومت الٰہیہ تم پر وارد ہو چکی ہے۔" (متی ۱۲:۲۸)

بعض دیگر علماء نصاریٰ مثلاً سی۔ایچ ڈوڈ (C.H. Dodd) نے نتیجہ اخذ کیا کہ خود حضرت مسیح کی بعثت اول ہی حکومت الٰہیہ کا قیام تھی۔ اس نظریے کو "اخذ کردہ نظریۂ آخرت" (Realized Eschatology) کہا جاتا ہے[10]

## (۳) حکومت الٰہیہ بطور الٰہیاتی انکشاف:

حکومت الٰہیہ کی سابق دو توجیہات کے ساتھ ساتھ ایک اور توجیہ بھی کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ایک تنبیہ ہے جو اسرائیل کی اس آرزو کا اظہار کرتی ہے جس میں وہ خدا کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ بنو اسرائیل سمجھتے ہیں کہ اپنی پوری تاریخ میں وہ ناکام اور مایوس ہوئے اور انہیں امن کی شدید ضرورت ہے جسے وہ آنے والے خدا کے بیٹے کی لائی گئی مغفرت میں متصور کرتے ہیں۔ اس سے مراد ہے تمام کائنات اور مخلوقات بشمول انسان پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا قیام۔

اس اعتبار سے متناسبی اناجیل میں جس آمد کا ذکر ہے اس کی تعبیر سامنے آنے کے بعد دوسرے سوال کا فیصلہ اسی مقام پر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک استخراجی مسئلہ ہے۔ یعنی "Parousia"

یا حضرت مسیح کی لوگوں کی مغفرت کے لیے آمد اور ان کی موجودگی۔

## حضرت مسیح کے ذریعہ آنتائی کرائست کا خاتمہ:

اب جہاں تک "حضرت مسیح کے ذریعہ آنتائی کرائست کے خاتمے" اور اس کے بعد کے نکتے یعنی "آنتائی کرائست کے خاتمے کے بعد روئے زمین پر نظام عدل کا قیام" کی بات ہے تو ان دونوں کا تعلق فی الواقع متناسبی اناجیل (Synoptic Gospel) سے نہیں ہے۔ ان کا تعلق تمام کا تمام یا تو یوحنا کی انجیل، یوحنا کے لکھے مراسلے، یوحنا کی پیشین گوئی یا پھر تھسلونی کیوں کے مراسلے سے ہے۔ اور ان میں بھی بطور خاص یوحنا کی پیشین گوئی (Revelation) سے۔

متناسبی اناجیل اور یوحنا کے ذریعہ مرتب کردہ انجیل اور پیشین گوئی میں ظاہری تضاد دراصل اس بڑے تضاد کا پتہ دیتا ہے جو مخفی ہے ـــ یعنی حضرت مسیح اگر آنتائی کرائست کے خاتمے کے لیے آرہے ہیں تو وہ جو نظام عدل قائم فرمائیں گے ـــ اس کا تعلق نہ اُخروی دنیا سے ہوگا نہ مغفرت سے۔ اور اگر اس اخروی دنیا کے قیام اور مغفرت کے لیے تشریف لا رہے ہیں تو آنتائی کرائست کا خاتمہ کون کرے گا اور وہ نظام جس کا ذکر مبہم ہی سہی پیشین گوئی کے آخر میں ہے اس کو کون حقیقت کی شکل دے گا۔ اور جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تیسری آمد کا ذکر نہیں ہے۔

ظاہر ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی دوسری آمد صرف اور صرف دو باتوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے یعنی

(۱) آنتائی کرائست کا خاتمہ اور اس کے بعد

(۲) نظام عدل کی بحالی

اور یہ دونوں امور دراصل Second Coming اور Parousia میں فرق کرتے ہیں اور فی الواقع Parousia کی تردید کرتے ہیں ـــ کم از کم ان معنوں میں جن میں وہ عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس تعلق سے رومن کیتھولک چرچ کا عام عقیدہ درج ذیل ہے:

(۱) یوحنا کا ساتواں مشہد بنیادی طور پر مغفرت (Salvation) سے تعلق رکھتا ہے۔

(۲) یہاں بنیادی قطع تسلسل (Radical Discontinuity) پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ زمین اور یہ آسمان کلیتہً بدل جائیں گے۔ اور نیا آسمان اور نئی زمین واقع ہونگیں جہاں سمندر نہیں ہوں گے۔

(۳) سمندر کا غائب ہو جانا دراصل ہمیشہ کے لیے سانپ (Dragon) اور انتائی کرائسٹ (beast) کے ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہ لاقانونیت اور لادینیت کے کلی خاتمے کا بھی مظہر ہے۔ یہاں تک کہ موت کے خاتمے کا بھی۔ یعنی سمندر کے خاتمے سے ایک ابدی زندگی متصور کی جاتی ہے۔

(۴) نیا یروشلم دراصل ایک اخروی تصوراتی اظہار ہے۔ اس میں کسی تاریخی یروشلم کی بحالی کی بات تصور نہیں کی گئی ہے۔

(۵) اس میں کسی ہیکل کا تصور نہیں اس لیے کہ یوحنا نے کہا:

"میں نے اس شہر میں ہیکل نہیں دیکھا، اس لیے قادر مطلق رب اس کا خود ہیکل ہے اور میمنہ۔" (پیشین گوئی ۲۱ : ۲۲)

## حضرت مسیح کے ذریعہ نظام عدل کا قیام:

اب صرف دو باتوں کی وضاحت باقی رہتی ہے۔ اور اس میں پہلی بات اس حکومت الٰہیہ (Kingdom of God) کی بات ہے جسے یوحنا نے اُو۔ را۔ نُون۔ کائے۔ نُون۔ کائے۔ گین۔ کائنین یعنی۔ نیا آسمان اور نئی زمین ـــــ کہا ہے اور دوسری بات اس شہر قدس کی ہے جسے یوحنا نے اِرُو۔ شلیم۔ کائے۔ نین (نیا یروشلم) کہا ہے۔

## نیا آسمان اور نئی زمین :

یوحنا نے پیشین گوئی میں لکھا:

"پھر میں نے نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا، کیوں کہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی اور سمندر بھی نہ رہا۔ (پیشین گوئی ۲۱ : ۱)

یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا۔ نیا سے کیا مراد ہے؟ اور دوسرا سطر ۴ میں موت سے کیا مراد ہے؟

اگر نیا سے مراد تبدیل شدہ اور تبدیل شدہ سے مراد اُخروی ہے اور اُخروی سے مراد اس

زمیں کے سوا کوئی اور زمین ہے تو اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اگر نیا سے مراد تبدیل شدہ اور تبدیل شدہ سے، مراد اسی روئے زمین پر نئی صورت حال ہے تو اس سے مراد ایک ایسی دنیا تو ہو سکتی ہے جہاں پہلی روئے زمین کی آلائش اور برے لوازمات نہ ہوں لیکن ہو وہ یہی روئے زمین اور وہ بھی آخرت اور آخرت کی مغفرت سے پہلے کی زمین اور زمین اور آخرت کے مابین قیامت ہو۔

چنانچہ انجیلی یونانی کے پچھلی صدی کے سب سے بڑے ماہر Swete نے لکھا ہے کہ اس سطر (پیشین گوئی (۲۱: ۱) میں۔ کائے ـــ نوس۔ جو ضد ہے پالائیوس کا ـــ صرف

"Fresh life rising from the decay and wreck of the old world."

کی نشاندہی کرتا ہے۔[11]

چنانچہ اس 'نیا رنئی' کا صرف ایک ہی مطلب لیا جا سکتا ہے یعنی اسی روئے زمین اور اس کے آسمان کو آلائشوں سے پاک کر کے نئی زمین اور نیا آسمان دریافت کرنا۔ (اس تعلق سے بحث ان شاء اللہ احادیث کے حصے میں ہو گی) اور یہ بات ان بیانات سے بالکل یکسانیت رکھتی ہے جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

دوسرا سوال ہے: سطر ۴ میں 'موت' کا ذکر۔ کیا اس سے مراد ابدی حیات ہے جیسا کہ عیسائیت کا بڑا حصہ مراد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی تردید خود اسی سطر کے اندر پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہنا:

"اور خدا ان کی آنکھوں سے ہر آنسو پونچھ ڈالے گا۔"

یہ عبارت بتاتی ہے کہ یہ کوئی نئی تخلیق نہیں ہو گی۔ نئی تخلیق کے آنسو پونچھنے سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ آنسو اس مجمعے کے ہو سکتے ہیں جو کرب، تکلیف جیسے کہ جنگ، بیماری یا اذیت سے گزرا ہو۔ لہٰذا یہاں موت سے مراد وہ غیر معمولی موت ہے جو جنگ، بیماری اور اذیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ خلق میں عادتاً پائی جانے والی موت۔

تیسرا سوال ہے کہ شہر قدس اور نیا یروشلم سے کیا مراد ہے؟

پورے عیسائی علمی ورثے میں یہ تصور تین صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

(۱) اس دنیا سے ماوراء کوئی شہر قدس جسے نیا یروشلم کہا گیا ہے جو اخروی اور ابدی ہو۔

(۲) اس دنیا میں واقع کسی بہت اونچے پہاڑ پر واقع اس شہر مقدس کا قیام جو روئے ارض پر Temple (بیت معمور) کی تمثیل ہو۔

(۳) فلسطین میں واقع یروشلم اور وہاں صیہون کا پہاڑ۔

(ہر چند کہ یہ بحث فی الواقع عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں ان شاء اللہ تفصیل سے ہوگی) اس مسئلے کے تعلق سے اس مقام پر چند تنقیحات کا سامنے آجانا ضروری ہے تاکہ اس بات کی تعیین ہو جائے کہ یہاں نیا یروشلم سے کیا مراد ہے۔

(ا) یہودیت میں یروشلم، اس کے تقدس اور اس میں قائم ہیکل سلیمانی کا بہت چرچا ہے۔ لیکن یہودیت کی تاریخ کچھ عجیب بات بیان کرتی ہے۔

(الف) عبرانی تنک (TaNaK) میں یروشلم ۶۶۰ بار آیا ہے۔ بارہا صیہون (Zion) کا ذکر اس کے مترادف کے اعتبار سے (تقریباً ۱۵۴ بار) ہوا ہے۔ لیکن سب سے چونکانے والی بات، یہ ہے کہ اگر تنک میں مذکور لفظ "شلیم" کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی دیگر تعبیروں کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ لفظ تورات (Torah) میں ایک بار بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہودیت میں یروشلم کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔

(ب) یہ سارے کے سارے استعمالات جو تقریباً ۶۶۰ بار ہوئے ہیں فی الواقع نبیئم اور کتوبیم یعنی تاریخی حصے میں ہوئے ہیں۔ مثلاً ۲ سموئیل، بادشاہان، تواریخ، عزرا، نحمیا یا یسعیاہ، یرمیاہ، یحزقیل اور زکریاہ میں۔

(ج) ان کے مطابق اس شہر کی اہمیت دراصل حضرت داؤد کے ذریعہ یہاں "تابوت سکینہ" کے لانے اور رکھنے اور بعدہ اس پر حضرت سلیمان کے ذریعہ ہیکل کی تعمیر کرنے سے ہے۔ لیکن واضح ہو کہ یہ صرف ان کا دعویٰ ہے۔ ورنہ حضرت داؤد ہی وہ پہلے نبی ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل کی علانیہ بغاوت پر اصرار پر ان کی لعنت کی۔ اور قرآن نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ یہودیوں کے دعویٰ کے مطابق وہ ہیکل حضرت سلیمان نے بنوایا تھا بلکہ اسے صرف مسجد قرار دیا گیا۔ یہاں کی پیچیدگی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب دو نبیوں حضرت میکاہ اور حضرت یرمیاہ نے یروشلم کے حرم ہونے کی تردید کی۔

(د) جب، بابلیوں نے (۵۸۶۔۵۸۷ ق م) اس شہر کو برباد کر دیا تو یہودی روایات کے

مطابق بعض انبیاء بنی اسرائیل نے اسکی بحالی اور مسجد کی تعمیر سے امیدیں وابستہ کیں۔ ایسے تذکرے ضرور ملتے ہیں۔ ۷۰ عیسوی میں حضرت مسیح علیہ السلام کے یہودیوں کے مطابق مصلوب کئے جانے کے بعد وہ شہر ویران کر دیا گیا اور ہیکل تباہ ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یہودی پیشین گوئی (Jewish Apocalyptic Literature) میں دو طرح کے تصورات در آئے۔

(۱) دنیا کے آخری عہد میں وہ آسمانی یروشلم جسے خدا نے بنا رکھا ہے زمین پر اتر آئے گا۔

(۲) اس آسمانی یروشلم میں جسے خدا نے آسمان پر بنا رکھا ہے وہ یہودی داخل ہو جائیں گے جو صدیق ہوں گے۔

بہر حال ان دونوں اعتبار سے یروشلم کا تصور ان کی اُخروی زندگی کا حصہ ہو گیا۔

(۵) ربانی یہودیت (Rabbinical Judaism) جس کا عہد تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے دو چیزوں کی قائل رہی:

(۱) مسیحی عہد میں یروشلم کی تجدید کی مرکزیت

(۲) مستقبل کے (مسیحی عہد) عہد کے ذکر میں ابہام کا ہونا۔ یعنی بعض کا آسمانی یروشلم پر یقین اور بعض کا زمینی یروشلم پر یقین۔

بلکہ اس میں بھی عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ابتدائی ربانی عہد میں یروشلم کے دو تذکرے ملتے ہیں۔ اور وہ دونوں تذکرے دونوں تصورات پر یکساں زور ڈالتے ہیں۔ یعنی اس یروشلم پر جو تصوراتی اور مسیحی عہد میں بننے والا نامعلوم ـــــ اور بعض حلقوں کا آسمانی یروشلم اور بعض حلقوں کا زمینی یروشلم ـــــ ہے۔ اور دوسرا اس یروشلم پر جو یہودیوں کی تاریخ یعنی ان کے بادشاہوں کی راجدھانی کے اعتبار سے پایا جاتا ہے۔

چنانچہ جس یروشلم کا تذکرہ یہودیت کرتی ہے وہ دو یروشلم ہیں:

(۱) وہ تصوراتی یروشلم جو مستقبل کے مسیحی عہد میں یا تو زمین سے آسمان پر چلا جائے گا اور وہ اس طرح کہ یہودیوں کو یہاں سے لے جا کر اس آسمانی یروشلم میں بسا دیا جائے گا یا آسمان پر بنا ہوا یروشلم زمین پر اتر آئے گا۔

(۲) دنیا کے بہت سے خطوں اور شہروں کی طرح فلسطین کا وہ شہر جسے کئی سالوں تک

یہودی بادشاہوں کی راجدھانی بننے کا موقع ملا اور جس کی قومی زندگی میں صرف تاریخی حیثیت ہے۔

یہ دونوں یروشلم تصوراتی اور نفسیاتی ہیں۔ ان میں پہلا:

(۱) روحانی، مسیحی، تصوراتی اور دوسرا

(۲) نفسیاتی، تاریخی، تصوراتی ہے۔

گوناگوں اعتبار سے یہی وہ تضاداتی کیفیت ہے جس کا اظہار مشہور اسرائیلی مصنف اموس ایلون (Amos Elon) نے اپنی کتاب (Jerusalem: City of Mirrors) میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

It is as if the very name Jerusalem (Hebr. Yerusalaim) is a reflection of the City's contradictory, even dualistic nature (aim is the Hebrew suffix indicating a dual or pair), manifesting itself even in its location on the boundary between Israel's cultivated grasslands and arid desert regions. There has always been a tension between the present and the future, the earthly and the heavenly, the real and the ideal Jerusalem a city of diverse peoples struggling to accomplish their daily activities and the city of religious visionaries." [۱۲]

ترجمہ: یہ ایسا ہے کہ اس شہر یروشلم (عبرانی: یروشلائم) کا نام ہی اس کے متضاد بلکہ دوہری فطرت کی عکاس ہے (ائم عبرانی میں ایک لاحقہ ہے جو دوہرے پن یا جوڑے کو ظاہر کرتا ہے) اور اس کا اظہار اس کے محل وقوع میں بھی ہوتا ہے اس لیے کہ یہ شہر (موجودہ) اسرائیل کے زیر کاشت لائے گھاس کے میدانوں اور خشک ریگستانی علاقے کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک کشاکش رہی حال اور مستقبل، زمینی اور آسمانی، حقیقی اور مثالی یروشلم کے مابین ـــ متضاد قوموں کا یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کو انجام دیتے ہیں اور اسی طرح ایک ایسا شہر جو مذہبی مفکرین (کے تصورات کا مرکز بھی ہے)

(ز) یہودیت کی طرح عیسائیت بھی یروشلم کے تعلق سے کچھ اسی طرح مگر کمتر درجے میں صورت حال سے دوچار ہے۔

(۱) ابتدائی عیسائیت دو یروشلم کی قائل رہی تھی جن میں ایک آسمانی تھا اور دوسرا زمینی

(ملاحظہ فرمائیں: گلیشیز ۴:۲۵۔۲۶ ـــ عبرانی ۱۲:۲۲۔۲۴)

چنانچہ رابرٹ ولکن (Robert Wilken) کے مطابق ابتدائی عیسائی عقائد میں مثلاً جسٹن مارٹر (Justin Martyr) اور اریناُس (Iranaeus) اس کے قائل تھے کہ مسیحی عہد میں وہ یروشلم زمین پر ہوگا۔ لیکن بعد کے کلیسیائی آبا (Church Fathers) مثلاً اوریجن (Origen) نے اس کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ کسی زمینی یروشلم کے قائم ہونے کا سوال نہیں بلکہ جس یروشلم کی آبادکاری کا ذکر ہے وہ آسمانی یروشلم ہے۔

اس تنقیح سے صرف یہ بات مقصود تھی کہ عیسائیت کا کوئی واضح تصور یروشلم نہیں یا جو تصور یروشلم پیشین گوئی میں پیش کیا گیا ہے اس کے حقیقی معنی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے اور عیسائیت جس طرح بہت سارے امور میں یہودیت سے متاثر ہوئی اسی طرح اس باب میں بھی اس میں یہودیت کے اثرات آگئے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائی علماء کے مختلف طبقات اس تعلق سے الگ الگ خیالات رکھتے ہیں۔ والوورد (Walvoord) کا خیال ہے کہ نیا یروشلم ایک واقعی شہر ہوگا۔[۱۳] لیڈ (Ladd) کا کہنا ہے کہ یروشلم حضرت عیسیٰ کی موت اور نشاۃ ثانیہ کے مابین انتقال ہونے والے بزرگوں کا آسمانی مسکن ہے جو حضرت مسیح کی آمد پر زمین پر قائم ہو جائے گا۔[۱۴] للیئے (Lilje) اسے ایک آفاقی کلیسیا کے مفہوم میں لیتا ہے۔[۱۵] کڈل (Kiddle) کی تعبیر ہے کہ تمثیل کا قلب ـــ انسانوں کا ایک مجموعہ ہے ـــ یہ شہر ایک خاندان ہے۔ مکمل ملت کا نمونہ ہے ـــ جس کا زمین پر حصول ناممکن ہے اس لیے کہ یہاں گناہوں کا اثر ہے جس نے پہلی تخلیق کو فاسد کیا ہے۔[۱۶] ہنٹر (Hunter) کی تعبیر ہے کہ عیسائی امید کی تکمیل اعلیٰ ترین درجے میں معاشرتی ہے۔ یہ ایک کا ایک کی طرف فرار نہیں بلکہ آسمان میں ملت مغفور لہا کی زندگی ہے۔[۱۷]

چنانچہ یوحنا نے اپنے مشہد میں جس نئے یروشلم کو دیکھا اس سے کیا مراد ہے؟ جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ درج ذیل ہے:

(۱) نیا یروشلم یقیناً مسیحی ہے، اس کا تعلق مستقبل سے ہے اور تصوراتی ہے۔

(۲) نیا یروشلم سے مراد نہ یروشلم ہے نہ یروشلم کی تجدید بلکہ یہ خالصتاً تشبیہی اور تمثیلی ہے۔

(۳) نئے آسمان اور نئی زمین سے جہاں مراد اسی زمین کا تمام آلائشوں اور خرابیوں سے

کلیتاً پاک ہو جاتا ہے وہیں نئے یروشلم سے مراد دین اللہ کا اس روئے زمین پر از سر نو قائم ہو جانا ہے اور اسی تناظر میں بیت اللہ کا حرم خالص ہو جانا۔

## حصہ سوم: حادثہ، سازش اور المیہ

موجودہ عیسائیت تاریخ انسانی کی ایک غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثہ کا نتیجہ ہے۔ اس غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثے کی تفہیم کے لیے ایک تشبیہ دینی ضروری ہے۔ وہ تشبیہ درج ذیل ہے:

لاقانونیت، فساد اور افراتفری کی صورت حال میں ایک قافلہ جو بچوں، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں اور چند مردوں پر مشتمل تھا ـــــ جو ایک حادثے کے نتیجے میں اپنے قافلہ سالار سے بچھڑ گیا تھا اور اس بتائے ہوئے نقشے کے مطابق جو اس قافلہ سالار نے وہاں سے اس لیے بھیجا تھا جہاں وہ اس وقت مقیم ہے تاکہ قافلہ اس نقشے میں بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس سے آملے ـــــ جا رہا تھا کہ اچانک جنگل میں منظم رہزنوں نے حملہ کر کے ان کا سارا سامان لوٹ لیا جس میں وہ نقشہ بھی تھا اور انہیں بھی اذیت دے کر اس لق ودق صحرا میں چھوڑ دیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جو کچھ ان کی یادداشت میں قافلہ سالار کا نقشہ رہ گیا تھا اس کے سہارے اس جنگل سے نکل سکیں کہ رہزنوں کے اسی طائفے کے دوسرے جتھے نے انہیں گھیر لیا اور نہایت ہمدرد بنتے ہوئے اور معصومانہ لب ولہجہ میں گفتگو کرتے ہوئے انہیں غلط راستوں کی نشاندھی کی ـــــ لیکن معصومانہ طور پر بتائی جانے والی راہ دراصل وہ راہ تھی جو اس ملک کی جانب جاتی تھی جہاں پکڑے ہوئے غلاموں کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ ان رہزنوں کا ارادہ تھا کہ ان کو وہاں لے جا کر بیچ دیا جائے۔

یہ ہے وہ تمثیل جو اس غیر معمولی، عدیم المثال اور دردناک حادثے کی دی جا سکتی ہے۔ یہ قافلہ جو بچوں، بوڑھوں، عورتوں، معذوروں اور چند مردوں پر مشتمل ہے عیسائی ہیں۔ اور ان کے قافلہ سالار حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ رہزن یہودیت ہے۔

اس دردناک حقیقت پر سب سے جامع تبصرہ قرآن نے فرمایا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

ولا الضالین (الفاتحہ)

ترجمہ: اور نہ (جو) بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہاں بھٹکے ہوئے کے تین معانی لیے جاسکتے ہیں:

(۱) حالت فاعلی میں: وہ جو اپنے ارادے اور سہو سے بھٹک گئے۔

(۲) حالت عام: جن سے راہ گم ہو چکی ہے اور صحیح راہ کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔

(۳) حالت مفعولی: جو غلط راہ پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثالیں ہیں کہ حالت فاعلی کو حالت مفعولی پر محمول کرتے ہیں۔ مثلاً : لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم۔[۱۸]

(۴) حالت لاعلمی: جنہیں معلوم نہیں کدھر جانا ہے۔

جہاں تک چوتھی حالت کا سوال ہے تو اس کا اطلاق عیسائیت پر نہیں ہوتا۔ عیسائیت کی گہرائیوں سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے کم از کم مبشرہ حواریین پر پہلی صورت یعنی حالت فاعلی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی بات کسی درجے میں پوری عیسائی تاریخ میں عیسائی مخلصین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

اب رہی دوسری اور تیسری صورتحال کی بات تو ان دونوں صورت حال میں صرف زاویئے کا فرق ہے کوئی جوہری فرق نہیں۔ اور قرآن کا اشارہ اسی جانب ہے۔ واللہ اعلم۔

عیسائی تاریخ میں "راہ کا گم ہونا" یا "غلط راہ پر ڈال دیا جانا" کوئی معمولی حادثہ نہیں بلکہ تاریخ انسانی کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے، جس کا ہر باب دردناک ہے (اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی، مقصدی صورت حال میں آئے گی)۔ اس دردناک واقعہ کی تفہیم کے لیے ایک اور تمثیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ذیل میں دی جاتی ہے:

حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد دین عیسیٰ ایک عدیم المثال بحرانی کیفیت سے دوچار کردی گئی۔ وہ بحرانی کیفیت یہ تھی کہ پطرس کے دل کو بچانے کی صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ پطرس کے مرتے ہی اسے کسی کے جسم میں آپریشن کر کے لگادیا جائے۔ بحران کی ایک انتہا یہ تھی کہ اگر چند ثانیوں کے اندر اسے نہ لگایا جائے تو وہ دل ہمیشہ کے لیے مر جاتا۔ اور دوسری طرف بحران کی دوسری انتہا یہ تھی کہ اس چند ثانئے میں جس کا جسم میسر آسکا تاکہ پطرس کا وہ دل اس جسم میں لگایا جاسکے تو وہ جسم پال کا تھا۔ چونکہ اس دل کا بچانا

ضروری تھا اس لیے پطرس کا دل پال کے جسم میں لگا دیا گیا۔"

سن ۶۴ عیسوی کے بعد عیسائیت ایک ایسا فرد ہو گئی جس کا جسم پال کا ہو اور دل پطرس کا۔ عیسائیت کے لیے دونوں طرف موت تھی۔ دل کو جسم سے یا جسم کو دل سے الگ کرنے کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

دین عیسیٰ پطرس کا دل ہے۔ پال کا جسم یہودیت ہے جس نے عیسیٰ کو مصلوب کیا۔ عیسائیت کی یہی وہ دردناک مجبوری ہے جس کے خون سے اس کی تاریخ رنگین ہے۔

لیکن پطرس کا دل پال کے جسم میں مجبور، مقید اور بے بس ہونے کے باوجود زندہ رہا اور اس جسم سے نکلنے کی راہ ڈھونڈھتا رہا۔ ادھر پال کا جسم بھی بے خبر نہیں تھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس دل کو اپنے بندھنوں سے آزاد ہونے نہیں دیا یہی کشمکش عیسائیت کی تاریخ ہے۔ عیسائیت مجبور ہے کہ پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کے لیے پال کے جسم کو غذا فراہم کرے اس لیے کہ پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کی صرف ایک صورت ہے کہ پال کا جسم زندہ اور توانا رہے۔ عیسائیت یہ بھی جانتی ہے کہ پال کے جسم کا زندہ اور توانا ہونا پطرس کے دل کو مقید رکھنے کے زیادہ اہل ہوگا۔ لیکن مجبوری یہی ہے کہ خود پطرس کے دل کو زندہ رکھنے کے لیے پال کے جسم کا زندہ ہونا ضروری ہے۔

عیسائیت خوب جانتی ہے کہ پطرس کے دل کو پال کے جسم سے صرف ایک ہی ذات نجات دلا سکتی ہے اور وہ ذات خود حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے۔ جو آنے والے ہیں۔ چنانچہ اس روز سعید کے انتظار میں عیسائیت پطرس و پال دونوں سے ہم آغوش ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں کہ پطرس کا دل اور پال کے جسم میں تصادم نہیں ہوتا۔ تصادم ہوتا ہے اور یہی وہ تصادم ہے جس نے عیسائیت کے اندر دو قسم کے سفروں کو جنم دیا ہے۔ یہ دو قسم کے اسفار عیسائیت میں ہرگز پائے نہیں جاتے اگر پال کی یہودیت کے جسم میں پطرس کے اسلام کا دل مر چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پطرس کے اسلام کا دل زندہ رہا اور متحرک رہا ہے جس نے دو قسم کے سفروں کا غیر منقطع سلسلہ شروع کیا۔ ان میں ایک سفر طبعی تھا اور دوسرا روحانی۔

طبعی سفر جسم کی بقا کے لیے تھا جس میں پطرس کے دل اور پال کے جسم کی طبعی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرا سفر پطرس کے دل کے اندر اسلام کا اصلی سفر ہے جس کی صرف

روحانی صورت ہی ممکن تھی۔

اس روحانی سفر کی زاد راہ رہی اللہ رب العزت، حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم سے محبت۔ عیسائیت کی یہی وہ عدیم النظیر پونجی اور سرمایۂ حیات ہے جس سے وہ اب تک زندہ ہے۔ اور اسی کے سہارے شاید کل وہ آزاد ہو پائیں۔ یہی سفر ہے جو کبھی (Passion) کے نام سے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس روحانی سفر میں پطرس کے اسلام کا دل پال کی یہودیت کے جسم سے حضرت مسیح کی طرف سفر کر رہا ہے۔ یہی وہ سفر ہے جس پر چلنے کا عزم نوفل نے کیا تھا اور نجاشی نے کر دکھایا۔ اور بہت ممکن ہے کہ بہت سی سعید روحیں عیسائیت میں ایسی ہوں گی جو یہ سفر آج بھی کر رہی ہوں۔ ممکن ہے ان میں وہ خوش قسمت بھی ہوں جن کی خوش بختی آسمان کی بلندیوں کو چھونے والی ہو اور وہ ان میں شامل ہوں جو حضرت عیسیٰ کا استقبال کریں۔

لیکن عام حالات میں ایسا لگتا ہے کہ عیسائیت کے جسم کی وہ ثنویت (Dualism) اس وقت تک برقرار رہے گی۔ جب تک کہ خود حضرت عیسیٰ ابن مریم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام تشریف نہ لے آئیں اور خود اس کا فیصلہ نہ کر دیں۔ اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ جو بے پناہ محبت اور جاں نثاری ہر عیسائی کے دل میں حضرت عیسیٰ ابن مریم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے لیے پائی جاتی ہے اور جس طرح ان کے دل ان کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب ہیں جب وہ تشریف لے آئیں گے تو ایک آن میں یہ سب اپنی موجودہ حالت سے ہجرت کر جائیں گے اور حضرت عیسیٰ کے قدموں میں ہوں گے اور ان کی بات ان کے سر آنکھوں پر ہو گی۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے:

فیکسر الصلیب۔

آپ صلیب کو توڑ دیں گے۔

بلاشبہ کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ سے ملیں گے اور ان کا اتباع کریں گے لیکن ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ لوگ ہیں جن کو ان کی آمد سے قبل ان کے استقبال کی نعمت نصیب ہو۔ طلقاء سے بہر حال ہجرت کرنے والے افضل ہوتے ہیں۔

عیسائیت کے اندرون میں اس کے جسم کے طبعی سفر کے علاوہ یہی وہ روحانی سفر ہے جو

دیگر مختلف راستوں سے ہو تا رہا ہے۔ عیسائیت میں پطرس کے دل کے اسلام کی یہی بے چینی تھی جو بظاہر لا علمی میں کبھی اس راستے کی جانب کبھی اس راستے کی جانب بھٹک رہی تھی۔ یہ مسافر بظاہر بھٹک رہا تھا مگر باطن اس کے اندر اس کے راہ کے پانے کی تڑپ اور آرزو تھی جو راہ حضرت مسیح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام تک جاتی ہے۔ اس لیے اس سفر میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں وہ ٹھوکر بھی کھائے، گرے بھی اور غلط راہوں میں دور تک بھی چلے گئے مگر ان سب کے باوجود ان میں پطرس کا دل دھڑکتا رہا۔ یہی وہ بات ہے جسے اپنے الفاظ میں بابائی مطالعات (Patristic Studies) کو مہمیز کرتے ہوئے پوپ پال ششم نے کہی تھی:

"We particularly wish to emphasize at this turn the fact that return to the Fathers of the Church is, infact part of the return to Christian Sources.....

"To prove this convincingly, it is enough to recall the special function exercised by the Fathers in the Church. Witness of the faith of the early centuries, they hold a vital place in the Tradition that stems from the Apostles. 'The assertions of the Holy Fathers, as the Council points out, 'bear witness to the living presence of this Tradition whose richness is transfused into the life and Practice of the Church which believes and prays' *(Const. Dei Verbum, no 8.)* It is therefore easy to understand how necessary is the study of the Fathers for a more profound understanding of Holy Scripture, and how decisive for the Church is their agreement upon its interpretation. The Encyclical *Divino Afflante Spirite* recalls that even though the Fathers were 'sometimes less well-informed in profane science and linguistic studies than the interpreters of our day,nevertheless, on account of the duty in the Church which God had committed to them, they excel in the calm penetration of heavenly things and in a sharpness of thought which deeply probes the

depth of the divine words.

"They further possessed a richly abundant treasure of the Christian spirit derived from their personal holiness, in their school of Faith they were not content simply with intellectual elucidation but were also intent upon the mystical sense. As the great Bossuet pointed out, their works 'produce wonderful fruit in anyone who studies them, because when all is taken into account, these great mer are nourished with the true food of the elect, with the pure essence of religion, and since they are, so to speak, saturated with the primitive spirit which they have more directly and more abundantly drawn from the same source, it not frequently happens that what springs in all its natural freshness from their plenitude is more nourshing than what comes later after mature thought and reflection' -- *(Defense cle la Tradition/et des Saints Peres, I partie, L. IV. C. XVIII)*

"For these reasons, it cannot be doubted that more profound and systematic Patristic Studies can afford an immeasurable help to theological renewal in this Post-Conciliar period.....

(Rome, May 4, 1970) [۱۹]

ترجمہ: ہم لوگ، بطور خاص اس موقع پر اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کلیسیا کے آبا کی طرف واپسی دراصل عیسائی منابع کی طرف واپسی ہے۔

یقین ہو جانے کی حد تک اسے ثابت کر دینے کے لیے یہ یاد دلانا کافی ہو گا کہ کلیسیائی آبا نے کیا خدمات انجام دیئے۔ ابتدائی صدیوں میں ایمان کی شہادت دینا ان کی وہ خدمت ہے جس کے تسلسل کا روایت کے اعتبار سے بنیادی مقام ہے اس لیے کہ وحی اس روایت کو مرسلین (Apostles) سے مربوط کرتے ہیں۔ ان مقدس آبا کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے کونسل نے اس طرح بیان کیا ہے: مقدس آبا کی کوششیں روایت کی زندہ موجودگی کی شہادت ہیں جن کی حقیقتیں کلیسیائی زندگی اور عمل کی صورت میں ڈھل سکیں جو ایمان اور عبادت کی علامت ہے۔ (Const: Dei

(Verbum, No.8.)۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا نہایت آسان ہے کہ آبا کا مطالعہ مقدس صحائف کے درک کے لیے کتنا ضروری ہے اور کلیسیا کے لیے ان کا اتفاق واجماع ان کی تعبیر کے لیے کتنا فیصلہ کن ہے۔ ہدایت نامہ Divino Afflante Spirite میں اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے: ہر چند کہ آبا غیر دینی علوم اور لسانیات کے معاملے میں بعض اوقات عہد حاضر کے مفسرین کے مقابلے میں نسبتاً کم واقفیت رکھتے تھے لیکن اس فرض منصبی کی وجہ سے جو خدا نے کلیسیا کے تعلق سے ان پر عاید کیا تھا وہ خاموشی سے آفاق وانفس کی گہرائیوں میں اتر جانے کے زیادہ اہل تھے اور ان کا تخیل زیادہ تیز تھا جو ربانی الفاظ کی گہرائیوں کو پالیتا تھا۔

مزید ازیں وہ اپنے ذاتی تقدس کے سبب عیسائی روحانیت کے خزانے کے وافر حصے سے فیض یاب تھے۔ اپنے عقاید میں وہ محض عقلی ترفع کے حامل نہ تھے بلکہ انہیں روحانی مذاق بھی حاصل تھا۔ عظیم بوسے (Bousuet) نے اسی لیے لکھا ہے کہ ان (آبا) کی تصنیفات اپنے قارئین کے اندر حیرتناک بار آوری کرتی ہیں۔ چنانچہ جب تمام چیزوں کا احاطہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکابر اس 'منتخب' کی روحانی غذا کے اصل پروردہ تھے۔ انہیں دین کا مغز مل گیا تھا اگر ایسا کہا جائے کہ یہ حضرات چونکہ اصلی روح سے سیر ہو چکے تھے جسے انہوں نے وافر مقدار میں اور بلاواسطہ اصل منبع سے حاصل کیا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس ذریعہ سے قدرتی طور پر زیادہ تازہ چیز حاصل نہ ہو بمقابلہ اس ذریعہ کے جو ہر چند کہ زیادہ بالیدہ فکر اور تدبر کا نتیجہ ہے لیکن بہر حال بعد میں نمو پذیر ہوا ہے۔ (Defense de la Tradition et des Saints - (Peres, 1 Partie!

ان اسباب سے، اس میں شک نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مزید آبائی مطالعات ما بعد کیفسلیر عہد میں دینیات کی تجدید کے لیے بے حد وحساب مدد کا باعث ہوگا۔

(روم مئی ۴، ۱۹۷۰)

یہودیت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اوّل سے کبھی بھی غافل نہیں رہی۔ وہ ہمہ دم مصروف رہی کہ حضرت مسیح، ان کی دعوت اور ان کے پیغام کو صفحۂ ہستی سے مٹادے۔ اپنی سمجھ کے مطابق یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب دینے کے بعد بھی خاموشی اور بے خبر نہیں رہے۔ انہوں نے طرح طرح سے کوششیں کیں کہ حضرت عیسیٰ کا ہر پیغام اور اس کے معتبر حاملین صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں۔ کبھی انہوں نے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان میں

گمراہیاں پیدا کیں کبھی عام انسانی فطرت کے مطابق پیدا ہونے والے جھگڑوں یا اختلافات یا غلط فہمیوں کو جو کسی بھی انسانی اجتماعیت کا خاصہ ہیں ہوا دے کر رائی کا پہاڑ بنا دیا تاکہ عیسائیت کی رہی سہی قوت آپسی مناقشوں کی نذر ہو کر تباہ ہو جائے۔ یہی وہ عمل ہے جسے عیسائیت کی تاریخ تفریق (Schism) کے نام سے جانتی ہے۔[۲۰]

چنانچہ یہ ایک سلسلہ ہے جو پہلی صدی عیسوی سے مسلسل جاری ہے۔ لیکن اس میں سب سے بڑا زلزلہ اس وقت آیا جب ۱۰۵۴ء میں روم اور قسطنطنیہ کے اکابر نے ایک دوسرے کو عیسائیت سے خارج کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں پوپ پال ششم (Pope Paul VI) اور بطریق اتھے ناگورس (Patriarch Athanagoras) نے باہمی اخراج کے ان فتاویٰ یا تکفیری فتاویٰ (Anathemas) کو رد کر دیا۔ ۱۰۵۴ کا یہ عمل اپنے اندرون میں یہودیت کی حضرت عیسیٰ کی تلاش میں سرگرداں اس قافلے پر ضرب تھا تو ۱۹۶۵ء کا عمل پطرس کے اسلام کا جواب تھا پال کو۔ لیکن ۱۰۵۴ کے ضرب سے یہودیت مطمئن نہیں تھی۔ چنانچہ یہودیت نے حضرت عیسیٰ کے اس بھٹکتے ہوئے قافلے پر اب تک کی سب سے بڑی اور سب سے کاری ضرب لگائی۔ یہی وہ کاری ضرب ہے جسے عیسائیت کی تاریخ مخالف اصلاح تفریق (Counter Reformation Schism) کہتی ہے۔ جس کا آغاز سیکولر تاریخ میں نشاۃ ثانیہ (The Renaissance) کہلاتا ہے۔ یہ ایک خالص یہودی سازش تھی۔[۲۱] بظاہر بہت سارے معقول نکات کے باوجود یہ تحریک یہودیت کی ایک گہری اور پیچیدہ سازش تھی جو رومن کیتھولک چرچ کے خلاف بالخصوص اور پوری عیسائیت کے خلاف بالعموم کی گئی تھی۔ اس نے دو نتائج پیدا کیے:

(۱) پورا آرتھوڈوکس چرچ بالعموم اور رومن کیتھولک چرچ بالخصوص اپنی جڑ سے ہل گیا۔ اور پوری عیسائی دنیا بنیادی طور پر تین بڑے حصوں میں منقسم ہو گئی اور ان میں کا ایک طبقہ پوری طرح یہودیت کی گود میں چلا گیا۔

(۲) یہودیت کی گود میں جانے والے طبقہ پروٹسٹنٹ کہلایا۔ جو بظاہر قائم چرچ کے خلاف صدائے احتجاج کی شکل میں سامنے آیا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ ایک یہودی سازش تھی۔ جس نے احتجاج کا طریقہ اختیار کیا۔ یہودیت نے فی الواقع "احتجاج" کا ایک ایسا جرثومہ پیدا کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔ چنانچہ اس کے درج ذیل نتائج برآمد ہوئے:

(۱) یہ جرثومہ احتجاج وہ تھا جس میں خلقی طور پر یہ صفت تھی کہ وہ ہر قائم اور موجود ـــــ صورت اور کیفیت کو رد کرتا تھا اور اس کے خلاف قولی اور عملی احتجاج کرتا تھا اور اس سے الگ ہو جاتا تھا۔

(۲) کسی قائم اور موجود صورت، کیفیت، عقیدہ، ادارہ، تنظیم، ثقافت اور نظریہ کے خلاف قولی اور عملی احتجاج کرکے اور اس سے الگ ہو جانے کے بعد وہ خود جو صورت، کیفیت، عقیدہ، ادارہ، تنظیم، ثقافت اور نظریہ قائم کرتا تھا وجود پانے کے بعد چونکہ وہ قائم اور موجود کے درجے میں آچکے ہوتے تھے لہٰذا اس کے اندر کا جرثومہ اس کے خلاف پھر قولی اور عملی احتجاج کرتا تھا۔

(۳) چنانچہ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گیا جو یہودیت نے حضرت عیسیٰ کے قافلے میں شروع کروایا۔ وہ پروٹسٹنٹ جو سولہویں صدی میں احتجاج کرتے ہوئے رومن کیتھولک چرچ سے الگ ہو گئے تھے اب تک خود احتجاج در احتجاج کے طور پر کم از کم ۵۰۰ طبقوں میں منقسم ہو چکے ہیں۔

(۴) یہ سارے پروٹسٹنٹ بڑی عجیب کیفیت کے حامل ہیں۔ پروٹسٹنٹ کے بارے میں اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ عقیدہ سے لے کر ثقافت تک کسی بھی بات پر جو موجود اور قائم ہو جائے تو ان کا اس پر اتفاق نہیں رہتا۔ تاہم صرف اور صرف ایک بات ایسی ہے جو ان کے ہر گروہ میں ہمیشہ سے مشترک چلی آتی ہے اور وہ ہے یہودیت، اس کے صحائف، اس کے عزائم، اس کے رسوم اس کے جذبات سے قربت اور اس کی قدردانی۔

"احتجاج" کے اس جرثومے کا ادخال حضرت مسیح کے بھٹکے ہوئے قافلے پر یہودیت کی کاری ترین ضرب تھی۔ جس نے بلاشبہ عیسائیت کے جوڑ جوڑ کو ڈھیلا کر دیا۔ لیکن دوسری طرف دوسرے ویٹیکن کونسل (Second Vatican Council) نے اپنے دو فیصلوں کے ذریعہ یہودیت کو جواب دیا ہے۔ یہ جواب دراصل پطرس کے دل کا جواب ہے۔ یہ دو فتاوے ہیں:

**(1) Vatican II, Lumen Gentium, 21 November 1964**
**"Dogmatic Constitution on the Church"**

اس فتویٰ کی دفعہ 8 کا آغاز یوں ہوتا ہے:

The one mediator, Christ, established and ever sustains here on earth his holy Church, the

community of faith, hope and charity, as visible organization through which he communicated truth and grace to all men. But the soceity structured with hierarchical organs and the mystical body of Christ, the visible society and the spiritual community, the earthly Church and the Church endowed with heavenly riches, are not to be thought of as two realities.....

ترجمہ

واحد شفاعت کرنے والے ـــــ مسیح ـــــ نے اس روئے ارض پر اپنی کلیسیا، اہل ایمان کے گروہ، امید اور صدقہ کو قائم فرمایا اور اس کی برقراری کی ہمیشہ کوشش کی تاکہ وہ ایک مرئی ادارے کی طرح باقی رہیں جس کے ذریعہ اس نے حق اور رحم کو انسانوں تک پہنچایا۔ لیکن تدریجی اعضاء پر مشتمل معاشرۃ اور مسیح کا روحانی جسم ـــــ یعنی مرئی معاشرہ اور روحانی برادری زمینی کلیسا اور اصلی کلیسیا کو جس پر آسمانی برکات کا نزول ہے دو الگ حقائق کے اعتبار سے نہیں لیا جا سکتا۔

یہ فتویٰ اس طرح اختتام کو پہنچتا ہے:

"The Church, "like a stranger in a foreign land, presses forward amid the persecutions of the world and the consolations of God," announcing the cross and death of the Lord until he comes (Cf.1.Cor 11:26) ..... [۲۲]

ترجمہ: کلیسیا ـــــ کسی اجنبی ملک میں اجنبی کی طرح ـــــ دنیا کے مظالم اور خدا کی تسلیوں کے مابین جب تک اس کی آمد ہو آقا کے صلیب اور موت کے اعلان پر زور دیتا ہے۔

اور دوسرا فتویٰ ہے:

(2) Vatican II, Unitatis Redintegratio, 21 November 1964. "Decree of ecumenism"

اس فتویٰ کی دفعہ ۳ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"In this one and only Church of God from its very beginnings there arose certain rifts, which the Apostle strongly censures as damnable. But in

subsequent centuries much more serious dissensions appeared and large communities become separated from full communion with the Catholic Church -- for which, often enough, men of both sides were to blame.

ترجمہ: اپنی ابتداء سے خدا کی اس ایک اور واحد کلیسیا میں بعض تفریق پیدا ہوئیں جسے مرسلین نے شدت سے قابل مذمت قرار دیا۔ لیکن بعد کی صدیوں میں مزید سنگین اختلافات ظاہر ہوئے اور کیتھولک کلیسا کی اجتماعیت سے بڑے بڑے گروہ الگ ہو گئے جس کے لیے اکثر دونوں طرف کے لوگ ذمہ دار تھے۔

یہ دفعہ ان الفاظ پر اختتام کو پہنچتی ہے:

"It was to the apostolic college alone of which Peter is the head, that we believe that our Lord entrusted all the blessings of the New Covenant, in order to establish on earth the one Body of Christ into which all those should be fully incorporated who belong in any way to the people of God. During its pilgrimage on earth, this people, though still its members liable to sin, is growing in Christ and is guided by God's gentle wisdom, according to his hidden designs, until it shall happily arrive at the fullness of eternal glory in the heavenly Jerusalem." [۴۳]

ترجمہ: یہ صرف وہ دائرۂ مرسلین ہے جس کے قائد پطرس ہیں ـــــ جو ـــــ ہمارا عقیدہ ہے کہ ـــــ ہمارے آقا (حضرت عیسیٰ) کے ذریعہ اس کا مجاز بنایا گیا ہے اور جسے نئے میثاق کے برکات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ روئے ارض پر مسیح کا وہ واحد جسم میں قائم کرے جس میں وہ تمام لوگ پوری طرح شامل کیے جا سکیں جو کسی بھی اعتبار سے خدا کے لوگ ہیں۔ روئے ارض پر اس سفر کے دوران یہ لوگ جو اگرچہ گناہ گار ہو سکتے ہیں ـــــ مسیح میں افزائش پا رہے ہیں یہ خدا کے مہربان حکمتوں سے ہدایت یاب ہیں جو اس کے پوشیدہ منصوبے کے عین مطابق ہے۔ یہ صورت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک وہ وقت نہ آجائے جب لافانی عظمت آسمانی یروشلم کی صورت میں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جائے۔

یہودیت کے حملے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھٹکے ہوئے قافلے پر جاری ہیں اور پطرس کا دل مقید ہو کر بھی اس کا مقابلہ کر رہا ہے۔ چنانچہ مارچ ۲۰۰۰ کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا ہی حملہ ـــــ یہودیت نے اس وقت کیا جب موجودہ پوپ جان پال II فلسطین کے دورے پر تھے۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ۶۰ لاکھ یہودیوں کے نام نہاد قتل کی یاد میں بنائی گی یادگار یدو شیم (Yad wa Shem) کی زیارت کریں اور پوری تاریخ میں عیسائیوں نے یہودیوں کو جو مبینہ طور پر ستایا ہے اس پر پوری عیسائی قوم کی طرف سے معافی مانگیں۔ بوڑھا، کمزور، جھکی کمر اور لڑکھڑاتا ہوا پطرس کی لاٹھی کا حامل چرواہا ـــــ پوپ جان پال II نے اپنی روایتی اندرونی مضبوطی کا ثبوت دیتے ہوئے اس نازک وقت میں بھی اپنے موقف پر جما رہا جب چاروں طرف سے یہودی زعما اسے نوچ کھانے کو تیار تھے۔ اس نے نہایت صبر و سکون سے ہر پہنچنے والے دکھ پر افسوس کیا اور صرف اتنا کہا:

"یہودی اہل میثاق ہیں"

Jews are the people of Covenant."

یہ تھا پطرس کا جواب یہودیت کو۔

حضرت مسیح علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کی تاریخ کی حقیقت کیا ہے؟

اس قوم کی تاریخ اور اس کی سب سے بڑی حقیقت ہے:

وہ غیر منقطع اور مسلسل سفر جو ایک حادثے کے بعد ـــــ عیسائیت ـــــ یہودیت سے دین مسیح علیہ السلام کی طرف کر رہی ہے۔ عیسائیت اپنی لٹی ہوئی پونجی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہی وہ سفر ہے جو انشاءاللہ اس دن ختم ہو جائے گا جب جلالت مآب حضرت عیسیٰ ابن مریم مسیح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام خود تشریف لے آئیں گے اور اپنی بھیڑوں کو جسے یہودیت دو ہزار سالوں سے ساری دنیا میں ہانکتی پھر رہی ہے جمع فرمائیں گے اور ان کے چہروں کے گرد و غبار پونچھ ڈالیں گے یہی وہ تاریخی سفر ہے اور اسی پر حضرت مسیح اور اللہ تعالیٰ کا وہ مکالمہ شاہد ہے جسے قرآن نے یوں درج کیا ہے:

"اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ "سبحان اللہ، میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو

ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔ آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے۔ اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔ تب اللہ فرمائے گا "یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے یہی بڑی کامیابی ہے۔"

(المائدہ: ۱۱۶۔۱۱۹)

○○

# باب سوم

# حقیقت دجال

"عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال ـــــ محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون" میں میں نے لکھا تھا:

"معرکۂ خیر وشر کا واقعی (Virtual) خاتمہ دراصل ابلیس کے اعتراض کا واقعتاً (Virtually) رفع ہونا ہے۔ لیکن وصال آنحضور ﷺ سے قیامت تک کی مدت دراصل معرکۂ خیر وشر کے اصلی (Actual) خاتمہ کی مدت ہے۔ قیامت کا برپا ہونا دراصل ابلیس کے اعتراض کے رفع ہونے اور اس کی شکست کا اعلان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک قیامت برپا نہیں کر سکتا جب تک ابلیس اصلاً (Actually) اپنے اعتراض میں غلط ثابت نہ ہو جائے۔

چنانچہ آنحضور ﷺ کی وفات ہی دراصل اقامت قیامت کا اعلان اور اس کی پہلی اور سب سے بڑی علامت تھی۔ یہی وفات واقعتاً (Virtually) ظہور دجال کی شروعات ہے۔ دجال ابلیس کا وہ آخری اور خوفناک ترین حربہ ہے جسے وہ مذکور دو جہتوں سے حاصل کر سکا ہے۔ دجال ابلیس کی وہ تخلیق ہے جسے اس نے مقبوض علم الاسماء اور مخطف علم الوحی سے تیار کیا ہے۔ اس سے بڑا ابلیس کے پاس کوئی حربہ نہیں۔ دجال ابلیس کے ترکش کا آخری تیر ہے۔ لیکن وہ ہار چکا ہے۔ اللہ نے اپنے نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت فرما دی ہے اور اس نبی آخری الزماں ﷺ نے اقامت دین کا کام انجام دے دیا لیکن ابلیس دجال کو ان کے خلاف استعمال کر کے انہیں روک نہیں سکا۔ جس آدم کو حیات الجنۃ میں ابلیس نے علم الاسماء کا سہارا لے کر گمراہ کر دیا تھا اور اسے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی سے روک دیا تھا اسی آدم کو جس کی ذریت میں اب نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام ہوئے حیات ارضی میں نہ گمراہ کر سکا نہ روک سکا۔ ابلیس اس قدر حواس باختہ ہو گیا کہ اسے اپنے آخری اور خوفناک ترین حربہ دجال کے استعمال کی ہمت تک نہ ہو سکی۔ اس طرح اس نے واقعتاً (Virtually) شکست تسلیم کر لی لیکن اللہ تعالیٰ اس پر اپنی حجت پوری کرے گا۔ لہٰذا اس کا واقعتاً

(Virtually) شکست تسلیم کرنا کافی نہیں سمجھا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اصلاً (Actually) شکست سے دوچار کر کے اس کے اعتراض کو اصلاً (Actually) رفع کرے گا۔

آنحضور ﷺ کی وفات حسرت آیات سے آج تک زمین پر معرکۂ خیر و شر دراصل واقعیت (Virtuality) سے اصلیت (Actuality) کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس سفر میں مشیت الٰہی ابلیس کو واقعیت (Virtuality) سے اصلیت (Actuality) کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مشیت الٰہی ابلیس کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے آخری تیر دجال کو اصلاً (Actually) ظاہر کرے تاکہ اس پر حجت پوری ہونے میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کسر باقی نہ رہ جائے جس کا وہ سہارا لے کر اپنا دعویٰ پیش کر سکے۔

اکیسویں صدی عیسوی ظہور دجال کی صدی معلوم ہوتی ہے۔ یہی معرکۂ دجال کی بھی صدی معلوم ہوتی ہے۔ یہ معرکۂ دجال معرکۂ علم ہے۔ دجال علم الاسماء مقبوض در علم الوحی مخطف سے بنایا گیا ایک غیر معمولی حربہ ہے۔ یہ معرکہ صحیح و صالح علم الاسماء اور صحیح و خالص علم الوحی اور مقبوض علم الاسماء اور مخطف علم الوحی کے مابین ہے۔" [1]

## تین حقائق

قیامت سے قبل اس آخری اور سب سے ہولناک معرکے، اس کی وسعت اور اس کی حقیقت کے سمجھنے کے لیے چند دیگر حقائق کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ ہر چند کہ ان میں سے ہر ایک عنوان الگ الگ تفصیل سے بیان کیے جانے کا متقاضی ہے جس کی اس وقت کے نازک حالات میں گنجائش نہیں لہٰذا یہاں ہم صرف ضروری پہلوؤں سے ہی تعارض کریں گے۔ مذکورہ حقائق جن کا پیش نظر رہنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اور اس کے ذریعہ خلق کردہ کائنات امر اور کائنات خلق

(۲) ابلیس، الشیطان وغیرہم اور ان کی حقیقت اور

(۳) معرکۂ خیر و شر

# حقیقت اوّل

## اللہ تعالیٰ اور اس کی کائنات

'ماکان ومایکون' میں صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۰ میں مذکور چار عوالم کی بحث کو ہم ایک دوسرے زاویئے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ زاویہ ہے کائنات کی حقیقت اس کے خالق کے اسماء کے اعتبار سے۔ اس اعتبار سے کائنات چار مدرج پر منقسم ہے۔

(۱) پہلا مدرج: کائنات کا پہلا مدرج عالم اصل ہے۔ اس عاجز نے کائنات کے پہلے مدرج کو عالم اصل لکھا ہے لیکن اسے نہیں معلوم یہ پہلا مدرج 'عالم' ہے یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس عاجز نے یہاں اصل کے ساتھ عالم صرف اس لیے لکھا ہے کہ اس کے بعد بیان کیے جانے والے تین عوالم سے اسے ایک صوتی مناسبت ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ 'اس' کو جسے یہاں 'عالم' کہا گیا ہے اصل کہنا بھی چاہئے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں میرے علم کی حد تک اس لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ وہی 'عالم' ہے جو غالباً اس آیت میں 'عند' سے پرے مذکور ہے۔

فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر (القمر:۵۵)

ترجمہ: سچی بیٹھک میں نزدیک مقتدر بادشاہ کے۔

سچی بیٹھک کے قریب جو "عالم" ہے وہی "عالم اصل" ہے۔ یہ وہ عالم اصل ہے جہاں صرف اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں۔ اور ان میں بطور خاص درج ذیل کا ظہور تام سمجھ میں آتا ہے۔ "سمجھ میں آتا ہے" کا مفہوم یہ ہے کہ عالم خلق کے کسی فرد کی سمجھ میں آتا ہے ورنہ وہاں تو اللہ تعالیٰ کے کل اسماء حسنیٰ کا ظہور تام ہے۔ یہ اسماء ہیں:

(۱) ھو :

یہ وہی 'ھو' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) ھو اللہ الذی لا الہ الا (ھو) (الحشر:۲۲)

ترجمہ: وہ اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں مگر وہ

(۲) (هو) الرحمن الرحيم (الحشر:۲۲)

ترجمہ: وہ الرحمٰن الرحیم

(۳) الله لا اله الا (هو) (البقرہ:۲۵۵)

ترجمہ: اللہ، نہیں ہے الٰہ مگر وہ

(۴) الم! الله لا اله الا (هو) الحى القيوم (آل عمران:۱-۲)

ترجمہ: الم! اللہ، نہیں ہے الٰہ مگر وہ الحی القیوم

(۲) اللہ :

یہ وہی 'اللہ' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) (الله) لا اله الا هو (البقرہ:۲۵۵)

ترجمہ: اللہ نہیں ہے الٰہ مگر وہ

اسی طرح دیگر مقامات پر مثلاً سورۂ اخلاص آیت:۱، اور الحشر:۲۲ میں مذکور ہے۔

(۳) الحی :

یہ وہی 'الحی' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

(۱) الله لا اله الا هو الحى القيوم (البقرہ:۲۵۵)

ترجمہ: اللہ، نہیں ہے الٰہ مگر وہ الحی القیوم

(۲) الم ! الله لا اله الا هو الحى القيوم (آل عمران:۱-۲)

ترجمہ: الم! اللہ نہیں ہے الٰہ مگر وہ الحی القیوم

اس کے علاوہ سورۂ غافر، الفرقان، طٰہٰ، میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

(۴) القیوم :

یہ وہی 'القیوم' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

(۱) هو الحى القيوم (البقرہ:۲۵۵)

ترجمہ: وہ الحی القیوم

(۲) هو الحى القيوم (آل عمران:۲)

ترجمہ: وہ الحی القیوم

(۳) وعنت الوجوہ للحی القیوم (طہ:۱۱۱)

ترجمہ: (کائنات کی تمام اشیاء کی حقیقت کے) چہرے متوجہ ہیں صرف اسی الحی القیوم کی جانب۔

(۵) ھواللہ :

یہ وہی 'ھواللہ' ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

(۱) (ھو اللہ) الذی لا الہ الا ھو (الحشر:۲۲)

ترجمہ: وہ اللہ جو کہ نہیں ہے الٰہ مگر وہ

(۲) (ھو اللہ) .....(الحشر:۲۳)

ترجمہ: وہ اللہ

(۳) (ھو اللہ) الخالق (الحشر:۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ الخالق

(۶) اللہ الصمد :

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ وہ اسم مبارک ہے جو قرآن میں صرف ایک بار مذکور ہوا ہے:

(۱) اللہ الصمد (الاخلاص:۲)

ترجمہ: اللہ بے نیاز ہے۔

(۷) مالک الملک :

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ بھی وہ اسم مبارک ہے جو قرآن میں صرف ایک بار مذکور ہوا ہے:

(۱) قل اللھم مالک الملک (آل عمران:۲۶)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے اے اللہ مالک ساری سلطنت کا۔

(۸) الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی جلالت کے اظہار کے لیے یہ وہ اسماء حسنیٰ کا مجموعہ ہے جو بیک وقت کئی اسماء کا مجموعہ بھی ہے اور تمام اسماء سے مل کر بنا ایک نام بھی ہے جو حضرت باری تعالیٰ کے شایان شان ہے۔ یہ اسم مبارک بھی قرآن میں صرف ایک بار بیان کیا گیا ہے۔

(۱) الملك القدوس السلم المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر (الحشر:۲۳)

ترجمہ: بادشاہ، پاک ذات سب عیبوں سے، سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا، زبردست، دباؤ والا، صاحب عظمت

غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں اسماء حسنیٰ کا یہ مجموعہ قرآن میں صرف ایک بار آیا ہے، وہیں اس کے اندر بعض اسماء بھی صرف ایک ہی بار اور اسی آیت میں مذکور ہوئے ہیں مثلاً: الجبار، المؤمن، المہیمن، المتکبر، اور السلام۔

(۲) دوسرا مدرج: کائنات کا دوسرا مدرج عالم بریہ ہے۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عالم خلق کا پہلا موجودہ مدرج عالم بریۃ ہے۔ یہ عالم بریۃ عالم اصل سے نیچے ہے۔ اور عالم اصل سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ اسی عالم سے خلق کا باضابطہ آغاز ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ کے جس اسم مبارک کی شان کا ظہور ہوا وہ الخالق البارئ ہے۔ جس کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

هو الله الخالق البارئ (الحشر:۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ! الخالق البارئ

یہی مدرج الکرسی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وسع كرسيه السمٰوٰت والأرض (البقرہ:۲۵۵)

ترجمہ: گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

سعادت اور شقاوت کے اعتبار سے یہی مدرج آخری فیصلہ کن مدرج ہے۔ چنانچہ اسی مدرج پر ہونے والا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جو بالآخر دائمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

**ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين فى نار جهنم خٰلدين فيها اولئك هم شر البرية. ان الذين آمنوا وعملوا الصٰلحٰت اولئك هم خير البرية.** (البینۃ:۶-۷)

ترجمہ: اور جو منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اس میں وہ لوگ ہیں البریۃ کے برے۔ وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے بھلے کام وہ لوگ ہیں البریۃ کے اچھے۔

یہی وہ مدرج ہے جہاں تک ارتقاء نفس کو نفس مطمئنہ میں بدل دیتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن

نے اس طرح کیا ہے:

**یایتها النفس المطمئنة ارجعی إلی ربك راضیة مرضیة۔**
**فادخلی فی عبدی۔ وادخلی جنتی** (الفجر: ۲۷۔۳۰)

ترجمہ: اے مطمئن جی! لوٹ آ اپنے رب کے پاس۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، اور داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہی وہ ذکر ہے جس کو سورۃ البینۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

**"رضی الله عنهم ورضوا عنه۔** (البینۃ:۸)

ترجمہ: اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔

یہ نفس مطمئنہ وہی نفس ہے کہ بالکل ابتداء میں جب اللہ رب العزت نے نفس انسان کو عالم اصل سے عالم بریۃ میں بنایا تو اسے ہی پیدا فرمایا۔ اس لیے قرآن اس نفس کے تعلق سے فرماتا ہے:

ارجعی۔

ترجمہ: لوٹ آ

رجعت وہیں ہوتی ہے جہاں سے انتقال ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نفس وہیں سے منتقل ہو کر عالم بریۃ میں موجود ہوا اس لیے اسے رجعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہی وہ نفس ہے جسے قرآن نے ممیز کرنے کے لیے نفس مطمئنہ سے پکارا ہے۔ یہی نفس تنک (TaNaK) میں نشمۃ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا:

(۱) نشمة خیم (براشیت:۲ آیت:۷)

ترجمہ: نفس حیات

(۲) نشمة شدی (ایوب:۳۲ آیت۸)

ترجمہ: نفس خدا

**(۳) تیسرا مدرج:** کائنات کا تیسرا مدرج 'عالم عصر' ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم خلق کا دوسرا موجودہ مدرج عالم عصر ہے۔ یہ عالم عصر عالم بریۃ سے نیچے ہے۔ اور اس عالم عصر کا عالم بریۃ سے ظہور ہوا۔ یہ عالم عصر ہی ہے جہاں سے خلق میں صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اسے عالم صورت بھی کہا جا سکتا ہے۔ تخلیق کی یہ وہ دوسری منزل ہے جہاں اللہ

تعالیٰ کی شان صورت گری کا ظہور ہوا جس کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

"هو الله الخالق البارى المصور" (الحشر:۲۴)

ترجمہ: وہ اللہ ہے بنانے والا نکال کھڑا کرنے والا، صورت کھینچنے والا۔

یہ وہی مدرج ہے جہاں اللہ رب العزت 'الخالق المصور' ہے۔ ظاہر ہے یہ الخالق المصور دراصل الخالق البارى کے بعد کی شان ہے۔ یہ مدرج صورت گری کا مدرج ہے۔ چنانچہ جب انسان عالم بریۃ سے عالم عصر میں منتقل کیا گیا تو اس کے وجود میں صورت پیدا ہوئی۔ اور وہ نفس جسے عالم بریۃ میں نفس مطمئنہ کہا گیا اس مدرج پر روح بن گئی۔ چنانچہ اسی صورت گری کے مراحل کا ذکر قران میں اس طرح کیا گیا ہے:

(۱) الذى احسن كل شئى خلقه وبدا خلق الانسان من طين ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين ثم سواه ونفخ فيه من روحه وجعل لكم السمع والابصار والافئده قليلا ما تشكرون. (السجدہ : ۹)

ترجمہ: جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش ایک گارے سے پھر بنائی اس کو اولاد نچڑے ہوئے مقوئی پانی سے پھر اس کا ڈھانچہ بنایا اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنا دیئے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو۔

(۲) واذ قال ربك للملائكة انى خالق بشرا من صلصال من حمإ مسنون. فاذا سويته ونفخت فيه من روحى فقعوا له سٰجدين. (الحجر:۲۸۔۲۹)

ترجمہ: اور جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے۔ پھر جب اس کو ڈھانچہ بنا دوں گا اور پھونک دوں گا اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

(۳) اذقال ربك للملائكة انى خالق بشراً من طين فاذا سويته ونفخت فيه من روحى فقعوا له سٰجدين. (ص:۷۱۔۷۲)

ترجمہ: جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھناتے ہوئے گارے سے۔ پھر جب اس کا ڈھانچہ بنا دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

قیامت اور بعث بعد الموت دراصل اسی عمل کی تکرار ہے۔ چنانچہ یہی عمل عالم بریۃ کو عالم صورت میں لاتا ہے اور پھر عالم صورت سے عالم بریۃ میں لے جاتا ہے۔ پہلے عمل سے بے صورت میں صورت پیدا ہوتی ہے اور دوسرے عمل سے وہ صورت بے صورت ہو جاتی ہے۔ اور تیسرے عمل سے پھر بے صورت صورت میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ عالم عصر کا یہ مرحلہ عالم بریۃ کے نیچے ہے۔ یہاں عالم بریۃ جو عالم عصر سے اوپر ہے اور وہ اس چوتھے عالم کا جس کا ذکر ان شاء اللہ کیا جائے گا جو عالم عصر سے نیچے ہے باہم ادغام ہوتا ہے۔ یعنی نفس مطمئنہ کا ادغام جسم کے ساتھ۔ چنانچہ نفس مطمئنہ کا ادغام جسم سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے نفس مزید کثیف کر دی جاتی ہے اور وہ روح میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ روح کا جسم سے ادغام یا اتصال ہوتا ہے اور جب عالم عصر کو بالکل فنا کرنا مقصود ہوتا ہے تو کلیتاً روح کا جسم سے الگاؤ کر دیا جاتا ہے اور جسم ختم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس دوران عالم عصر کی وہ کیفیت ہوتی ہے جو تین حالتوں پر مشتمل ہے:

(۱) کسی انسان کی پیدائش ارض سے پہلے روح اور جسم کے اتصال کی عبوری حالت

(۲) پیدائش ارضی اور موت سے قبل کی کلی اتصالی حالت اور

(۳) موت اور قیامت سے قبل کی عبوری اتصالی حالت۔

چنانچہ قیامت کے پہلے صور پھونکے جانے سے مراد ہے اس روئے ارض پر موت اور قیامت کے درمیان تمام انسانوں کی عبوری اتصالی حالت کا خاتمہ۔ اور ہر طرح کی صورت کا خاتمہ۔ ظاہر ہے اس صورت میں ان تمام صورتوں کو فنا ہو جائے گی جو قیام قیامت کے دن زندہ ہوں گے یا اس سے قبل مر چکے ہوں گے۔ اس پہلے صور میں ہر دو حالت عالم فنا کے حوالے ہو جائے گی۔ چنانچہ اسی مرحلے کے بارے میں قرآن نے اس طرح وضاحت فرمائی ہے۔

(۱) ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الا من شاء اللہ۔ (الزمر:۶۸)

ترجمہ: اور پھونکا جائے صور میں پھر مر جائیں گے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے۔

(۲) فاذا نفخ فی الصور نفخۃ واحدۃ وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ (الحاقہ:۱۳۔۱۴)

ترجمہ: پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا اور اٹھائی جائے زمین

اور پہاڑ پھر کوٹ دیئے جائیں ایک بار۔

اس مرحلے کے بعد اللہ تعالیٰ پھر صورت گری کی تکرار فرمائے گا اور ساری صورتیں پھر بن جائیں گی۔ چنانچہ اس صورت گری کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

(۱) ونفخ فی الصور فاذا هم من الاجداث إلى ربهم ينسلون ۔
(یٰسٓ: ۵۱)

ترجمہ: اور پھونکی جائے صور پھر تبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف لپک پڑیں گے۔

(۲) ثم نفخ فيه اخرى فاذا هم قيام ينظرون (الزمر:۶۸)

ترجمہ: پھر پھونکی جائے دوسری بار تو فوراً وہ کھڑے ہو جائیں ہر طرف دیکھتے

(۳) يوم ينفخ فی الصور فتاتون افواجاً (النباء:۱۸)

ترجمہ: جس دن پھونکی جائے صور پھر تم چلے آؤ فوج در فوج۔

ان آیات میں جہاں جہاں 'صور' کا استعمال ہوا ہے اور اس سے قرنایا سنکھ جیسی کوئی چیز جو عام طور پر مراد لی جاتی ہے وہ محض عوامی بیان ہے۔ راسخون فی العلم جانتے ہیں کہ یہ دراصل اس خدائے عزیز و جبار کی شان صورت گری اور شان صورت شکنی اور پھر شان صورت گری کا ظہور ہے۔ چنانچہ اسی شان صورت گری کی قسم کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس انسان کی کامیابی اور ناکامی پر تبصرہ فرماتا ہے:

والعصر! ان الانسان لفی خسر۔ (العصر:۱۔۲)

ترجمہ: قسم ہے عصر کی! بے شک انسان ٹوٹے میں ہے۔

یہاں العصر سے مراد 'عالم عصر' ہے جو کائنات کا تیسرا مدرج ہے۔

(۴) چوتھا مدرج: کائنات کا چوتھا مدرج 'عالم اشیاء' ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم خلق کا تیسرا موجودہ مدرج 'عالم اشیاء' ہے۔ یہ 'عالم اشیا' 'عالم عصر' سے نیچے ہے۔ اور اس عالم اشیاء کا عالم عصر سے ظہور ہوا ہے۔ یہ عالم اشیاء ہی ہے جہاں عالم عصر کی صورت گری دراصل اشیاء میں صورت گری کی یا 'تسویہ' کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اس عالم کو "عالم اشیاء' یا 'عالم اسباب' بھی کہا جاتا ہے۔ تخلیق کی یہ تیسری منزل ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی شان 'مسبب الاسباب' کا ظہور ہوتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن نے اسی طرح فرمایا ہے:

(۱) ان الله علی کل شئی قدیر (البقرہ:۲۰)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے کا ہمہ وقت اندازہ مقرر کرنے والا ہے۔

(۲) هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ثم استویٰ الی السماء فسوٰهن سبع سمٰوٰت وهو بکل شئی علیم . (البقرہ:۲۹)

ترجمہ: وہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کے ڈھانچہ بنانے کا پھر اس کا ڈھانچہ بنادیا سات آسمانوں میں اور وہ ہر شئے کو جانتا ہے۔

(۳) ولله ملك السمٰوٰت والارض والله علی کل شئی قدیر (آل عمران:۱۸۹)

ترجمہ: السمٰوٰت اور الارض کی ملک اللہ کی ہے اور اللہ ہر شئے کا اندازہ مقرر کرنے والا ہے۔

(۴) ولله ما فی السمٰوٰت والارض وکان الله بکل شئی محیطا. (النساء:۱۲۶)

ترجمہ: السمٰوٰت والارض میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے اور وہ ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۵) بدیع السمٰوٰت والارض انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة وخلق کل شئی وهو بکل شئی علیم. ذٰلکم الله ربکم لا اله الا هو خالق کل شئی فاعبده وهو علی کل شئی وکیل. (الانعام:۱۰۱۔۱۰۲)

ترجمہ: پہلی بار بنانے والے آسمانوں اور زمین کو کیونکر ہو سکتا ہے اس کا بیٹا اور کیونکر ہو سکتا تھا کوئی اس کا شریک کار جوڑا (اس لیے کہ) اسی نے بنائی ساری چیزیں اور وہ ہر شئے کا جاننے والا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہ پیدا کرنے والا تمام اشیاء کا سی کی بندگی کرو وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔

یہی عالم اشیاء ہے جہاں عالم بریۃ کا نفس مطمئنہ جو 'عالم عصر' میں 'روح' کی صورت میں منتقل ہو چکا تھا از سر نو منتقل ہو کر صرف 'نفس' بلکہ 'نفس روح، یا ریح' میں بدل گیا۔ یہ وہی نفس روح ہے جو تنفس کی صورت میں جاری ہے اور موت تک رہتا ہے۔ دوسری طرف اس 'نفس روح' یا 'نفس ریح' کا مجمل دراصل عالم عصر کی 'صورت' یا 'صورت نوعیہ' نہیں رہتی بلکہ عالم عصر کی 'صورت' یہاں باضابطہ اشیاء (جمادات، نباتات، حیوانات) میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس

مدرج میں عالم عصر کی 'صورت'، 'صورت اشیاء' میں اور عالم عصر کی 'روح'، 'نفس ریح وروح' یا تنفس میں بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس عالم اشیاء میں یہ دو صورتیں الگ ہو جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ جان نکل گئی یا فلاں مر گیا۔ یا یہ کہ جب تک سانس ہے تب تک زندگی ہے۔ اور جب یہ سانس چلی گئی تو اسے موت کہتے ہیں۔ یہ موت ہے لیکن یہ موت عالم اشیاء کی مادیات اور نفس ریح کا الگاؤ اور ان کی موت ہے۔ یہ روح کی موت نہیں جو عالم عصر کی اصل ہے۔ نہ اس 'صورت' کی جو عالم عصر میں روح کا محمل ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ موت سے روح نہیں مرتی نہ صورت ختم ہوتی ہے۔ اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

**کل نفس ذائقة الموت والینا ترجعون۔** (العنکبوت:۵۷)

ترجمہ: ہر نفس موت چکھنے والا ہے اور ہماری طرف لوٹ آنے والا ہے۔

یہی 'عالم اشیاء' 'کلف' کا محمل ہے۔ جسے 'تکلیف' کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

(۱) **لا نکلف نفساً الا وسعها۔** (الانعام:۱۰۴)

ترجمہ: ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۲) **والذین آمنوا وعملوا الصالحات لا نکلف نفساً الا وسعا۔**

(الاعراف:۴۲)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۳) **ولا نکلف نفساً الا وسعها ولدینا کتاب یتعلق بالحق۔**

(المومنون:۶۲)

ترجمہ: اور ہم کسی نفس کو مکلف نہیں کرتے مگر جو اس کی وسعت ہے، اور ہمارے پاس ہے کتاب جس میں یہ باتیں ٹھیک ٹھیک انداز میں درج ہیں۔

(۴) **لا یکلف الله نفساً الا وسعا۔** (البقرہ:۲۸۶)

ترجمہ: اللہ مکلف نہیں کرتا کسی نفس کو مگر جو اس کی وسعت ہے۔

(۵) **لا یکلف الله نفساً الا ما اتاها۔** (الطلاق:۷)

ترجمہ: اللہ مکلف نہیں کرتا کسی نفس کو مگر جو اس کے لیے دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہی عالم اشیاء ہے جہاں 'دین اللہ، شرعہ، اور 'منہاج' میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جس کا

ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح فرمایا ہے اور یہی 'شرعہ' اور 'منہاج' ہے جسے قرآن میں 'الحق' سے بھی موسوم کیا گیا ہے:

(۱) وانزلنا اليك الكتاب بالحق مصدقا لما بين يديه من الكتاب ومهيمناً عليه فاحكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهواهم عما جائك من الحق. لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعلكم واحده ولكن ليبلوكم فى ما اتٰكم فاستبقوا الخيرات الى الله مرجعكم جميعاً فينبئكم بما كنتم فيه تختلفون. (المائدہ:۴۸)

ترجمہ: اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے اپنے دیئے ہوئے حکموں میں سو تم دوڑ کر لو خوبیاں اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے۔ پھر جتادے گا جس بات میں تم کو اختلاف تھا۔

چونکہ یہ عالم اشیاء تکلیف کا محمل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں دین اللہ کو شریعت میں جاری فرمایا۔

# حقیقت دوم

## ابلیس، الشیاطین کی حقیقت :

ابلیس اور الشیاطین وغیرہم کی حقیقت پر مختصر بحث سے قبل یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تخلیق کے اس دور کا ذکر کیا جائے جب اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا عمل شروع فرمایا اور کائنات خلق میں اس کی کئی مخلوقات ارتباء کے مقامات طے کرنے لگیں جس کا 'ماکان ومایکون' میں صرف برائے نام ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۹۲ : سلسلہ ارتباء کائنات نوری
سلسلہ ارتباء کائنات ناری
سلسلہ ارتباء کائنات ارضی

(۲) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۱۷۵ :"موجودات اول کے بعد تخلیق کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے موجودات ثانی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کائنات السمٰوٰت والارض مزید کثیف بنائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تین موجودات کی تخلیق کی۔ انہیں مخزن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تین مخزن درج ذیل ہیں:

(۱) مخزن نور
(۲) مخزن نار
(۳) مخزن ارض

یہی تین مخازن خلق میں ارتباء مطلق مجرد کی آخری کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ارتباء مطلق کے ساتھ ساتھ اضافی بھی ہو گیا۔ یہی تین مخازن اصلاً کائنات نور، کائنات نار اور کائنات ارض کے مخزن ہیں۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: صفحہ ۱۸۲ ۔ "خلق ثالث کے بعد اللہ تعالیٰ نے خلق رابع شروع کیا۔ چونکہ ہم اپنی بحث کو کائنات ارضی تک محدود رکھیں گے۔ اس لیے سلسلہ ارتباء کائنات نوری اور سلسلہ ارتباء کائنات ناری کا ذکر صرف ضمناً ہوگا۔"

(۴) ملاحظہ فرمائیں : صفحہ ۱۹۰ : "جیسا کہ عرض کیا گیا کہ خلق ثالث کے دوسرے مرحلے میں ارتباء کائنات السمٰوٰت والارض نوری کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ارتباء کائنات السمٰوٰت والارض ناری اور ارتباء کائنات السمٰوٰت والارض ارضی کا۔ چنانچہ کائنات السمٰوٰت والارض نوری میں کھربوں السماء والارض نوری تشکیل پانے لگیں اور ان میں ارتباء کا عمل جاری ہوا۔ انہیں میں سے ایک وہ السماء والارض نوری ہوگی جو دراصل ہماری السماء والارض کی مثل ہوگی۔ اسی طرح کائنات السمٰوٰت والارض ناری میں کھربوں السماء والارض ناری تشکیل پانے لگیں۔ اور ان میں ارتباء کا عمل جاری ہوا۔ انہیں میں سے ایک وہ السماء والارض ہوگی جو دراصل ہمارے السماء والارض کی مثل ہوگی۔

چنانچہ عالم عصر میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ان تینوں مخازن سے ارتباء کا عمل جاری فرمایا۔ اور اس طرح ان کے تین الگ نام قرار پائے۔

(۱) **المَلَك** : ابناء نور یا انواع نور کا نوعی نام ملک ہے۔ مَلَك اور ملائکہ ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو الگ الگ مادوں سے بنے ہیں۔ ملک اسم نوع ہے جبکہ ملائکہ اسم تفویض ہے۔ چنانچہ نہ ہر ملک ملائکہ ہے اور نہ ہی ہر ملائکہ ملک۔

(۲) **الجن** : ابناء نار یا انواع نار کا نوعی نام جن ہے۔ الجن اور الملک میں نوعی فرق ہے لیکن دونوں ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کے ملائکہ تفویضی اسم ہے جبکہ جن نوعی۔ جس طرح سارے ملائکہ کا ملک یا جن ہونا محال ہے اسی طرح سارے جن کا ملائکہ ہونا بھی محال ہے۔

(۳) **الآدم** : ابناء ارض یا انواع ارض کا نوعی نام الآدم ہے۔ الآدم، الجن اور الملک میں نوعی فرق ہے۔ لیکن تینوں ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ تفویضی اسم ہے جبکہ الآدم، الجن اور الملک نوعی۔ جس طرح سارے ملائکہ کا تنہا ملک، جن یا آدم میں سے کسی ایک سے ہونا محال ہے اسی طرح سارے آدم کا ملائکہ ہونا بھی محال ہے۔ یہ الآدم وہی ہے جو آدم قدیم بھی کہلاتا ہے۔

**الملائکہ :**

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مَلَك اور ملائکہ دو بالکل الگ الگ وجود ہیں۔ مَلَك نوع ہے اور اس کا تعلق ابناء نور سے معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ ملائکہ اسم تفویض ہے اور ایک منصب، مقام اور

ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا کسی بھی نوع سے پایا جانا قبادر ہے۔ اس طرح ابناءنور، ابناءنار اور ابناءارض ہر سہ گروہوں سے ملائکہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) ابناءنور یعنی مَلَك سے مَلَكًا ملائكة ـــــ کا ہونا ممکن ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) وقالوا لو لا انزل عليه ملك ولو انزلنا ملكاً تقضى الامر ثم لا ينظرون۔ ولو جعلنا ملكا لجعلناه رجلا وللبسنا عليهم ما يلبسون۔ (الانعام ۸۔۹)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اترا اس پر کوئی ملک اور اگر ہم اتاریں ملک ملے ہو جائے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی ملک کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے ہیں۔

(۲) قل لو كان فى الارض ملئكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السمء ملكا رسولاً (بنی اسرائیل: ۹۵)

ترجمہ: کہہ اگر ہوتے زمین میں ملائکہ پھرتے بستے تو ہم اتارتے ان پر آسمان سے کوئی ملک رسول۔

(۲) ابناءنار یعنی جن سے جنا ملائكه يا ملائكة الجن ـــــ کا ہونا ممکن ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) واذقلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس۔ (البقرہ:۳۴)

ترجمہ: اور جب ہم نے کہا ملائکہ کو سجدہ کرو تم سب آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس۔

اس حکم میں نفس ملائکہ میں تمام ہی داخل تھے جو ابناءارض کے علاوہ تھے یعنی ابنائے نور میں سے ملائکہ یعنی ملکاً ملائکہ اور ابناءنار میں سے ملائکۃ الجن یعنی جناً ملائکۃ دونوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

(۳) ابناءارض یعنی ابناء بشر سے ارضاً ملائكة، آدماً ملائكة يا بشرا ملائكة کا ہونا ممکن ہے۔

چنانچہ اگر قرآن میں غور کیا جائے تو یہ ارضا ملائکہ، آدماً ملائکۃ یا بشرا ملائکہ دراصل انبیاء

کرام ہی ہیں جو دراصل انسانوں میں سے ملائکہ ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

(۱) ولقد صرفنا للناس فی هذا القرآن من کل مثل فابی اکثرالناس الا کفوراً۔ وقالوا لن نومن لك حتی تفجرلنا من الارض ینبوعا اوتکون جنة من نخیل وعنب فتفجر الانهٰر خلٰلها تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی بالله والملائکة قبیلا۔ اویکون لك بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نومن لرقیك حتی تنزل علینا کتبا نقرؤه قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا۔ وما منع الناس ان یومنوا اذجاء هم الهدیٰ إلا ان قالوا بعث الله بشرا رسولا۔ (بنی اسرائیل ۸۹۔۹۴)

ترجمہ: اور ہم نے پھیر پھیر کر سمجھائی لوگوں کو اس قرآن میں ہر مثل سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری کیے۔ اور بولے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کردے ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ یا ہو جائے میرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا پھر بہائے تو اس کے بیچ نہریں چلا کر یا گرادے آسمان ہم پر جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا لے آاللہ کو اور ملائکہ کو سامنے۔ یا ہو جائے تیرے لیے ایک گھر سنہرا یا چڑھ جائے تو آسمان میں اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو جب تک نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جس کو ہم پڑھ لیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں مگر ایک بشر رسول اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی ان کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بھیجا بشر رسول۔

آنحضور ﷺ پر یہ کوئی آسمان علمی حملہ نہ تھا۔ بلکہ ان کی حقانیت کو پرکھنے کے لیے اس وقت ابلیس نے پوری کائنات میں اپنی پوری فوج کے اعلیٰ ترین ماہرین لگا دیئے تھے اور جن کے ترجمان علماء یہود تھے۔ یہ سوالات کسی قریشی کے بس کی بات نہیں بلکہ عام علماء یہود کے بس سے بھی باہر کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر جو آخری درجے کے احبار و رہبان یہود تھے وہ آنحضور ﷺ سے علمی ٹکر لے رہے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ ہزاروں سالوں میں جمع کائنات کا سارا اچھا اور برا علمی سرمایہ صرف ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ اور باقی ساری خلقت عام ھاارض یعنی Gentile یعنی امی ہے۔ اور صرف وہی لوگ عام ھا سیفر ہیں۔

یہاں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) اگر انبیاء بشر اُملائکۃ ہیں تو ان کا قیام (Abode) آسمان میں ہونا چاہئے تھا۔ اور انہیں آسمان سے زمین پر نازل ہونا چاہئے تھا۔۔اس تعلق سے پہلی غلط فہمی آسمان کے معنی کی تعیین میں ہے۔ آسمان کے کئی مفاہیم ہیں اور ہر کوئی اپنی جگہ بامعنی ہے ان میں سب سے وسیع تر معنویت اس السمٰوٰت کے معنی میں ہے جو الارض کے علاوہ ہے۔ دوسری چیز یہ کہ ملائکہ کا قیام کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ خواہ، وہ الارض ہو یا یہ ارض، السماء ہو یا یہ آسمان۔ اسی طرح ان کا میدان عمل یا ذمہ داریوں کی جگہ اللہ کے حکم سے کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

اب سوال ہے نزول کا۔۔۔۔ یہ بات کہ اگر انبیاء بشر اُملائکۃ ہیں تو پہلے انہیں انسانوں میں پیدا ہونا چاہئے تھا پھر یہاں سے آسمان میں جانا چاہئے تھا پھر اتر کر اللہ کا پیغام دینا چاہئے تھا۔ ہر چند کہ ایسا ہونا نہ خلاف عقل ہے نہ مستبعد۔ لیکن عام اعتبار سے ایسا اس وقت کیا جاتا جب انسان کسی اور مقام میں موجود ہوتے مثلاً کسی اور سیارے اور کہکشاں میں اور ان کا میدان عمل کسی اور مقام پر ہوتا مثلاً کسی دوسرے سیارے یا کہکشاں میں۔ لیکن چونکہ تین واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے صورتحال میں یہ تبدیلی کردی کہ پوری کائنات میں یہی ارض جو زہرہ (Venus) اور مریخ (Mars) کے مابین ہے۔۔۔۔ پوری کائنات میں معرکۂ خیر وشر کے لیے میدان کارزار قرار دے دی گئی۔ یہ تین واقعات ہیں:

(۱) اسی نفس ارض سے آدم کی تخلیق کا ہونا۔

(۲) الجنۃ میں آدم وحوا سے غلطی کا ہونا۔

(۳) آدم وحوا کے لیے اس ارض کو مسکن قرار دینا (جو زہرہ اور مریخ کے مابین ہے) اور توبۃ کی انابت اور مغفرت کے باوجود ان کا اس زمین پر منتقل کیا جانا اور اس طرح معرکۂ خیر وشر کا الجنۃ سے الارض پر منتقل ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ وہ ہدایت بھیجیں گے چنانچہ اس طرح رسالت کا اجراء کیا جانا۔

یہ وہ خصوصی صورتحال تھی جس میں تمام بشر انبیا جو بشر اُملائکۃ تھے اسی زمین پر ان کا مولد ومسکن بھی ہو گیا اور میدان کار بھی۔ دین اللہ میں یہ وہ سنت الٰہی ہے جس کو سمجھنے کے لیے اس تقریر کا سمجھنا ضروری ہے جو حکیم الامت مولانا تھانوی نے "بیان القرآن" میں کی ہے۔

آپ سورۂ المائدہ آیت:۳۱ کے تحت آدم کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کے واقعے میں پہلے قصہ نقل کرتے ہیں: "خلاصہ قصہ کا یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی پیدا ہوتی اسی طرح دوسرے بطن میں بھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتی اور ایک بطن کا لڑکا دوسرے بطن کی لڑکی سے اور دوسرے بطن کا لڑکا پہلے بطن کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا۔"

اس قصے کی تقریر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"آدم علیہ السلام کی شریعت میں حسب ضرورت وقت یہ افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے قرار دیا گیا۔"

اس پر حاشیہ لکھتے ہوئے آپ مزید فرماتے ہیں:

"اس تقریر کے بعد علی الاطلاق اس کا قائل ہونا بلا دلیل ہے کہ حضرت آدم کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا۔ بلکہ بہن سے نکاح میں یہ بھی قید تھی کہ دوسرے بطن سے ہو پس یہ افتراق ایسا تھا جیسا کہ آج کل خالہ کی لڑکی سے نکاح جائز ہے، حالانکہ ماں کی لڑکی اور خالہ کی لڑکی میں چنداں فرق نہیں کیونکہ نانی میں یہ دونوں ایک ہی ہو جاتی ہیں کہ دونوں کی ماں اوس ایک ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔" (تبیان)

(مولانا اشرف علی تھانوی : بیان القرآن: سورہ المائدہ آیت:۳۱)

چنانچہ "حسب ضرورت وقت یہ افتراق بطون بمنزلہ افتراق نسب کے قرار دیا گیا" ٹھیک اسی طرح اس روئے زمین پر بعثت بمنزلہ نزول ہے۔ اور وہ اس لیے کہ نازل ہونا اس وقت ضرور ہوتا جب ان انبیاء کو کہیں اور جگہ سے آنا پڑتا یا کہیں اور جانا پڑتا۔ بلاشبہ اس بعثت کے لیے اعلان اور خود اس پر اس شخص کے لیے بھی شہادت لازمی قرار دی گئی۔ چنانچہ کوئی نبی نہ تو خفیہ طور پر نبی رہ کر پوری زندگی اپنا فرض انجام دے سکتا تھا اور نہ اس صورت میں کہ دوسرے لوگ تو اسے نبی کہیں اور اس پر ایمان لائیں اور خود وہ اپنے آپ کو نہ نبی کہے اور نہ اس کا اقرار کرے۔ چنانچہ یہ بعثت مع اعلان اور اقرار بمنزلہ نزول ہیں۔

(۲) ملائکہ کا اردو میں اکثر ترجمہ فرشتہ کیا جاتا ہے یہ درست ہوتے ہوئے بھی اب چونکہ مخصوص تصورات کے ساتھ رائج ہو چکا ہے اس لیے احتیاطاً یہاں فرشتہ لکھنے سے احتراز کیا گیا ہے اور ملائکہ ہی لکھا گیا ہے۔

(۳) ملائکہ کے تصور کے ساتھ ان کے اڑنے، مافوق العادۃ کام انجام دینے، آسمانوں اور زمینوں کی وقت کے چھوٹے سے چھوٹے حصے میں سیر کرنے کا تصور کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ تو ایک ذمہ دارانہ منصب کا نام ہے جس کی بنیادی ذمہ داری یا صفت اڑنا، مافوق العادۃ کام انجام دینا، آسمانوں اور زمینوں کی چھوٹے سے چھوٹے وقت میں سیر کرنا نہیں۔ بلکہ یہ صفت دراصل وہ فطری قوت ہے جو بحیثیت مخلوق کے الگ الگ مخلوقات کو دی گئی ہے۔ اور ابناء نور اور ابناء نار اور ابناء آدم یعنی ملک اور جن اور آدمی میں پائی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قوت، تیز رفتاری ملک میں، اس سے کم جن میں اور سب سے کم آدمی میں۔ چنانچہ آدمی بغیر کسی چیز کا سہارا لیے اڑنے سے قاصر ہے یا عام حالات میں اڑنے یا پلک جھپکتے کسی جگہ جانے سے قاصر ہے۔ جبکہ جن اس پر قادر ہیں اور جن چیزوں پر جن قادر ہیں ان سے زیادہ بہتری کے ساتھ اس پر ملک قادر ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے کوئی چیز یا کام آدمی کے لیے مافوق القوۃ ہو وہی چیز جنوں کے لیے مافوق القوۃ نہ ہو اور ممکن ہے کوئی چیز یا کام جنوں کے لیے مافوق القوۃ ہو لیکن وہی چیز یا کام ملک کے لیے مافوق القوۃ نہ ہو۔ اسی طرح آدمی، جن اور ملک کے لیے عجز کے الگ الگ معیار ہیں۔ ممکن ہے جنوں کے ذریعہ کیے جانے کے لائق کام آدمی کے ذریعہ اگر ہو جائے تو اسے معجزہ کہیں گے تو ملک کے ذریعہ کیے جانے والے کام اگر جنوں کے ذریعہ ہو جائے تو وہ جنوں کے لیے معجزہ کہلائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی کام ملک کرنے سے عاجز ہیں اور وہ کام کسی کے ذریعہ ہو جائے تو یہ عظیم الشان معجزہ ہوگا۔

اسی مقام پر معراج کی حقیقت کے لیے دلیل بھی ملتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملکا ملائکہ میں سے بھی سب سے مقرب ذات حضرت جبرئیل کی ہے اور وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر آپ ﷺ سے فرماتے ہیں کہ آپ آگے تنہا تشریف لے جائیں میں اس سے آگے آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلی بسوزد پرم

## مَلَکاً ملائکہ :

اب جہاں تک ملکا ملائکہ کی بات ہے تو وہ اپنی صفات اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے کئی

اقسام اور مدارج کے ہیں مثلاً:

(ا) (الف) (۱) حاملین عرش

(۲) ملائکه حول العرش

(۳) حفظ

(ب) (۱) صافات

(۲) زاجرات

(۳) تالیات

(۴) مرسلات

(۵) عاصفات

(۶) ناشرات

(۷) فارقات

(۸) ملقیات ذکراً

(۹) ملقیات عذراً

(۱۰) ملقیات نذراً

(ج) (۱) رقیب عتید

(۲) کاتبین کرام کراما کاتبین

(۳) ملك الموت وغیرهم۔

لیکن ان کا تذکرہ اس بحث کو طول دے دیگا جس کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس وقت ہم صرف چند مخصوص ذمہ داریوں کے تعلق سے جن کا بنیادی تعلق معرکۂ خیر و شر سے ہے بیان کرتے ہیں اور اس تعلق سے ان ملائکہ کا ذکر ہوگا۔

(د) (۱) الروح الامین

(۲) الروح

(۳) ملائکه بالروح

(۴) ملائکه رسولاً

(۵) ملائکه رسولا بشیراً

(۶) ملائکة ذکراً

(۷) ملائکه بشراً

(۸) ملائکه عذراً

(۹) ملائکه نذراً

(ه) ان کے علاوہ وہ ملائکہ ہیں جن کا اس اعتبار سے خصوصی ذکر کیا جانا چاہئے مثلاً:

(۱) جنود الله اور جنود الرب

(الف) جند الارض

(ب) جند السماء

(۱) المسومین

(۲) المردفین

(۳) المنزلین

بشراً ملائکه، رسولاً

(الف) (۱) سیداً

(۲) حصوراً

(۳) حناناً

(۴) صادق الوعد

(۵) زکیاً

(۶) تقییاً

(۷) براً

(۸) علماً

(۹) کلمة

(۱۰) تکلیماً

(ب) (۱) نبیاً

(۲) رسولا نبیا

(۳) صدیقاً نبیاً

اس تعلق سے الملک، الجن اور الآدم کے پسندیدہ، اعلیٰ اور برگزیدہ مقام کو قرآن نے "المقربون" یا "المقربین" سے مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) لن یستنکف المسیح ان یکون عبدالله ولا الملائکة المقربون (النساء:۱۷۲)

ترجمہ: مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ملائکہ کو کہ وہ مقرب ہوں۔

(۲) والسابقون السابقون اولئك المقربون (الواقعہ:۱۰۔۱۱)

ترجمہ: اور آگے والے تو آگے والے وہی ہیں مقرب۔

(۳) کلا ان کتاب الابرار لفی علیین۔ وما ادراك ما علیون کتاب مرقوم یشهده ... بون (المطففین: ۱۸۔۲۱)

ترجمہ: ہرگز نہیں بیشک کتاب الابرار علیین ہے۔ اور تجھ کو کیا خبر کیا ہے علیون۔ ایک لکھی ہوئی کتاب۔ اس کو ہمہ وقت سامنے رکھتے ہیں مقرب۔

(۴) عینا یشرب بها المقربون (المطففین:۲۸)

ترجمہ: وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں مقرب

(۵) اذقالت الملائکة یٰمریم ان الله یبشرك بکلمة منه اسمه المسیح عیسیٰ ابن مریم وجیها فی الدنیا والآخرة ومن المقربین (آل عمران:۴۵)

ترجمہ: جب کہا ملائکہ نے اے مریم! بے شک اللہ تجھ کو اپنے سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام المسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا صاحب مرتبہ دنیا میں اور آخرت میں اور مقربون سے۔

(۶) فاما ان کان من المقربین فروح وریحان وجنت نعیم۔ (الواقعہ:۸۸۔۸۹)

ترجمہ: سو جو اگر وہ مرد ہوا مقرب لوگوں میں تو راحت ہے اور روزی ہے اور باغ نعمت کا۔

جیسا کہ ابتداءً عرض کیا گیا کہ کائنات میں عالم اصل، عالم بریۃ، عالم عصر اور عالم اشیاء

پائے جاتے ہیں تو اس سے مراد ہر سہ مخازن میں ان کا وقوع ہے۔ چونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات میں عالم اصل اور عالم بریۃ مشترک ہیں اس لیے تقسیم کی صورت اس کے بعد واقع ہوتی ہے۔ یعنی عالم عصر اور عالم اشیاء میں۔ اس طرح کائنات نور میں بھی کسی عالم عصر اور عالم اشیاء کا پایا جانا یقینی ہے۔ اسی طرح کائنات نار میں عالم عصر اور عالم اشیاء کا پایا جانا۔

## انواع نور

اللہ تعالیٰ نے انواع نور میں ارتباء کا عمل جاری فرمایا اور ایسا لگتا ہے کہ جب وہ عالم عصر اور عالم اشیاء سے گزارے گئے تو جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ان میں بحیثیت مجموعی یا بالا کثر 'عصو' یعنی نافرمانی کے رجحان نہیں پائے گئے۔ یعنی وہ حیات اور شعور سے تو متصف ہیں لیکن تکلیف یعنی تخییر یا اختیار سے بالا کثر متصف نہیں یا وہ اس تعلق سے مفرط نشاط (Overactive) نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جو اس آیت میں مذکور ہے:

**لا یعصون اللہ ما امرھم.** (التحریم ۔٦)

ترجمہ: وہ نافرمانی نہیں کرتے جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

(اس تعلق سے مزید باتیں ان شاء اللہ بعد میں آئیں گی)

یوں تو اللہ علیم و خبیر اس بات سے ہمیشہ باخبر تھا تاہم اس پر اس بات نے بھی حجت قائم کر دی جب اللہ تعالیٰ کے انسان کو خلیفہ بنائے جانے کے اعلان پر انواع نور کی جانب سے اعتراض کیا گیا۔ اور اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انواع نور پر یہ بات آدم کے ذریعہ واضح فرما دی کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ درست ہے اور انواع نور کے بجائے آدم ہی خلافت کے لیے مستحق ہے۔ مزید ازیں یہ کہ خود انواع نور کی بھلائی اور زیادہ فلاح اسی میں مضمر ہے کہ وہ اس مسابقت سے الگ ہو جائیں۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ حجت کی تکمیل صرف واقعی (Vitually) نہیں کرتا بلکہ اصلی (Actually) کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے انواع نور پر اصلی حجت بھی پوری کر دی۔

اس تعلق سے کم از کم دو باتیں قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں:

## (۱) بابل کے دو ملک کا واقعہ

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

**وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروٰ۔ ومایعلمان من احد حتی یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر** (البقرہ۔ ۱۰۲)

ترجمہ: اور جو اترا وہ ملک ھاروت اور ماروت پر بابل میں۔ اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ اس لیے تم کفر نہ کرو۔"

اس آیت کی تمام تاویلات میں اس عاجز کے نزدیک سب سے مضبوط تاویل (جس پر تفصیل سے بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں) وہ ہے جس کا ذکر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس طرح کیا ہے:

"روایت کی حسن بن یحییٰ نے فرمایا خبر دی عبد الرزاق نے فرمایا، فرمایا معمر نے فرمایا قتادہ اور زہری نے، عبد اللہ سے "وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت" یہ دونوں ملائکہ میں سے ملک تھے (یہ دونوں ملک ملائکہ میں سے تھے) ان دونوں کو (زمین پر) اتارا گیا تاکہ یہ دونوں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔ (یا حکمت سکھائیں) اور وہ اس لیے کہ ملائکہ نے بنی آدم کو جو احکام دیئے گئے تھے ان کا مذاق اڑایا۔ چنانچہ ان دونوں کے پاس ایک عورت آئی تو وہ دونوں اس کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ چنانچہ انہیں اوپر بلایا گیا اور ان پر ان کی غلطی واضح کی گئی۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ وہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت میں کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ چنانچہ ان دونوں نے عذاب دنیا کو چن لیا.....[۲]

یہ واقعہ دراصل ایک حجت تھی۔ (اس سے قبل بھی کئی واقعات ایسے ہوئے ہیں جن کا ذکر یہاں کیا جانا بحث کو طویل بنا دے گا جس کی گنجائش نہیں۔)

## (۲) دجال کے ساتھ دو فرشتوں کا واقعہ

یہ حدیث مسند احمد اور الدر المنثور میں بیان ہوئی ہے:

"رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا: سنو! مجھ سے پہلے جو نبی بھی آیا اس نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا ہے۔ وہ بائیں آنکھ سے کانا ہو گا۔ اسکی دائیں آنکھ پر ایک موٹی سے پھلی ہو گی۔ اس کی دو آنکھوں کے درمیان "کافر" لکھا ہو گا اس کے ساتھ دو وادیاں ہوں گی جن میں سے ایک جنت اور دوسری آگ ہو گی۔ اس کی آگ

جنت ہو گی اور جنت آگ۔ اس کے ساتھ دو فرشتے ہوں گے جو انبیاء میں سے دو نبیوں کے مشابہ ہوں گے اگر میں چاہوں تو ان دونوں نبیوں کے نام اور ان کے آباواجداد کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔ ان دو فرشتوں میں سے ایک دجال کے دائیں جانب ہو گا اور دوسرا بائیں جانب اور یہ سب کچھ آزمائش کے لیے ہو گا۔ چنانچہ دجال پوچھے گا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ کیا میں زندہ کرتا اور مارتا نہیں ہوں؟ ایک فرشتہ جواب دے گا کہ "تو نے جھوٹ بولا۔" یہ جواب سوائے اس کے ساتھی کے کوئی آدمی نہ سن سکے گا اور وہ کہے گا کہ "تو نے سچ کہا" اس جواب کو سب حاضرین سن لیں گے اور گمان کریں گے کہ یہ دوسرا دجال کی تصدیق کر رہا ہے"..... الخ۔[۳]

یہ حدیث نہایت پیچیدہ حدیثوں میں سے ایک ہے جس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں ہو گی۔ اس وقت تو صرف اس جانب اشارہ کرنا ہے کہ

(۱) کیا وہ دونوں فرشتے دجال کے قیدی ہوں گے؟

(۲) کیا وہ اتنا طاقتور ہو گا کہ پہلے فرشتے کی بات کو جو اس کے خلاف جاتی ہے اس کو صوتاً محو (Black out) کر دے؟ اور دوسرے کی بات کو اس طرح اس کے بعد لے آئے کہ معلوم ہو کہ وہ دونوں اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔

(۳) واضح ہو کہ وہ دونوں فی الحقیقت ملک ہوں گے مگر شکلاً دو انبیاء ہوں گے۔ اس لیے عوام الناس کے لیے، اس معیت اور تصدیق کی حیثیت دو انبیاء کا حضرت مسیح کے ساتھ معیت اور تصدیق کا معاملہ سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ دجال اصلاً حضرت عیسیٰ کا ہم شکل اور ہم صفات ہو گا۔

ان حالات میں ملائکہ کا دجال کے ہاتھوں مقید ہو جانا ایک بہت بڑا سوال ہے جو ملائکہ پر اللہ تعالیٰ کی ایک حجت کی تکمیل کرتا ہے:

(۱) پہلی صورت میں وہ بطیب خاطر گناہ میں آلودہ ہوئے۔

(۲) دوسری صورت میں وہ باکراہ گناہ معیت و تصدیق میں آلودہ ہوں گے۔

اس طرح انواع نور یا ملک خود اپنی مرضی سے خلافت اللہ کی مسابقت سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے پورے شرح صدر کے ساتھ منصوبۂ ربانی کی تکمیل میں اللہ اور اللہ کے اولیاء کے ساتھ ہو گئے۔

# انواع نار

انواعِ نور کی طرح ہی اللہ تعالیٰ نے انواع نار میں ارتباء کا عمل جاری فرمایا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب وہ عالم عنصر اور عالم اشیاء سے گزارے گئے تو جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ان میں بحیثیت مجموعی یا بالاکثر "عصو" یا نافرمانی اور فساد ہی فساد کے رجحان پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بحیثیت نوع انواع نار کو ارتباء کے عمل سے معزول کر دیا۔ اور ان کی عملی بیخ کنی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیخ کنی کی ذمہ داری اسی نوع کے ایک ذمہ دار جو انواع نار میں سے ارتباء پذیر ہو کر مقرب ہو چکا تھا اور ملائکہ کے درجے پر فائز تھا کے کاندھوں پر ڈالی۔ یہ بیخ کنی خود ان کے فسادات کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس لیے کہ ان جنوں نے جو ابناء نار تھے عالم اشیاء سے ترقی کر کے عالم عصر اور پھر عالم بریۃ یہاں تک کہ عالم اصل تک رجعت کیا کرتے انہوں نے عالم اشیاء کو فساد اور خون ریزی سے بھر دیا۔ چنانچہ عالم اشیاء میں ہر جانب فساد ہی فساد تھا اور خوں ریزی ہی خوں ریزی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سی مخزن نار سے ارتباء پذیر ایک فرد کو جس کا لقب اس وقت عزائیل تھا اس کی ذمہ داری دی کہ وہ ان تمام جنوں کو یعنی ابناء نار کو جو مفسد ہیں ختم کر دے۔ عزائیل نے یہ کام ملائکہ کی مدد سے بخوبی انجام دے دیا۔ جس کے بعد اس کا لقب ابلیس ہو گیا جس کے معنی ہیں تباہ کر دینے والا۔ یہی وہ تفصیل ہے جس کا ذکر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے کیا ہے:

> "ضحاک نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی کہ ابلیس ملائکہ کے قبیلوں میں سے ایک قبیلے سے تھا جنہیں جن کہا جاتا ہے جن کی تخلیق نار سموم سے ہوئی ملائکہ کے مابین۔ اس کا نام حرث تھا۔ وہ جنت کے خزانوں کا ذمہ دار تھا۔ بقیہ ملائکہ نور سے بنائے گئے تھے۔ اس قبیلے کے علاوہ اور جن جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے کہ وہ آگ کی لپٹ سے بنائے گئے ہیں جو گویا اس کی زبان ہے جو اس کے بھڑکتے وقت اسکے اطراف میں پھیلی ہوتی ہے۔ اور انسان کیچڑ سے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو ارض پر بسے وہ جن تھے۔ انہوں نے یہاں فساد کیا اور خوں ریزی کی اور بعض نے بعض کو قتل کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ان کی طرف بھیجا ملائکہ کی فوج کے ساتھ اور یہ سب اسی قبیلے سے تھے جو جن تھے۔ چنانچہ ابلیس نے تمام جنوں کو قتل کر دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض (جو بچ گئے) انہوں نے سمندروں کے (غیر آباد اور دور افتادہ) جزیروں میں

پناہ لے لی۔ اور اسی طرح جبال کے اردگرد۔[۴]

اس طرح عالم اشیاء سے انواع نار کی بڑی آبادی کا تقریباً خاتمہ ہو گیا اور وہ نوع بحیثیت نوع کے ارتباء کے اس منصوبے سے خارج ہو گئی۔ کائنات میں پہلے کے مقابلے میں بہت تھوڑے جن باقی بچ گئے۔

ہر چند کہ اب اس کا کوئی سوال نہیں تھا کہ بحیثیت نوع جنوں میں ارتباء کا عمل جاری رہتا۔ لیکن اسی دوران وہ واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف جنوں اور کائنات کی صورت حال میں انقلابی تبدیلی کر دی بلکہ پورے منصوبۂ ربانی میں فیصلہ کن موڑ لا دیا۔ اور یہ واقعہ تھا عزائیل کا غرور اور تکبر میں پڑ جانا جو اب ابلیس کے نام سے ملقب تھا۔ اسی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

> چنانچہ جب ابلیس نے یہ کام انجام دے دیا تو اس نے اپنے دل میں غرور محسوس کیا۔ اور اس نے کہا کہ میں نے ایسا کام کر دیا ہے جو کوئی نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل کی اس بات سے مطلع ہوا اور اس نے ملائکہ کو مطلع نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ سے جو اس کے ساتھ تھے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو فرشتوں نے جواباً کہا کہ کیا آپ اس میں بنائیں گے جو فساد کریگا اور خوں ریزی کرے گا، جیسا کہ جنوں نے فساد کیا اور خون ریزی کی۔ اور جس کے لیے ہم لوگ بھیجے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اس بات کو جانتا ہوں جسے تم لوگ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ابلیس کے قلب میں جو ہے اس سے واقف ہو گیا ہوں جس پر تم لوگ مطلع نہیں۔ اور وہ یہ بات کہ اس کے دل میں کبر اور غرور کی کیا صورت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی مٹی طلب کی۔ جو اوپر لے جائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو لیسدار مٹی سے بنایا۔ لیس دار سخت مٹی جو بدبودار کیچڑ کی طرح تھی۔ اور وہ مٹی سے بدبودار کیچڑ بنی تھی۔ کہا کہ آدم کو میں نے اس سے اپنے ہاتھوں بنایا۔ کہا کہ آدم کا یہ بنایا ہوا جسد چالیس دنوں تک پڑا رہا۔ اسی دوران ابلیس آیا اور اس نے اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی جس پر اس سے کھنکھنانے کی آواز آئی اور یہی ہے مطلب اللہ کے قول کا "من صلصال کالفخار" یعنی ایسی کھوکھلی چیز جو ٹھوس نہ ہونے کی وجہ سے خاموش نہ ہو۔ کہا پھر وہ اس کے منہ میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے سے نکل گیا۔ اور اس کے پیچھے سے داخل ہوا اور منہ سے نکل آیا.....

اب اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو جو ابلیس کے ساتھ تھے اور ان کے علاوہ تھے جو

آسمانوں اور زمینوں میں تھے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ چنانچہ سبھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کر دیا جو کبر اور غرور اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اس سے وہ متکبر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں اسے سجدہ نہیں کروں گا۔ میں اس سے بہتر ہوں۔ میں اس سے عمر میں بڑا، خلقت میں مضبوط ہوں۔ تو نے مجھے نار سے بنایا اور اسے کیچڑ سے۔ اس نے کہا کہ آگ کیچڑ سے زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ جب ابلیس نے انکار کیا سجدہ کرنے سے تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے سے مایوس کر دیا اور وہ خیر سے مایوس ہو گیا پوری طرح اور وہ شیطان رجیم ہو گیا۔"۵

قرآن نے انواع ناریا جنوں کی اسی نافرمانی کو جواب تقریباً کلی نافرمانی پر مشتمل ہو چکی تھی اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) فسجدوا الا ابلیس أبی واستکبر۔ (البقرہ :۳۴)

ترجمہ: پس سجدہ کیا ان سبھوں نے مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا اور استکبار کیا۔

(۲) إلا ابلیس أبی (الحجر: ۳۱)

ترجمہ: مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا۔

(۳) فسجدوا إلا ابلیس أبی (طہ: ۱۱۶)

ترجمہ: سجدہ کیا (ملائکہ نے) مگر ابلیس اس نے انکار کر دیا۔

لیکن انواع نار کے تعلق سے قابل غور بات یہ ہے کہ وہ جنس آخر کس طرح تقریباً کلی طور پر تباہی سے دوچار ہو گئی؟ اس کے متعدد اسباب اور مخصوص تدریج ہو سکتی ہے:

(۱) سب سے قبل تو خود اس جنس نے آپس میں فساد برپا کیا اور پھر خوں ریزی کی اور اس طرح خود کو تباہ کیا۔

(۲) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور ملائکہ کی فوج کے ذریعہ ان کی اکثریت کا خاتمہ کروا دیا۔

(۳) ان میں سے کچھ جن بھاگ کر چھپ گئے اور کچھ ابلیس کے ساتھ تھے اور انہوں نے نافرمانی کی۔ یہی وہ بات تھی جس کی طرف قرآن نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے کہ بلاشبہ سب سے نمایاں ابلیس ضرور تھا نافرمانی کرنے میں لیکن وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ اور بھی جن شامل تھے۔ چنانچہ قرآن نے فرمایا ہے:

(۱) وکان من الکافرین (البقرہ :۳۴)

ترجمہ: اور وہ بن گیا انکار کرنے والوں میں سے

(۲) ان یکون مع الساجدین (الحجر : ۳۱)

ترجمہ: کہ وہ ہو جائے سجدہ کرنے والوں میں سے۔

(۳) وکان من الکافرین۔ (ص: ۷۴)

ترجمہ: اور وہ ہو گیا ان لوگوں میں جنہوں نے نافرمانی کی۔

اس طرح یہ سارے جن مردود اور مرجوم قرار پائے۔ چنانچہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اسے مہلت دی جائے تاکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ درست تھا اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ غلط۔ چنانچہ اس درخواست کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

(۱) قال انظرنی إلی یوم یبعثون۔ (الاعراف : ۱۴)

ترجمہ: اس نے کہا مجھے بعث کے دن تک مہلت دی جائے۔

(۲) قال رب فانظرنی إلی یوم یبعثون۔ (الحجر:۳۶) اور (ص:۷۹)

ترجمہ: اس نے کہا کہ اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے دے۔

## ابلیس، الشیاطین وغیرھم کی حقیقت:

اگرچہ یہ بات فائدے سے خالی نہیں ہوتی کہ ابلیس اور الشیطان کی لغوی اور لفظی بحث سے یہاں تعارض کیا جاتا لیکن اس عاجز کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بحث اس حصے کو طول دے دینے کا باعث ہو گی۔ اس لیے ان پر بغیر بحث کیے ان دونوں کے صرف ایک ایک معنی متعین کر کے اس تعلق سے بقیہ باتیں عرض کروں۔ ان دونوں کے لغوی معانی درج ذیل ہیں:

(۱) ابلیس ۔ تباہ کرنے والا

(۲) شیطان ۔ رکاوٹ ڈالنے والا۔ دور کرنے والا۔ مخالف

(۱) ابلیس: ابلیس مرکز و محور شر ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ ابلیس ـــــ نام نہیں بلکہ لقب ہے ـــــ جس کا مفہوم ہے تباہ کرنے والا ـــــ برباد کرنے والا ـــــ ابلیس جس فرد مخلوق کا لقب ہے اس کا اس سے قبل لقب عزائیل تھا۔ یہ دونوں ہی لقب اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے یا ملائکہ میں مشہور معلوم ہوتے ہیں۔ ابلیس اپنی نوع کے اعتبار سے ابناء نار یا انواع نار میں سے ہے۔ اس کا اصلی نام اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ یہ بات بھی واضح کی گئی کہ ابلیس کا یہ موجودہ لقب دراصل اس کی اس خدمت کے صلے میں دیا گیا جو اس نے نسل جن یا ابنائے نار کے مفسدوں کے کلی خاتمے

کے تعلق سے انجام دیا تھا۔ لیکن یہی کام اور اس پر دیا گیا لقب اس کے لیے بالآخر فتنہ ثابت ہوا۔ اپنی اس خدمت اور اس پر ہمت افزائی کے نتیجے میں وہ متکبر اور مغرور ہو کر سرکش ہو گیا۔ قرآن کے مطابق ابلیس اللہ کا نافرمان ضرور ہے اس لیے کہ اس نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی۔ لیکن وہ نہ تو اس کا منکر ہے کہ اللہ کو حکم دینے کا اختیار اور حق ہے نہ وہ اس بات کا منکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ قرآن نے ابلیس کے تعلق سے جو نقطۂ نظر اور موقف پیش فرمایا ہے وہ دو باتوں پر قائم ہے:

(۱) پہلی بات : أبی واستکبر (اس نے انکار کر دیا اور استکبار کیا)

(۲) دوسری بات : وکان من الکافرین (اور وہ کافروں میں سے ہو گیا)

پہلی بات یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس سے دو باتوں کا صدور ہوا۔ اس کا پہلا عمل تھا۔ أبی۔ أبی کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ پہلا معنی یہ کہ تمام ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے لیکن ابلیس سجدہ ریز نہیں ہوا۔ دوسرا معنی یہ کہ جب ملائکہ کو حکم دیا گیا تو سارے ملائکہ سجدہ ریز ہو گئے اور ابلیس نے کہا کہ میں آدم کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اور اس نے سجدہ نہیں کیا۔

ابلیس کا دوسرا ردعمل تھا ــ استکبر ــ عام طور پر اس کے معانی یہ لیے جاتے ہیں:

ابلیس نے تکبر کیا یا تکبر میں پڑ گیا یا تکبر کے گھمنڈ میں پڑ گیا۔ جب کہ اس کے دو مفہوم سمجھ میں آتے ہیں جو زیادہ حسب حال ہیں:

(۱) ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ وہ انہیں خلیفہ کے مقام پر فائز کریں اور ملائکہ اور آدم کو حکم دیں کہ وہ ابلیس کو سجدہ کریں۔

(۲) یا ابلیس نے براہ راست ملائکہ اور آدم کو حکم دیا کہ وہ لوگ اسے خلیفہ تسلیم کر کے ابلیس کو سجدہ کریں۔

ظاہر ہے یہ دونوں عمل یعنی أبی اور استکبر اسے کافر بنانے کے لیے کافی تھے۔

جہاں تک ذات باری تعالیٰ کی بات ہے تو اس تعلق سے قرآن نے ابلیس کا موقف واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ ابلیس ذات باری تعالیٰ کو رب تسلیم کرتا ہے۔

(۱) قال رب فانظرنی إلی یوم یبعثون۔ (الحجر: ۳۶)

ترجمہ: اس نے کہا اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے۔

(۲) قال رب فانظرنی إلی یوم یبعثون (ص:۷۹)

ترجمہ:اس نے کہا اے رب! پس تو مجھے بعث کے دن تک مہلت دے دے۔

ان دونوں مقامات پر رب سے مراد اے مرے رب ہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ کسی صورت سے باری تعالیٰ کے اقتدار کو چیلنج نہیں کرتا بلکہ اس کی حیثیت کا قائل ہے اور اپنے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ ہر ہر اعتبار سے اس اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیتوں میں لفظ فانظرنی، اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب المیہ اور انسان کے لیے آزمائش ہے کہ ابلیس کی کوششوں کا بنیادی محور انسان سے گناہ کروانا نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا انکار کروانا اور اپنی حیات سے حضرت باری تعالیٰ کی ایک ایک نشانی کو مٹا دینے کی ہے۔ جب کہ خود ابلیس کی پوری ذات حتی کے اس کی موجودہ زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزر رہی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا:

قال فاخرج منها فانك رجیم. (ص : ۷۷)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ) نے حکم دیا: نکل اس سے بے شک تو دھتکارا ہوا ہو گیا۔

لیکن اس نے اپنے کو اطاعت الٰہی کے دائرے سے نکلنے سے اس طرح بچا لیا کہ اس نے درخواست پیش کی رب فانظرنی إلی یوم یبعثون اے میرے رب! مجھے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ درخواست قبول فرمالی۔ اور فرمایا:

(۱) قال فانك من المنظرین إلی یوم الوقت المعلوم.

(الحجر :۳۷۔۳۸)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے) کہا: بیشک تو ان لوگوں میں سے ہو گیا جن کو وقت معلوم کے دن تک مہلت دے دی گئی ہے۔

(۲) قال فانك من المنظرین إلی یوم الوقت المعلوم.

(ص :۸۰۔۸۱)

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے) کہا: بے شک تو ان لوگوں میں سے ہو گیا جن کو وقت معلوم کے دن تک مہلت دے دی گئی ہے۔

اس نے رب تعالیٰ کے تعلق سے اپنے موقف کو مزید واضح اور مؤکد کرتے ہوئے کہا:

**(۱) قال رب بما اغویتنی لازینن لهم فی الارض ولا غوینهم اجمعین إلا عبادك منهم المخلصین.** (الحجر:۳۹۔۴۰)

ترجمہ: (ابلیس نے) کہا: اے رب! جیسا آپ نے مجھے برباد کردیا اسی طرح میں بھی ان سب کو زمین میں لبھادادے کر برباد کردوں گا۔

**(۲) قال بعزتك لاغوینهم اجمعین الا عبادك منهم المخلصین.** (ص:۸۲۔۸۳)

ترجمہ: (ابلیس نے) کہا: اے رب تیری عزت کی قسم! میں ضرور سب کو برباد کردوں گا مگر تیرے مخلص بندوں کے۔

یہاں دوامور نہایت دقیق اور غور طلب ہیں۔ پہلا ــــ **بما**، اور دوسرا ــــ **اغویتنی.**

**بما ــــ**

یہاں بما نہایت دقیق معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس روئے ارضی میں حیات انسانی کی ساری آزمائش اور کائنات میں جاری وساری معرکۂ خیر وشر کی ساری گتھی اور اس کا سارا راز اسی 'بما' میں مضمر ہے۔ یہاں بما کے اندر پائی جانے والی معنویت کو اگر کسی فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے تو وہ اس طرح ہوگا:

(۱) بما ــــ جس بات پر

(۲) بما ــــ جس نکتے پر

(۳) بما ــــ جس پوائنٹ (Point) پر

معرکۂ خیر وشر کے تعلق سے جس بات نے پورے منصوبۂ ربانی میں غیر معمولی انقلاب اور اتھل پتھل پیدا کردی ہو وہ بات ایسی نہیں کہ انسان اس سے سرسری طور پر گزر جائے۔ ابلیس جیسے صاحب علم ور صاحب فہم سے یہ بات بعید تھی کہ وہ اتنے بڑے فیصلے کے خلاف خود بارگاہ رب العزت میں اپنا استغاثہ اور مرافعہ کسی لچر اور بے وزن بات کہہ کر پیش کرے۔ اور اس کی پیش کی گئی بات ــــ خواہ کتنی ہی نادرست کیوں نہ ہو ــــ لیکن وہ اتنی وزنی ضرور تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نادرستگی اور اپنے فیصلے کی اصابت کو ثابت کرنے کے لیے حجت پوری کرنے اور اس کے لیے حیات ارضی میں آبادکاری کی مخصوص سنت جاری فرمانے کا فیصلہ کیا۔ دراصل اس لفظ پر غور کیا جانا ہم انسانوں کے لیے بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں درک انسان کو معرکۂ خیر وشر کے

سمجھنے، اپنے منصب کا ادراک کرنے اور توحید، رسالت اور آخرت کو سمجھنے میں بنیادی مدد فراہم کرتا ہے۔

## اغویتنی :

دوسرا لفظ جو نہایت دقیق اور غور طلب ہے وہ ہے: ـــ اغویتنی ـــ اغویتنی وہ دوسرا لفظ ہے جو بما کے ساتھ مل کر کائنات کی حقیقت واضح کرتا ہے۔ اس کے اندر پائی جانے والی معنویت کو اگر کسی فقرے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے تو وہ اس طرح ہوگا:

(۱) **اغویتنی** ـــ آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل دیا۔

(۲) **اغویتنی** ـــ آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل دیا اور مجھے برباد کر دیا۔

(۳) **اغویتنی** ـــ آپ نے میرے (بارے میں) فیصلے کو بدل کر مجھے برباد کر دیا۔

(۴) **اغویتنی** ـــ آپ نے (پہلے مرحلے میں) مجھے غلط سوچنے اور کرنے کے لیے چھوڑ دیا (اور دوسرے مرحلے میں میرے بارے میں) فیصلے بدل کر مجھے برباد کر دیا یا ہونے دیا۔

"**بما اغویتنی** دراصل اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے وہ صورت حال اور اس کا تسلسل (Sequence) پوری طرح واضح ہو کہ آخر ابلیس کے دھتکارے جانے سے پہلے کیا ہوا تھا؟ جو ہوا وہ کیسے ہوا؟ اس کی کیا صورت اور ترتیب تھی؟ وہ کیا حالات اور اس کی نزاکتیں تھیں جن میں ابلیس نے اتنا بڑا فیصلہ کیا؟

**بما اغویتنی** سے کئی باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

(۱) ابلیس اپنے دل میں واقعی یہی سمجھتا تھا کہ وہ 'مقام عظیم' جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کا وہی مستحق ہے۔

(۲) لارض میں خلافت کے قائم کیے جانے کا اعلان، اس کے بعد آدم کی عالم عصر میں تخلیق اور پھر اس کے بعد اسے سجدہ کرنے لیے ملائکہ کو حکم دیا جانا جس میں ابلیس بھی شامل تھا دراصل ابلیس کے لیے حیران کن، مایوس کن، اور ہولناک تھا۔ خواہ وہ ایسا کیے جانے کا اصل سبب نہ جانتا ہو لیکن اس نے یہی قیاس کیا کہ یہ فیصلہ دراصل اس 'مقام عظیم' جس کا وہ خود کو مستحق سمجھتا تھا اس سے معزولی کا اعلان پہلے ہے اور سجدہ کرنے کا حکم بعد میں۔ اور ایسا سمجھنے میں وہ اپنی

جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس کی معزولی کا حکم پہلے تھا اور سجدہ کرنے کا بعد میں۔

(۳) لہٰذا لازمی طور پر کائنات میں واقع ہونے والے اتنے بڑے حادثے کی کنہ تک پہنچنے کی ضرورت اس کی پہلی ترجیح بن گئی اور اس کی ساری توجہ 'بما' پر مرکوز ہو گئی۔ آخر وہ کیا بات ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا؟ اس سے کیا چوک ہو گئی؟ ایسا لگتا ہے کہ اس کی نظر وہاں پڑ گئی جو اس فیصلے کا سبب ہو سکتی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ دل میں اپنے بڑے ہونے صاحب علم، صاحب تقویٰ، اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہونے اور اس تناظر میں اس مقام عظیم کا اپنے کو مستحق سمجھنے کے مرحلے سے گزرا ہے۔ اور یہ سبب بنا ہو اس کے معزول کیے جانے کا — ایسا لگتا ہے کہ وہ اس کا قائل ہوا کہ ایسا سمجھنا غلط تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ دو باتوں کے تعلق سے اس کی ایک خاص رائے قائم ہو گئی:

(۱) پہلی بات یہ کہ اس نے ایسا سوچا تو غلط کیا۔ لیکن وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسا سوچنا غلط تو نہیں تھا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ وہ اب تک اللہ کا مطیع و فرمانبردار اور اطاعت شعار رہا ہے اگر اس نے ایسا سوچا اور ایسا سوچنا غلط تھا تو اس کی اطاعت کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اس کا حق تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جبر سے روک دیتا اور اسے معزول ہونے سے بچا لیتا۔ وہ اس رعایت یا جانبداری (Grace cr Favour) کا مستحق تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا اور گویا اس اعتبار سے اس پر ظلم کیا گیا یا اس کے ساتھ غیر عادلانہ سلوک کیا گیا اور انسان کے ساتھ غیر معمولی حمایت (Favour) یا جانبداری کا سلوک روا رکھا گیا۔

(۱) ہر چند کہ فی الحقیقت ایسا نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے سوچا کہ ابلیس کا ایسا سوچنا حقیقتاً درست نہیں تاہم اس کے ظواہر کے اعتبار سے ابلیس ایسا سوچ سکتا ہے اور اس طرح اس کا سوچنا معتبر بھی ہے اور وزنی بھی جو اس کا تقاضا کرتا ہے کہ اس پر حجت قائم کی جائے۔

(۲) دوسرا نکتہ پہلے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ یعنی ابلیس کا ایسا کہنا کہ وہ رعایت (Grace) اور جانبداری (Favour) کا مستحق تھا۔ لیکن اس کے ساتھ نہ رعایت کی گئی نہ جانبداری، بلکہ اس کے تمام سابقہ کردار کے باوجود اس کے برخلاف آدم کے ساتھ صریح جانبداری کی گئی۔

یہ بات بظاہر زیادہ وزنی تھی۔

یہی ہے وہ مطلب ہے جو 'بما اغویتنی' میں پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استغاثہ یا مرافعہ بارگاہ رب العزت میں اور خود اس ذات باری تعالیٰ کے خلاف دائر کی گئی۔ ہر چند کہ کسی مخلوق کا یہ حق نہیں لیکن یہ بھی اللہ کی سنت ہی ہے کہ وہ عادل حقیقی ہے۔ یہ دادرسی غلط سہی لیکن اللہ کی یہ سنت اسے سنے جانے اور اس پر حجت قائم کیے جانے کو جائز رکھتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کا ایک اور ظہور فرمایا اور ایک نئی سنت جاری فرمادی۔ اور اس کے تحت ابلیس کے استغاثہ کو تین شقوں میں بانٹ کر حجت قائم کرنے کے لیے قبول فرمالیا۔

(۱) پہلی شق ـــ ابلیس کا اپنے مطیع و فرمانبردار ہونے پر اپنے کو مستحق سمجھنا غلط تھا۔

(۲) دوسری شق ـــ آدم کے ساتھ رعایت (Grace) کی گئی اور ابلیس کے ساتھ عدم رعایت۔

(۳) تیسری شق ـــ آدم کے ساتھ جانبداری (Favour) کی گئی اور ابلیس کے ساتھ عدم جانبداری۔

اس نئی سنت کی وضاحت کے لیے ہم ترتیب میں تبدیلی کرتے ہوئے سب سے پہلے دوسری شق کو زیر بحث لاتے ہیں پھر تیسری اور سب سے آخر میں پہلی شق زیر بحث آئے گی۔

## دوسری شق :

ہر چند کہ فی الواقع ایسا نہیں تھا لیکن محض حجت قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ابلیس کے ساتھ علانیہ رعایت (Grace) کا معاملہ کیا اور کہا کہ اگر اسے یہ خیال ہے ـــ جو اپنی جگہ غلط سہی کہ اس کے ساتھ رعایت نہیں کی گئی تو اللہ اس کے ساتھ اس معاملے میں رعایت کا اعلان کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ اس نے حکم عدولی کی ہے اسے رعایت دیتا ہے:

**قال فانك من المنظرين ـــ**

یہاں دو نکتے اہم ہیں۔

(۱) ابلیس کا اصلی جرم تو سجدہ نہ کرنا ہے۔

(۲) المنظرین ـــ میں اجازت دیئے جانے کے بعد سے الوقت المعلوم تک کی مدت میں ابلیس کے ذریعہ کیا گیا عمل اس کے لیے 'فرد جرم' میں شامل نہیں۔

چنانچہ ایک کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اسے دو رعایتوں (Grace) سے نوازا۔ یعنی پہلی رعایت یہ کہ حکم عدولی کے فوراً بعد اسے سزا نہیں دی۔ فاخرج (نکل جاؤ) اور فانک رجیم (پس تو مردود قرار دے دیا گیا) سزا نہیں یہ تو صرف ناراضگی ہے۔ دوسری رعایت یہ کہ المنظرین سے الوقت المعلوم تک کی پوری مدت گویا "چھوٹ" میں داخل ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابلیس کئی بار آنحضور ﷺ کی گرفت میں آیا اور آپ اس پر قادر تھے کہ اس کو ہلاک کر دیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

## تیسری شق :

تیسری شق کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے حجت اس طرح قائم کی کہ جس آدم کے تعلق سے جانبداری کا الزام لگایا گیا تھا اس کے ساتھ عدم جانبداری اور ابلیس کے ساتھ جانبداری کی سنت جاری فرمائی۔ اور وہ سنت درج ذیل طریقے سے روبہ عمل لائی گئی:

(ا) آدم کو زمین پر بھیج کر۔ چنانچہ:

(ا) حدیث: **حجبت النار بالشهوات و حجبت الجنة بالمكاره**
**(متفق عليه الا عند مسلم حفت بدل حجبت)**

ترجمہ: جہنم شہوات سے چھپادی گئی اور جنت تکلیف دہ، مشکل، ناپسندیدہ اور گراں چیزوں سے (متفق علیہ سوائے مسلم کے جس نے چھپادی گئی ہے کے بجائے ڈھانپ دی گئی ہے لکھا ہے)

(۲) حدیث: **الدنيا سجن المومن وجنت الكافر** (رواہ مسلم)

ترجمہ: دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

(الف) زمین پر اہل حق اور معرکۂ حق کی پوری تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ اہل حق حزب اللہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ مفلس، تنگ دست، مظلوم، اذیت دیئے گئے اور بے چارگی کی حالت میں رہے۔ اور اہل باطل حزب الشیطان ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ خوشحال، ظلم پر قادر اور اذیت دینے والے اور آزاد اور بظاہر بے مہار رہے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف حضرت

موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے سورہ یونس میں اشارہ کیا گیا ہے:

**وقال موسیٰ ربنا انك آتیت فرعون وملائه زینة واموالا فی الحیوٰة الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلك ربنا اطمس علی اموالهم واشدد علی قلوبهم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم.**

ترجمہ: اور موسیٰ نے دعا کی "اے ہمارے رب تونے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب ان کے مال کو بے اثر کردے اور ان کے دلوں پر سختی کردے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔"

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ایک طرف ایک برگزیدہ اور اولوالعزم رسول اور نبی نے اپنے اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی دعا کی جو ہر چند کہ صرف اللہ کی رضا اور اس کی سربلندی کے لیے تھی اور اس میں ذرہ برابر بھی کوئی اور جذبہ پوشیدہ نہ تھا لیکن وہ دعا اس روئے زمین پر معرکۂ خیر و شر کے بنیادی ربانی ضابطوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعا کی مقصدیت کو اجابت نصیب فرمائی لیکن دعا کے ظاہر کو قبول نہیں فرمایا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس پر اپنے دونوں اولوالعزم انبیاء کو خصوصی ہدایت دی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جو منصوبۂ ربانی کے مطابق نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

**"قال قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس:۸۹)**

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

چنانچہ بعد میں جو نتائج برآمد ہوئے وہ یہ نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مال چھین لیے اور انہیں کنگال کردیا اور اس کی فوج اور اس کے اسلحے مالی تنگی کے سبب بے اثر ہوگئے بلکہ دعا کی قبولیت دوسری طرح سے ظاہر ہوئی اور وہ یہ کہ وہ اور اس کی فوج اپنی پوری قوت قاہرہ سے پیچھا کرتے ہوئے عین بیچ سمندر میں غرق ہوگئے۔ یہاں لطیف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ان دونوں کے متعلق سبیل المفسدین کہا نہ سبیل الظالمین کہا نہ سبیل الذین ظلموا وغیرہ کہا بلکہ فرمایا سبیل الذین لا یعلمون۔ اس سے بہتر خیر خواہانہ اور مشفقانہ تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی؟

(ب) دنیا کی معلوم تاریخ کے جو کم از کم دس ہزار سالوں پر محیط ہے جس کی کچھ نہ کچھ تفصیل ضرور دستیاب ہے مطالعے سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کی کنہہ کو ظاہر کرنے کے لیے اسے درج ذیل دو طریقوں سے بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) اگر روئے زمین کی تاریخ ایک لق ودق صحرا مان لی جائے تو اس میں باطل اور اللہ کے باغی اور ابلیس کے پیروکاروں اور ان کا نظام سینکڑوں میل پر پھیلے بے آب وگیاہ صحرا کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان میں آنے والے انبیاء اور بطور خاص اولوا العزم انبیاء جو نظام شر کو شکست دے کر حق قائم کرنے والے ہوئے سینکڑوں میلوں کے بے آب وگیاہ صحرا کے بعد دو چار میل پر پھیلے نخلستان کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی سینکڑوں میل تک پھیلے بے آب وگیاہ صحرا کے بعد صرف چند میلوں کے نخلستان جہاں پانی اور سرسبزی ہو۔ اور پھر سینکڑوں میلوں پر پھیلی تپتی دھوپ اور گرم ریت کے تھپیڑے۔

(۲) اگر روئے زمین کی تاریخ کو حکومت مان لیا جائے تو اس میں سینکڑوں سالوں پر پھیلی باطل کی وحشیانہ اور آمرانہ حکومت جہاں انبیاء اور اہل حق حزب مخالف شمار ہو کر غیر قانونی اور باغی اور مستحق اذیت قرار پائے اور سینکڑوں سالوں کے بعد چند مہینوں اور چند سالوں پر محیط اولوالعزم انبیاء کی عادلانہ حکومت جو تھوڑی ہی مدت کے بعد ختم ہو جائے اور پھر سینکڑوں سالوں پر پھیلنے والا وحشیانہ اور آمرانہ حکومت کا دور۔

دراصل اس کی کنہہ یہی وہ سنت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر اس کے اس اعتراض پر اپنی حجت قائم کرنے کے لیے جاری فرمائی ہے جس میں ابلیس نے الزام لگایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کے ساتھ جانبداری کی ہے اور ابلیس کے ساتھ عدم جانبداری۔ زمین پر اللہ تعالیٰ نے پوری تاریخ میں ثابت کر دیا کہ اس نے مال، متاع، طاقت، قوت، جبر یا صلاحیت ہر اعتبار سے ابلیس اور اس کے متبعین کو سب کچھ دیا اور اپنے لوگوں کو اس لق ودق صحرا میں ان کے یقین اور ایمان پر چھوڑ دیا۔

(۲) ابلیس کو اس دنیا میں کچھ بھی کرنے کے لیے مکمل آزادی دے کر:

حیات ارضی میں انسان کی مدت حیات میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پوری آزادی اور وسائل دیئے کہ وہ جس طرح چاہے اس سے انسان سے اپنے مقاصد پورا کرنے کے لیے معاملہ کرے۔

## پہلی شق :

ابلیس کا پہلا اعتراض یہی تھا کہ اس نے ہمیشہ اللہ کی فرمانبرداری کی، اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے کو وقف کر دیا اس کے لیے سارے کام کیے یہاں تک کہ خود ملائکہ کی فوج لے کر اللہ کے حکم سے اپنی نوع یعنی ابناء نار کی اکثریت کا جو مفسدین تھے صفایا کر دیا لہٰذا وہ ـــــ بلکہ صرف وہی ـــــ اس کا مستحق تھا کہ اسے وہ مقام عظیم دیا جاتا۔ ابلیس کا خیال تھا کہ اسے اس کا استحقاق تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کسی بندے کی یہ شان عبدیت نہیں کہ وہ استحقاق کا دعویٰ کرے۔ شان عبدیت کی انتہا یہ ہے کہ اس کے دل اور لب پر یہ بات ہو:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر اسی بنیادی حجت کو پورا کرنے کے لیے آدم کے لیے منصوبۂ حیات ارضی جاری فرمایا۔ چنانچہ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے انبیاء نے اسی کو ثابت کر دیا۔ اور اللہ کے اولوالعزم انبیاء نے تو وہ مثال قائم کر دی جو انسان ہی نہیں ساری مخلوقات کے لیے سرمایہ حیات ہے۔ اور وہ غیر معمولی اسوہ جو ان انبیاء کرام نے قائم فرمایا یہ تھا: "اپنی جان اپنا مال اپنی زندگی کی ہر چیز اللہ کی رضا کے لیے قربان کر دینا اور اس کے بعد بھی یہی اظہار کہ اے اللہ آپ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ ہم اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ہمیں معاف فرما دیجئے۔"

### (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام :

(۱) **واذابتلی ابراھیم ربه بکلمٰت فاتمھن** (البقرہ :۱۲۴)

ترجمہ: اور جب ابراہیم کے رب نے اسے کلمات سے آزمایا تو اس نے انہیں پورا کر دیا۔

(۲) **فلما اسلما وتلهٗ للجبین ونادینٰه ان یا براھیم قد صدقت الروبا ان کذلك نجزی المحسنین ان ھذا لھو البلٰوا المبین وفدینٰه بذبح عظیم** (الصافات: ۱۰۳۔۱۰۷)

ترجمہ: پس جب (ابراہیم اور اسمٰعیل) دونوں نے اس حکم کو سر بسر مان لیا اور اس (ابراہیم) نے اس (اسمٰعیل) کو چہرے کے بل لٹا دیا (یعنی ذبح کر دیا) تو ہم نے آواز دی: اے ابراہیم بے شک تم نے رویا کے حکم کو پورا کر دیا بے شک ہم انہیں جزا دیتے ہیں جو صرف میرے لیے سب کچھ کر ڈالیں۔ بے شک یہی وہ کھلی آزمائش

تھی۔اور دیکھ ہم نے اس ذبح عظیم کو فدیہ کر دیا۔

(۳) واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم ربنا واجعلنامسلمین لك ومن ذریتنا امة مسلمة لك وارنا مناسکنا وتب علینا انك انت التواب الرحیم (البقرہ: ۱۲۷۔۱۲۸)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم بنیادیں البیت کی اور اسمٰعیل (تو ان دونوں نے دعا کی تھی) اے ہمارے رب! قبول کر ہم سے۔بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔اے ہمارے رب! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی اور بتا ہم کو مناسک ہمارے اور ہم کو معاف کر دے۔بے شک آپ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔

(۴) واذقال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمین (البقرہ: ۱۳۱)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا۔

## (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

(۱) واذ قال الله یا عیسیٰ ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون الله قال سبحٰنك ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق ان کنت قلتهٗ فقد علمتهٗ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك انك انت علام الغیوب. ما قلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی وربکم وکنت علیهم شهیدا" مادمت فیهم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم وانت علی کلی شئی شهید. (المائدہ: ۱۱۶۔۱۱۷)

ترجمہ: اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے! تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے۔کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔بے شک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا۔میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم دیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا پھر جب تو نے مجھ پر اپنی قدرت دکھائی تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی اور تو ہر چیز سے خبردار ہے۔

(۲) ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفرلهم انك فانت العزیز الحکیم (المائدہ:۱۱۸)

ترجمہ: اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کردے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا۔

## (۳) حضرت محمد ﷺ :

(۱) **اللهم اليك اشكو ضعف قوتى وقلة حيلتى وهو انى على الناس ياارحم الراحمين انت رب المستضعفين وانت ربى، الى من تكلنى؟ الى بعيد يتجهمنى؟ أم إلى عدو ملكته أمرى؟ ان لم يكن بك على غضب فلا ابالى ولكن عافيتك هى أوسع لى، اعوذ بنور وجهك الذى اشرقت له الظلمات صلح عليه امرى الدنيا والآخرةمن أن تنزل بى غضبك أويحل على سخطك لك العتبى حتى ترضى ولا حول ولاقوة الا بك۔** (السيرة النبوية لابن هشام)

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے ہی اپنی طاقت کی کمزوری اپنے تصرف کی قوت کی کمی اور لوگوں کے سامنے اپنی بے وقعتی کی فریاد کرتا ہوں۔ اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے! آپ کمزور بنادیئے جانے والوں کے رب ہیں۔ آپ میرے رب ہیں۔ آپ نے مجھے کس کے حوالے کردیا؟ کس غیر کے جو مجھ پر تیوریاں چڑھائے رکھتا ہے؟ یا کسی دشمن کے جس کو مجھ پر قابو مل گیا ہو؟ اگر آپ کی مجھ پر ناراضگی نہیں تو مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ ہر صورتحال میں بھی آپ کی عافیت میرے لیے اوسع ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور سے جس سے تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں پناہ طلب کرتا ہوں جس سے دنیا اور آخرۃ کے امر سنور جاتے ہیں۔ میں اس سے پناہ چاہتا ہوں کہ میرے اوپر آپ کا غضب اترے یا مجھ پر آپ کی ناپسندیدگی واجب ہو جائے۔ میرے لیے آپ کا عتاب ہی ہے جب تک آپ راضی نہ ہو جائیں اور کوئی طاقت ہے نہ قوت مگر آپ کی۔

(۲) **عن ابى هريره قال قال رسول الله ﷺ والله انى لاستغفر الله واتوب اليه فى اليوم اكثر من سبعين مرة۔** (رواه البخارى)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: اللہ کی قسم! میں دن بھر میں ستر بار سے زائد اللہ تعالیٰ سے استغفار اور توبہ کی دعا کرتا ہے۔

(۳) **عن ابى هريره قال قال رسول الله ﷺ والذى نفسى بيده لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجا بقوم يذنبون فيستغفرون الله**

انیغفرلهم (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم لوگوں نے گناہ نہ کیے ہوتے تو اللہ تمہیں ہٹا کر دوسری قوم کو لے آتا جو گناہ کرتی اور اللہ سے استغفار کرتی اور اللہ ان کو معاف کرتا۔

(۴) عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ سید الاستغفار ان تقول اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی وانا عبدك وانا علی عهدك ووعدك ما استعطت اعوذ بك من شرما صنعت ابوء لك بنعمتك علی وابوء بذنبی فاغفرلی فإنه لا یغفرالذنوب الا انت..... (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: سیدالاستغفار یہ ہے کہ تم کہو: اللهم انت ربی لا اله الا انت خلقتنی.....

(۵) عن عائشه رضی الله عنها قالت : كان رسول الله ﷺ یکثر ان یقول قبل موته: سبحان الله وبحمده، استغفر الله واتوب الیه۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں: آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی وفات سے قبل اکثر کہا کرتے تھے: سبحان الله وبحمده، استغفرالله واتوب الیه۔

(۶) قال الهیشمی عن عائشة رضی الله عنها: قال فكان رسول الله ﷺ بعد ذلك لا یاكل مكتئاً یقول: آكل كما یاكل العبد واجلس كما یجلس العبد ( )

ترجمہ: حضرت ہیثمی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: کہا پس رسول اللہ ﷺ اس کے بعد نہیں کھاتے تھے ٹیک لگا کر: وہ فرمایا کرتے تھے: میں اس طرح کھاتا ہوں جیسے کوئی غلام کھاتا ہے۔ اور میں اسی طرح بیٹھتا ہوں جیسے کوئی غلام بیٹھتا ہے۔

(۷) عن ابن مسعود ان رسول الله ﷺ قال من كثر همه فلیقل اللهم انی عبدك وابن عبدك وابن امتك وفی قبضتك ناصیتی بیدك انی حكمك عدل فی قضاوك اسئلك بكل اسم هولك..... (رواه رزین)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
جس کو پریشانیوں کی کثرت ہو وہ کہے (یعنی اس طرح دعا کرے): اے اللہ میں آپ کا غلام ہوں۔ اور آپ کے غلام کا بیٹا ہوں اور آپ کی لونڈی کا بیٹا ہوں اور تیری مٹھی میں میری پیشانی کے بال ہیں۔ تیرے حکم سے ہر کچھ ہوتا ہے۔ تیرے فیصلے میں عدل ہے میں تیرے تمام ناموں سے جو تیرے ہیں تجھ سے طلب کرتا ہوں.....

چنانچہ روئے زمین پر اللہ کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین نے یہی بات ثابت کی ہے۔ ان کی پوری زندگی دو باتوں سے عبارت ہے:

(۱) پہلی بات یہ کہ یہ تمام اشخاص محسنین رہے اور صرف اور صرف اللہ کی جانب متوجہ رہے اور ان کا شیوہ رہا: ان صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی لله رب الغلمین۔

ترجمہ: اے اللہ بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ سارے اشخاص اس بات کا اقرار کرنے والے رہے کہ اے اللہ ہم آپ کا، آپ کے احکامات کا اور اس کے تقاضوں کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے ہم اپنی کوتاہیوں کے لیے آپ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ہمیں آپ معاف کر دیجئے۔

یہ عمل حضرت آدم علیہ السلام سے بلا فصل جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمین پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور رسول اور نبی آخر الزماں آنحضور ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ نے نہ صرف اپنی بعثت کا مشن پورا کیا بلکہ اس روئے ارض پر رسالت کے کل مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ چنانچہ جب اس روئے ارض پر جاری معرکہ حق و باطل میں وہ آخری مرحلہ شروع ہوا جب نفس رسالت اپنے مشن کے واقعی (Virtual) تکمیل کے آخری مرحلے میں قدم رکھنے لگی اور روئے زمین پر حق کے لیے آخری ہجرت ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا آغاز اس ادب آموزی سے کیا:

**فاعلم انه لا اله الا الله واستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنت والله يعلم متقلبكم ومثوكم۔** (محمد: ۱۹)

ترجمہ: سوائے رسول! آپ جان لیجئے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی طلب کیجئے اپنے گناہ کی اور اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی اور اللہ خوب جانتا ہے چلت پھرت تم سبھوں کی اور یہ کہ تم سبھوں کا کہاں ٹھکانہ ہے۔

اور روئے ارض پر نفس رسالت کا مشن اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور اس کی تکمیل ہو گئی اور زمین پر اللہ کی حجت ابلیس پر ہر طرح سے قائم ہو گئی تو پھر اس ادب آموزی کی تکرار ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ تکرار اس وقت ہوئی جب باضابطہ مشن کے کما حقہ پورا ہونے کی تصدیق خود باری تعالیٰ نے کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۱) انا فتحنا لك فتحاً مبينا (الفتح : ۱)

ترجمہ: بے شک ہم نے فیصلہ کر دیا آپ کے لیے کھلا فیصلہ۔

(۲) اليوم يئس الذين كفروا من دينكم فلا تخشوهم واخشون (المائدہ: ۲)

ترجمہ: آج مایوس ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تمہارے دین سے سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔

(۳) اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا (المائدہ: ۳)

ترجمہ: آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

اور اسی طرح یہ بھی ایک ادب آموزی ہی تھی:

اذا جاء نصر الله والفتح ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجاً فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا (النصر)

ترجمہ: جب اللہ کی مدد (نصر اللہ) اور فتح پہنچ جائے اور آپ دیکھیں لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین (دین اللہ) میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ پاکی بیان کریں اپنے رب کی اور استغفار کریں اس سے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

## (۲) الشيطان :

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ شطن کے معانی ہیں رکاوٹ ڈالنا، دور کرنا، اور اسی سے شیطان مشتق ہے جس کے لغوی معنی رکاوٹ ڈالنے والا اور دور ہٹانے والا ہے اور اصطلاحی معنی خیر کا مخالف۔ یہ دونوں معنوں میں رائج ہے۔ پہلے معنی میں یہ ابلیس کا موجودہ لقب ہے۔ یعنی الشیطان اور دوسرے معنی میں یہ ان تمام مخلوقات کے لیے بولا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق انواع نور سے ہو یا انواع نار سے یا انواع ارض سے جو انسانوں کو باری تعالیٰ اور خیر کے قریب آنے سے روکیں یا ان

سے دور کردیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عزائیل اور ابلیس دونوں ہی ایک مخصوص جن یا بنی نار کے فرد کے القاب ہیں۔ اس کا اصلی یا ذاتی نام صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ پہلے اس جن یا بنی نار کے فرد کا لقب عزائیل تھا۔ جب اس نے اللہ کے حکم اور دیگر ملائکہ کی مدد سے مفسد جنوں کا خاتمہ کر دیا تو اس کا لقب ابلیس دیا گیا۔ الشیطان اس کا تیسرا لقب ہے جو ابلیس کے بعد دیا گیا۔ یہ ایک نہایت دقیق نکتہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

جس وقت خلافت آدم کا اعلان اور سجدۂ آدم کا حکم ہوا اس وقت تک یہ جن ابلیس کے لقب سے موسوم تھا جو اس کے پہلے عمل سے متعلق تھا۔ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار اور اپنی خلافت ارضی کا مطالبہ کرنے کے بعد جب اسے مہلت دے دی گئی اور اس نے تزئین اور اغواء کا عمل شروع کر دیا تو اس کو اللہ تعالیٰ نے الشیطان کا لقب دیا۔

چنانچہ اس تبدیلی اور اس کے موقع و محل کی طرف بڑا ہی لطیف اشارہ قرآن نے کیا ہے:

البقرہ آیت: ۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے اس جن کو جب کہ اس نے انکار اور استکبار نہیں کیا تھا ابلیس کہہ کر پکارا ہے۔ جو فی الواقع اس وقت تک اس کا لقب تھا لیکن اس کے معا بعد آیت: ۳۶ میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا:

فازلهما الشيطان عنها فاخرجهما مما كانا فيه۔ (البقرہ:۳۶)

ترجمہ: پس ہلا دیا ان دونوں کو شیطان نے وہاں سے اور نکال باہر کیا جہاں وہ دونوں تھے وہاں سے۔

چنانچہ ابلیس کا موجودہ لقب الشیطان ہے جو مکمل طور پر "الشیطان الرجیم" کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا لقب قرآن میں کم و بیش گیارہ بار اور الشیطان اڑسٹھ بار استعمال کیا گیا۔ اور یہی وہ شخص ہے جس کا ذکر "اعوذ بالله من الشيطا ن الرجيم" میں کیا گیا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کو قرآن نے "عدو الله" اور انسان کے لیے 'عدو مبین' کہا ہے۔ یہی الشیطان موجود حیات میں قوای شر کا قلب ہے۔ اس لیے اس حیات یعنی عالم عصر میں اللہ تعالیٰ نے اس کے تعلق سے انسان کو اپنے بنیادی موقف سے آگاہ کیا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ان الشيطان لكم عدوٌ فاتخذوه عدوا۔ (الفاطر:۶)

ترجمہ: بے شک شیطان تم لوگوں کا دشمن ہے پس تم لوگ بھی اسے دشمن بناؤ۔

یہی لفظ شیطان عام معنی میں ان تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو خیر سے روکیں یا باری تعالیٰ سے لوگوں کو دور کریں۔

## (۳) الشیاطین :

قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرد جو ملائکہ میں سے تھا اور جس نے اپنی خلافت کا مطالبہ کیا تھا وہ بلاشبہ ابلیس تھا لیکن وہ اکیلا شخص نہیں تھا جو اس خیال کا حامل ہو۔ ممکن ہے اس وقت غیر ملائکہ جنوں کی ایک تعداد اس کے ساتھ ہو گئی ہو۔ یا بعد میں ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی ہو۔ اور اس طرح وہ سبھی مردود قرار دیے گئے ہوں۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

(۱) وکان من الکافرین (البقرہ:۳۴)

ترجمہ: اور ہو گیا وہ ان میں جنہوں نے نافرمانی کی۔

(۲) ولقد جعلنا فی السماء بروجاً وزینٰھا للنٰظرین وحفظنٰھا من کل شیطٰن رجیم۔ (الحجر:۱۷)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے بنائے ہیں آسمان میں قلعے اور اس کو سجایا ہے ان کو دیکھنے والوں کے لیے۔ اور محفوظ رکھا ہے ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے۔

چنانچہ یہ تمام لوگ اب شیاطین کہلاتے ہیں۔ ان کی موجودہ صورت حال اور معرکۂ خیر و شر کی وضاحت اور اسکی آنے والی تفصیلات و نزاکتوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

## (الف) طائف من الشیطان :

شیاطین کا یہ ایک مخصوص گروہ ہے جس میں نظم پایا جاتا ہے۔ اور یہ اجتماعی منصوبہ بندی میں شامل ہیں تاکہ ابلیس کے مشن کو کامیاب کریں۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں اس طرح فرمایا ہے:

ان الذین اتقوا اذا مسّھم طائف من الشیطان تذکروا فاذاھم مبصرون۔ (اعراف:۲۰۱)

ترجمہ: جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے پھر

اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔
ممکن ہے یہ ابلیس کی مجلس شوریٰ ہو۔

## (ب) الشياطين الرجيم :

ایسے 'شیاطین جو مردود ہوں' کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

(۱) پہلا مفہوم: وہ خاص الخاص ملائکہ اور غیر ملائکہ کے گروہ جو واقعہ سجدۂ آدم کے وقت موجود ہوں (اور جو ظاہر ہے یا تو ابناء نور یعنی ملک سے ہوں گے یا ابناء نار سے یعنی جن سے) اور ابلیس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی مردود قرار دیا گیا ہو۔

(۲) دوسرا مفہوم: وہ خاص شیاطین جو اتباع ابلیس میں اتنے آگے بڑھ گئے ہوں کہ ان کا شمار بطور خاص کیا گیا ہو قطع نظر اس کے کہ وہ اس وقت موجود ہوں جب واقعہ سجدہ آدم ہوا یا اس کے بعد پیدا ہوئے یا شیاطین میں شمار ہوئے۔

قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

**وحفظنها من كل شيطان رجيم۔** (الحجر:۱۷)

ترجمہ: اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے۔

## (ج) ذرية الشيطان :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابلیس کی اولاد ہیں۔ یہاں دونوں صورت ممکن ہے یا تو ابلیس کے صرف ایک بیٹا یا بیٹی ہے یا ایک سے زائد بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہاں ذریۃ سے کم از کم ایک بات واضح ہے کہ اس میں ابلیس کی معنوی اولاد کا شمار نہیں بلکہ وہ اولاد شامل ہے جو گویا صلبی ہے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

**واذقلنا للملائكة اسجدوا لِادم فسجدوا إلا ابليس كان من الجن ففسق عن امر ربه افتتخذونه وذريته اوليء من دونى وهم لكم عدو بئس للظالمين بدلا۔** (الکہف:۵۰)

ترجمہ: اور جب کہا ہم نے ملائکہ کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس۔ تھا جن کی قسم سے۔ سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے سو کیا اب تم ٹھیراتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق میرے سوائے اور وہ تمہارے دشمن ہیں۔ برا ہاتھ لگا ظالموں کے بدلہ۔

## (د) قبیلۃ الشیطان :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابلیس کے گھرانے کے لوگ ہیں۔(اس کی کچھ تفصیل ان شاءاللہ بعد میں آئے گی) یعنی ابناء نار میں سے وہ قبیلہ جس سے خود ابلیس تھا اس کے وہ لوگ جو اس عذاب سے بچ گئے اور پھر بعد میں جو غیر ملائکہ ہونے کے باوجود ابلیس کے موقف کے حمایتی ہو گئے۔ چنانچہ یہ تمام لوگ اس کا قبیلہ کہلائے خواہ اس میں وہ لوگ ہوں جو اس وقت سے موجود ہوں یا وہ لوگ ہوں جو بعد میں ان کی اولاد ہوئے۔ قرآن نے ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

یٰبنی آدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع عنھما لباسھما لیریھما سوءتھما انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم انا جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون۔ (الاعراف:۲۷)

ترجمہ: اے اولاد آدم فتنہ میں نہ ڈالے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے۔ اتروائے ان سے ان کی پوشیدگی تاکہ ظاہر کروادے ان کے جسم۔ وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کا قبیلہ جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے کر دیا شیطانوں کو رفیق اور ان لوگوں کو جو ایمان نہیں رکھتے۔

## (ہ) جنود ابلیس :

قرآن کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے ایک فوج ترتیب دے رکھی ہے۔(اس کی تفصیلات بھی ان شاءاللہ بعد میں آئیں گی) ظاہر ہے یہ فوج ہر طرح کی مخلوقات پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں ان سے ابناء ارض یعنی انسانوں کے علاوہ مخلوقات جس میں بطور خاص ابناء نور یعنی ملک اور ابناء نار یعنی جن شامل ہیں افواج کا اصلاً ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی ایک نسل کا ذکر نہیں اس نوع میں جتنے ذیلی انواع (Species of a large genus) ہو سکتے ہیں سب ہی شامل ہیں۔ اسی طرح اس میں وہ اسلحے (Arms & Weapon System) اور طریقہ جنگ (War Strategies & Maneuvers) سب ہی کچھ شامل ہیں جو ان الگ الگ انواع اور ان کے ذیلی انواع کا خاصہ ہوں گے۔ قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:

فکبکبوا فیھا ھم والغاوٗن وجنود ابلیس اجمعون۔ (الشعراء:۹۴-۹۵)

ترجمہ: پھر اوندھے ڈالیں اس میں انہیں اور غاوین اور جنود ابلیس سبھوں کو۔

یہاں مذکور الغاوین نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے ممکن ہے اس کا ذکر اس کتاب میں نہ آسکے)

## (و) وآخرین من دونھم :

اللہ تعالیٰ نے معرکۂ خیر وشر کی مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت مبہم طریقے سے شیطانوں کی ایک خاص قسم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ وبیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنگجو ہیں۔ (اِن شاء اللہ اس کی تفصیل بھی بعد میں آئے گی)۔ قرآن نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے:

**وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم.** (الانفال:۶۰)

ترجمہ: اور ان کے علاوہ جو دوسرے ہیں جنہیں تم لوگ نہیں جانتے مگر اللہ ان کی خبر رکھتا ہے۔

## (ز) شیاطین :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تینوں قسم کے شیاطین شامل ہیں یا کبھی شامل تھے۔۔۔ یعنی شیاطین نور، شیاطین نار اور شیاطین ارض۔ ہر چند کہ اب ان میں سے زیادہ تر شیاطین ۔۔۔ نار اور ارض سے تعلق رکھتے ہیں۔

### (۱) شیطان جن:

یہ وہی شیاطین ہے جن کا ذکر ابھی شیاطین نار کے نام سے ہوا ہے۔ اور یہ وہی شیاطین جن ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) **وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن.**
(الانعام:۱۱۲)

ترجمہ: اور اس طرح ہم نے بنادیا ہر نبی کے لیے شیاطین انس وجن دشمن۔

(۲) **الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس.** (الناس:۶)

ترجمہ: وہ جو وسوسے ڈالتے ہیں لوگوں کے سینوں میں جنوں اور انسانوں میں سے۔

ان شیاطین نور اور شیاطین جن کی (جن میں شیاطین نور یا تو خال خال ہیں یا اب بالکل نہیں ہیں) چھ بڑی قسمیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ یہ شیاطین انہیں تین قسموں پر

مشتمل ہوں۔ یہ چھ قسمیں اپنی تفصیل میں خود بڑی ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ یہ تین قسمیں ہیں:

## (۱) غواص :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) **ومن الشیاطین من یغوصون له.** (الانبیاء :۸۲)

ترجمہ: اور شیاطین میں سے جو اس کے لیے غواصی کرتے ہیں۔

(۲) **والشیاطین کل بناء وغواص .** (ص:۳۷)

ترجمہ: اور شیاطین ہر وہ جو بناء ہے اور غواص۔

## (۲) بناء :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) **والشیاطین کل بناء .** (ص : ۳۷)

ترجمہ: اور شیاطین جو ہر وہ جو بناء ہے۔

## (۳) ملقی شیاطین :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی إلا اذا تمنی ألقی الشیطان فی امنیته .** (الحج:۵۲)

ترجمہ: اور جو رسول بھیجا ہم نے آپ سے پہلے یا نبی سو جب بھی انہوں نے تمنی کیا تو شیطان نے ڈال دیا ان کی تمنا میں۔

## (۴) الخناس

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**من شرالوسواس الخناس.** (الناس)

ترجمہ: الخناس کے وسوسوں کے شر سے۔

## (۵) نزاغ :

یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**فلما ینزغنك من الشیطان نزغ** (الاعراف:۲۰۰)

ترجمہ: اور جب آپ کو شیطان نزغ کا شکار بنانے کی کوشش کرے۔

## (۶) شیاطین فی الاصفاد:

یہ وہ لوگ ہیں جن کا قرآن میں اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے:

**وآخرین مقرنین فی الاصفاد** (ص:۳۸)

ترجمہ: بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں۔

## (۲) شیاطین انس :

یہ وہ شیاطین ہیں جن کا ذکر ابھی شیاطین ارض کے نام سے ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ شیاطین ارض میں سبھی شیاطین انس نہیں لیکن چونکہ اصل شیاطین انس ہیں اس لیے اس طبقے میں ان کا ذکر ہی شیاطین ارض کے مترادف ہے۔ قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

(۱) **وکذلك جعلنا لکل نبی عدواً شیاطین الانس۔** (الانعام:۱۱۲)

ترجمہ: اور اسی طرح کر دیا ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن شیاطین انس کو۔

(۲) **الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنة والناس۔**

(الناس:۵۔۶)

ترجمہ: جو وسوسہ ڈالتے ہیں لوگوں کے سینوں میں جنوں اور انسانوں میں سے۔

## (ح) اولیاء الشیطان :

قرآن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں اس اصطلاح کا اطلاق تمام ہی شری لوگوں پر ہوتا ہے لیکن بطور خاص یہ ان غیر شیطان مخلوقات کے لیے استعمال ہوا ہے جو ابلیس کے موقف سے یا تو اتفاق رکھتے ہیں یا کسی طرح سے اس کے موید ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ تمام لوگ شیاطین میں ہوں۔

(۱) **فقاتلوا اولیاء الشیطان إن کید الشیطان کان ضعیفاً۔**

(النساء:۷۶)

ترجمہ: سو لڑو تم شیطان کے اولیاء سے بے شک چال شیطان کی کمزور ہے۔

(۲) **إنما ذٰلکم الشیطان یخوف اولیاءہ** (آل عمران:۱۷۵)

ترجمہ: یہ جو ہے سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے اولیاء کو۔

## (ط) قرین الشیطان :

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی غفلت یا کمزوریوں یا برائیوں کے سبب ایسے ہو جائیں کہ ابلیس ان پر اپنا کوئی خاص شخص مسلط کر دے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسا کہ کوئی انسان اپنی کمزوریوں کے سبب کسی شخص کے ذریعہ بلیک میل ہوتا ہے یا کسی مافیا میں پڑ جاتا ہے جس سے نکلنا یا پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ قرین کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ اس انسان یا جن پر بھی جس پر ابلیس اپنا کوئی آدمی مسلط کر دے یا وہ جن یا انسان جو شیطان ہے جسے اس جن پر یا انسان پر مسلط کر دیا جائے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

(۱) ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطٰناً فهوله قرین وانهم لیصدونهم عن السبیل ویحسبون انهم مهتدون۔ (الزخرف:۳۶)

ترجمہ: اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمان کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں گے ایک شیطان وہ رہے اس کا ساتھی۔ اور وہ ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں۔

(۲) الذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل ویکتمون ما اٰتٰهم الله من فضله واعتدنا للکافرین عذاباً مهیناً والذین ینفقون اموالهم رئاء الناس ولا یومنون بالله ولا بالیوم الآخر ومن یکن الشیطان له قریناً فساء قریناً (النساء:۳۸)

ترجمہ: وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے عذاب ذلت کا۔ اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کو اور ایمان نہیں لاتے اللہ پر نہ قیامت کے دن پر اور جس کا ساتھی ہوا شیطان تو وہ بہت برا ساتھی ہے۔

## (ی) اخوان الشیطان :

یہ وہ لوگ ہیں جو خود شیطان نہیں ممکن ہے ان کا شمار عام حالات میں اولیاء الشیطان میں بھی نہ ہو لیکن یہ اپنے قول اور عمل کے ذریعہ راست یا بالواسطہ ابلیس کے مقاصد میں مددگار ہوتے ہیں۔ خواہ یہ متحرک نہ ہوں لیکن متحرک ضرور ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں ابلیس کے لیے حرکیت (Pro-activity) تو نہیں پائی جاتی لیکن یہ خود متحرک (Active) ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا

ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

**إن المبذرين كانوا اخوان الشياطين.** (بنی اسرائیل :۲۷)

ترجمہ. بے شک اسراف کرنے والے ہو گئے ہیں بھائی شیاطین کے۔

## (ک) متبعون الشيطان :

یوں تو اس کا اطلاق ان تمام ہی لوگوں پر ہوتا ہے جو ابلیس کا اتباع کرتے ہیں لیکن ان کا اصلی اطلاق ان پر ہوتا ہے جو خواہ ابلیس کے لیے متحرک بھی نہ ہوں بلکہ اسے ایجابی یا سلبی طور پر قبول کرنے والے ہوں۔ تمام ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض اس میں شامل ہیں۔ یہی وہ بات ہے جن کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**لاملأن جهنم منك وممن تبعك منهم اجمعين.** (ص:۸۵)

ترجمہ: تو میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور جو تیری پیروی کریں گے ان میں سے سب سے۔

یوں تو مختلف ناموں کے شیاطین کا ذکر احادیث میں آیا ہے لیکن وہ اسم خاص ہے۔ طبقات کے اسم نہیں۔ لہٰذا ان کا ذکر اس ذیل میں نہیں آتا۔ یہ طبقات وہ ہیں جو اب ابلیس کے ساتھ ہیں۔ ہر چند کہ یہ ذکر یہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن چونکہ احادیث میں تین اور باتوں کا ذکر آیا ہے جو دجال مسیح کے علاوہ ہیں لہٰذا دجال کے تفصیلی ذکر سے قبل ان کا ذکر کیا جانا ناگزیر ہے۔ اور یہ ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے اثرات کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے :

## (ا) یاجوج وماجوج :

یاجوج وماجوج کی حقیقت کیا ہے؟ سر دست ہمیں اس سے یہاں بحث نہیں۔ ابلیس کے اعوان وانصار میں چونکہ بطور خاص اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے ظہور سے قبل ہی اس کے روئے زمین اور مومنین پر اثرات کے پڑنے اور زمین پر شر کی قوتوں کے تقویت پانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے یہاں اس حوالے سے یاجوج وماجوج کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک دن میرے ہاں گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا: لاالہ الااللہ! خرابی

ہے، عرب کے لیے اس آفت سے جو قریب آگئی ہے۔ آج یاجوج وماجوج کے بند میں اتنا شگاف پڑ گیا ہے یہ فرماتے وقت آپ نے اپنے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی کو ملا کر حلقہ بنایا (یعنی مقدار بتائی کہ اتنا شگاف پڑ گیا ہے) ام المومنین حضرت زینب کہتی ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم اس کے باوجود ہلاک ہو جائیں گے کہ ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! جب فسق وفجور کی کثرت ہو جائے گی (تو نیکوں کی موجودگی بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے گی)۔ (البخاری کتاب الانبیاء، باب قصه یاجوج وماجوج)

## (۲) الشیطان الملجمة :

محمد الحاکم نیشاپوری نے 'المستدرك على الصحيحين' میں ایک حدیث نقل کی ہے:

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ہمارے سامنے ایک شخص آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! آپ کی امت کی امید کی مدت کیا ہے؟ ..... آپ ﷺ نے فرمایا: سو سال۔ اس نے پوچھا: اس کی کوئی امارت یا آیت یا علامت؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! وزنی چیزوں کا آسمان سے زمین پر گرنا (القذف) اور زمین کا دھنسنا (الخسف) اور زمین کا لرزنا (الرجف) اور (اب تک) انسانوں کو بچانے کے لیے لگام ڈالے ہوئے شیطانوں کا آزاد ہو کر زمین پر انسانوں کے بیچ بھیجا جانا۔ (ارسال الشیاطن الملجمه عن الناس)۔[۲]

(المستدرك : كتاب الفتن والملاحم، حديث ۸۲۹۳/۱)

## (۳) الشیاطین المجلبة :

ایک اور حدیث احمد اور طبرانی نے نقل کی ہے جس میں انسانوں پر ایسے شیاطین کے چھوڑے جانے کا ذکر ہے جو فوج در فوج ہوں گے اور جن کو ہانک کر لایا جائے گا۔ میں یہاں اس حدیث کے متن کو حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی کے حوالے سے نقل کرتا ہوں:

"سائل نے پوچھا: یارسول اللہ اس کی کوئی امارت، آیت یا علامت؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ہاں! الخسف، والرجف وارسال الشياطين المجلبة على الناس۔"[۳]

بحوالہ: بغية الرائد فی تحقيق مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للحافظ نور

الدین علی بن ابی بکر الهیثمی (المتوفی ۸۰۷ھ) کتاب الفتن: باب ما جاء فی المسخ والقذف وارسال الشیاطین والعواعق حدیث:۱۲۵۸۵)

اس حدیث کے متن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین لاکھوں کی تعداد میں انسانوں پر ہانک دیئے جائیں گے۔ جیسے چھوٹے چھوٹے بچوں پر کوئی پھاڑ کھانے والے کتوں کے غول کے غول کو چھوڑ دے۔

تاہم غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ الشیاطین الملجمة اور الشیاطین المجلبہ ایک ہی ہیں۔ ممکن ہے پہلی ترکیب میں ان کے اس پہلو سے گفتگو کی گئی ہو کہ وہ اس وقت مقید ہیں لیکن قرب ظہور دجال کے وقت وہ انسانوں پر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اور دوسری حدیث کی ترکیب میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہو کہ اس وقت انسانوں اور مومنین پر ان کا چھوڑا جانا کس نوعیت کا ہوگا۔

# حقیقت سوم : معرکۂ خیر و شر

## آغاز :

کائنات میں معرکۂ خیر و شر کے آخری مرحلے کا باضابطہ آغاز اسی لمحے ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو یوم وقت معلوم تک اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قال فانك من المنظرين الى يوم الوقت المعلوم (الحجر ۳۷۔۳۸ و ص:۸۰۔۸۱)

ترجمہ: کہا پس تم مہلت دیے جانے والوں میں سے ہوئے وقت معلوم کے دن تک۔

اور ابلیس نے اس کا جواب دیا تھا: قال فبعزتك لاغوينهم اجمعين (ص:۸۲)

ترجمہ: کہا: تو تیری عزت کی قسم! میں ضرور برباد کروں گا سب کو سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

لأملئن جهنم منك وممن تبعك منهم اجمعين. (ص:۸۵)

ترجمہ: تو میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور جو تیری پیروی کریں گے ان میں سے سب سے۔

اس جواب کے تین شق ہیں:

(۱) پہلی شق: لأملئن جهنم منك: میں جہنم کو تجھ سے ضرور بھر دوں گا۔ ظاہر ہے اس کا تعلق اس نافرمانی سے ہے جس کے نتیجے میں یہ سارا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یعنی ابلیس کا اللہ کا حکم ماننے اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار اور اپنے لیے خلافت کا دعویٰ۔

(۲) دوسری شق: (لأملئن جهنم) ممن تبعك: 'میں جہنم کو ان سے ضرور بھر دوں گا جو تیری پیروی کریں گے۔' ظاہر ہے اس کا تعلق ان تمام لوگوں سے ہے جو اس مرحلے میں معرکۂ خیر و شر میں ابلیس کا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ایسے تمام لوگوں سے جہنم کو بھر دیں گے۔

(۳) تیسری شق: منهم اجمعين: 'ان میں سے تمام لوگوں کو۔' ظاہر ہے اس کی تعیین کرنے کے لیے، یہ دیکھنا ہو گا کہ اس معرکۂ خیر و شر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس میں براہ راست اور

بالواسطہ کون کون شریک ہیں؟اور کون کون ابلیس کا ساتھ دے سکتے ہیں؟اور اسے معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی وہ مکالمہ جو حضرت باری تعالیٰ اور ابلیس کے مابین ہوا۔ چنانچہ اس مکالمے میں ابلیس نے کہا:

**لاغوينهم اجمعين إلا عبادك المخلصين . (ص:۸۲)**

ترجمہ: میں ضرور ان سب کو برباد کردوں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔

اگرچہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس سے مراد صرف انسان ہیں۔ لیکن جہاں اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ اس میں انسانوں کے علاوہ کوئی شامل نہیں وہیں اس کا بھی کوئی قرینہ نہیں کہ اس میں حصر ہو یعنی یہ کہ صرف انسان ہی شامل ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔ اور خاص طور پر اس صورت میں کہ سورۂ ہود آیت:۱۱۹ اور السجدہ آیت:۱۳ میں اس حصر کو رفع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

**(۱) وتمت كلمة ربك لا ملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين**

(ہود:۱۱۹)

ترجمہ: اور یوں ہوئی بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔

**(۲) ولكن حق القول منى لأملأن جهنم من الجنة والناس اجمعين** (السجدہ:۱۳)

ترجمہ: لیکن ٹھیک پڑچکی میری کہی بات کہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔

ایسی صورت حال میں 'لاغوينهم اجمعين' میں وہ ساری مخلوقات جو دائرۂ ارتباء اعلیٰ میں شامل ہیں اس میں شمار ہو سکتی ہیں یعنی ملک، جن اور انسان۔ اور بالصراحت جن اور انسان۔

اس طرح اس معرکۂ خیر و شر کے دائرے کا مرکز انسان ضرور ہے لیکن اس بڑے دائرے میں ابناء نور یا ملک، ابناء نار یا جن اور ابناء ارض یا انسان تینوں شامل ہیں۔ اس معرکۂ خیر و شر کی کم از کم تین صورتیں ہو سکتی تھیں:

(۱) سارے انسان غیر متحرک ہوتے اور ابلیس تنہا انہیں گمراہ کرتا۔

(۲) سارے انسان غیر متحرک مگر صاحب اختیار ہوتے اور ابلیس تنہا انہیں گمراہ کرتا۔

(۳) سارے انسان، ابناء نور اور ابناء نار متحرک اور صاحب اختیار ہوتے اور ابلیس ان میں جس کی مدد لے سکتا ہے کر انسان کو گمراہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر سب سے مناسب اور عادلانہ اعتبار سے سب سے مناسب یعنی تیسری راہ اختیار کی۔ اس لیے سابقہ آیات میں لاغوینهم اجمعین إلا عبادك مخلصین (ص:۸۲) میں سب ہی شامل ہیں۔ خواہ وہ ملک ہوں یا جن یا انسان۔

عام طور پر جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ملائکہ گناہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتے، قرآن سے بنیادی طور پر ٹکراتا ہے۔ گناہ کی بنیاد اختیار ہے۔ اور اگر اختیار ملائکہ میں پایا جاتا ہے تو قدرت گناہ بھی پائی جاتی ہے۔ اور اگر اختیار ملائکہ میں نہیں پایا جاتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم دینا:

(۱) ولقد خلقناكم ثم صورنكم ثم قلنا للملائكة اسجدوا لآدم۔

(الاعراف: ۱۱)

ترجمہ: اور ہم نے تم کو پیدا کیا ہم نے پھر تم کو صورت والا بنایا پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

(۲) انقال ربك للملئكة انى خالق بشراً من طين فاذا سويته ونفخت فيه من روحى فقعوا له سلجدين۔ (ص: ۷۱۔۷۲)

ترجمہ: جب کہا تیرے رب نے ملائکہ کو میں بناتا ہوں بشر گارے سے پس جب میں اس کا ڈھانچہ بنادوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ میں۔ بے معنی ہو جائے گا۔ جب ملائکہ کو قدرت گناہ ہی نہیں تو ان کو اختیار دینا کیا معنی اور اس سے آگے معاملہ کہ انہوں نے اس پر سوال کیا:

قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدمء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك۔ (البقرہ:۳۰)

ترجمہ: کہا (ملائکہ نے): کیا آپ قائم کرتے ہیں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم آپ کی حمد اور تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

اور اس پر مستزاد یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت پوری کر دی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اقرار فرمایا۔ چنانچہ قرآنی بیان میں 'سبحانک' سے زیادہ واضح کوئی بیان نہیں جو اقرار غلطی کے لیے عند اللہ استعمال کیا جائے ـــــ یعنی اے اللہ صرف اور صرف تو ہی ہر نقص سے پاک ہے!

یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے غلطی واضح ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ اللہ کا ہر حکم انسانوں کے لیے مان لیا۔ اب جہاں تک اس آیت کا سوال ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

"علیها ملئکة غلاظ شداد لا یعصون الله ما امرهم ویفعلون ما یؤمرون۔ (التحریم :۶)

ترجمہ: اس پر مقرر ہیں ملائکہ تند خو زبردست نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو حکم دے ان کو اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو۔

تو پھر اگر اسے عام معنی میں لیا بھی جائے یعنی یہ کہ سارے ملائکہ اس حکم کے بجالانے میں کبھی نافرمانی اور کوتاہی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے تو بجالاتے ہیں ـــــ جب بھی درج ذیل معنی میں کسی ایک کا یا سب کا اطلاق ہوگا:

(۱) وہ حکم بجالانے میں کوئی کوتاہی یا نافرمانی نہیں کریں گے۔

(۲) وہ عام طور پر یا بالا کثر کبھی کوتاہی یا نافرمانی نہیں کرتے۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ ملائکہ عام طور پر گناہ نہیں کریں گے یا خلاف حق بات اگر ان سے صادر ہو بھی جائے تو اس پر فوراً متنبہ ہو کر رجوع کر لیں گے۔

دوسری بات یہ کہ ملائکہ نے عام طور پر اور مقرب ملائکہ نے بطور خاص اس کا عہد کیا ہو کہ نہ صرف یہ کہ وہ شر کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ اب تا قیامت اللہ اس کے رسول اور مومنین کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ درج ذیل آیات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

(۱) من کان عدو ا لله وملئکته ورسله وجبریل ومیکال فان الله عدو للکفرین۔ (البقرہ:۹۸)

ترجمہ: جو کوئی ہو اد شمن اللہ کا اور اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکال کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

(۲) هو الذی یصلی علیکم وملئکته لیخرجکم من الظلمات إلی النور وکان بالمؤمنین رحیما (الاحزاب:۴۳)

ترجمہ: وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے ملائکہ تاکہ نکالے تم کو اندھیرے سے النور میں اور ہے ایمان والوں پر مہربان۔

اور سب سے اہم آیت اسے اس طرح بیان کرتی ہے:

(۳) ان الله وملئکته یصلون علی النبی۔ (الاحزاب:۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ رحمت بھیجتے ہیں نبی پر۔

لیکن ان میں سے کسی بھی آیت سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اس میں تمام ملائکہ یعنی ملکاً ملائکہ اور ملکاً غیر ملائکہ سبھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سارے ملک بیک وقت ملکاً ملائکہ بھی ہیں جب بھی۔ اس لیے اگر ایک نفس نوع کا ذکر کل کے اعتبار سے بھی ہو اور کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جس میں اس کی صراحت ہو کہ اس کا ایک ایک فرد اس میں شامل ہے وہ کل عام طور پر اکثر کے معنی میں ہی لیا جائے گا۔ قرآن میں آتا ہے:

**کل نفس ذائقة الموت۔** (آل عمران :۱۸۵)

ترجمہ: ہر نفس چکھنے والا ہے موت۔

یہاں محض نفس اگر ہوتا تو اس سے لازم نہ آتا کہ اس میں ایک ایک نفس شامل ہے۔ لیکن اب جبکہ کل ـــــ نفس کے ساتھ ہے اس میں ایک ایک نفس شامل ہو گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو محض نوع کا ذکر جبکہ اس نوع میں کثرت پائی جاتی ہو صرف اکثر ہی شامل ہوں گے۔ مثلاً:

(۱) **ان الذین کفروا ملتوا وھم کفار اولئك علیھم لعنة الله والملئکة والناس اجمعین۔** (البقرہ: ۱۶۱)

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کافر ہی انہیں پر لعنت ہے اللہ کی اور ملائکہ کی اور لوگوں کی سب کی۔

(۲) **اولئك جزاؤھم ان علیھم لعنة الله والملائکة والناس اجمعین۔** (آل عمران:۸۷)

ترجمہ: ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور ملائکہ کی اور لوگوں کی سب کی۔

ان دونوں جگہوں پر اجمعین کا یہ معنی تو لیا جائے گا کہ 'اللہ ملائکہ اور انسانوں سب کی لعنت' لیکن اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ اللہ اور تمام ملائکہ کی لعنت ہے تو پھر یہ بھی مفہوم لینا ہو گا کہ تمام انسانوں کی لعنت۔

چنانچہ اس معرکۂ خیر و شر کی وسعت اور دائرۂ کار کے تعلق سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں:

(۱) اس معرکۂ خیر و شر کی بنیادی وجہ خلافت آدم ہے اور ابلیس اس کا فریق ثانی ہے۔

(۲) معرکے کی بنیادی بات انسان کو خلافت کے لیے نااہل ثابت کرنا ہے۔

(۳) اس معرکے میں ابلیس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ابناء نور یعنی ملک، ابناء نار یعنی جن اور ابناء ارض یعنی انسانوں کو اپنے گروہ میں شامل کرے، ان کی مدد لے، ان کو آلہ کار بنائے اور ان سب کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے دوسری طرف انسانوں کو متحرک، محرک یعنی فاعل اور مختار بنایا ہے۔ یعنی وہ خیر و شر کے انتخاب اور اس کے لیے کام کرنے کے تعلق سے نہ صرف فاعل ہے بلکہ متحرک بھی ہے اور چاہے تو محرک کی طرح بھی کام کر سکتا ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے جہاں شیطان کو آزادی (Free hand) دی ہے وہیں اس نے تمام انسانوں کے لیے ہدایت، اور انبیاء و رسل بھیجے اور حکم دیا کہ حق کو قائم رکھیں اور اگر ابلیس اسے منہدم کر دے تو اس کی اقامت کریں۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خبردار کیا کہ ابلیس یعنی الشیطان دراصل اس خلافت کا مدعی ہے جو انسانوں کو عطا کی گئی ہے اور وہ ان کا کھلا دشمن ہے اور ان سے یہ منصب چھین لینا یا کم از کم انسانوں کو اس منصب سے ہٹا دینا چاہتا ہے لہٰذا انسان اسے اپنا دشمن بنالے اور اس سے نہ صرف یہ کہ بچے بلکہ اس کے خلاف ہر طاقت استعمال کر کے اس کے منصوبے کو ناکام کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) فقلنا یآدم ان هذا عدولك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقیٰ (طٰہٰ:۱۱۷)

ترجمہ: پس کہا ہم نے اے آدم! یہ تمہارے اور تمہارے جوڑے کے لیے دشمن ہے۔ پس نہ نکال باہر کرے تم دونوں کو الجنۃ سے اور تم پڑ جاؤ مشقت میں۔

(۲) إن الشیطان لكم عدو فاتخذوه عدوا۔ (فاطر:۶)

ترجمہ: تحقیق الشیطان تمہارا دشمن ہے تم لوگ بھی اسے دشمن بناؤ۔

ان تمام باتوں سے کئی امور سامنے آتے ہیں:

(۱) یہ معرکہ خیر و شر کائناتی (Cosmic) ہے۔ ہر چند کہ معرکے کا کارزار زمین ہے۔

(۲) اس معرکہ خیر و شر میں تمام کائناتی عامل طاقتوں (All Cosmic Active Forces) یعنی ملک، جن اور انسان شریک ہیں جہاں خیر و شر کا فریق مومن انسان ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور تمام مقرب ملائکہ، تقریباً تمام ملائکہ، مومن ملک اور مومن جن ہیں جب کہ

شر کا فریق ابلیس یعنی موجودہ الشیطان، تمام شیاطین یعنی شیاطین ملک، شیاطین جن اور شیاطین انسان اور تمام متبعین شیاطین ملک، انس و جن ہیں۔

(۳) یہ معرکہ الجنۃ میں شروع ہوا اور وہاں سے منتقل ہو کر اس روئے ارض پر آگیا جو اس معرکے کا بنیادی اور اصل حصہ ہے اور یہ معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔

(۴) ظاہر ہے کہ جب یہ معرکہ کائناتی ہے اور اس میں ابلیس نے ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض سب کو اپنا ہمنوا بنانے یا ان کا استعمال لینے یا ان کو اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی ہو تو اس معرکے کی وسعت کتنی بڑھ سکتی ہے اور اس معرکے میں استعمال ہونے والی طاقت اور اسلحوں (Force & Weapons) کی حقیقت کتنی ہولناک ہو سکتی ہے، اس میں کتنی ہلاکتیں (Casualties) ہو سکتی ہیں اور اس میں کیسے کیسے ہولناک انقلابات آسکتے ہیں۔

## خلیفـة

معرکۂ خیر و شر کی حقیقی صورت حال سمجھنے کے لیے 'خلیفہ' کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ جب کہ یہ مفہوم اس تعبیر کے ساتھ درست نہیں۔ اس مفہوم کے لینے میں دو قباحتیں ہیں:

(۱) اگر زمین پر انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو پھر اس کا اعلان عالم عصر میں کیا جانا، تسویہ یعنی تصویر کے بعد آدم کا الجنۃ میں رہنے کو کہنا اور اسے تنبیہ کرنا کہ "اے آدم یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے پس کہیں یہ تم دونوں کو الجنۃ سے باہر نہ کردے اور تو تکلیف میں نہ پڑ جائے۔" (طہ:۱۱۷) اور جب ان دونوں سے غلطی ہو گئی تو انہیں کہنا کہ اب "تم سبھی الجنۃ سے اترو اور زمین پر جاؤ وہاں تمہارے لیے ٹھکانا اور ایک وقت تک کے لیے متاع ہے۔" (البقرہ:۳۶) کیا مطلب رکھتے ہیں؟ اگر آدم کو زمین پر اللہ اپنا خلیفہ ہی بنانا چاہتا تھا تو اسے تصویر و تسویہ کے بعد سیدھے زمین پر ہی بسا دینا چاہئے تھا اور اگر کسی مصلحت سے ایسا نہ بھی کیا گیا تو ایسا کہنے کا کیا مفہوم ہے کہ زمین پر تمہارے لیے ایک وقت تک ہی متاع ہے۔

(۲) اگر انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور واضح ہو کہ زمین کو اسی مفہوم میں لیا جاتا ہے یعنی وہ خطۂ زمین جو ایک سیارہ ہے اور نظام شمسی کا حصہ ہے اور زہرہ (Venus) اور مریخ

(Mars) کے، درمیان سورج کے چاروں طرف گردش کر رہا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے علاوہ بقیہ پوری کائنات میں اللہ کا خلیفہ کون ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ان سوالات کا اس طرح جواب دینا کہ "انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے" کی تقریر ہو جائے چند در چند پیچیدگیاں پیدا کرے گا۔

اس عاجز کی رائے میں 'فی الارض خلیفہ' سے مراد "اہل زمین میں سے" ہے اور اہل زمین سے مراد وہ مخلوق جو اپنی نوع کے اعتبار سے نہ نور سے بنائے گئے ہیں نہ نار سے بلکہ از قسم ارض ہیں۔ اور ارض سے مراد یہ زمین نہیں بلکہ نفس ارض ہے۔[۵]

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں کسی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ خلیفہ ممکن ہے ابناء نور سے بنتے یا ابناء نار سے یا ابناء ارض سے۔ یہ علم صرف اللہ رب العزت کو تھا کہ وہ کس میں سے اپنا وہ خلیفہ بنائے گا۔ ابناء نور اپنی امید لگائے بیٹھے تھے اور ابناء نار اپنی، اس لیے کہ اس وقت تک یہی دونوں مخلوقات 'عالم بریۃ' سے عالم عصر ہوتے ہوئے عالم اشیاء تک سفر کر چکے تھے۔ اور ابناء ارض اس وقت کچھ عالم اشیاء میں اور کچھ عالم عصر میں اور آدم تو عالم بریۃ میں ہی تھے۔ چنانچہ جب یکایک اللہ تعالیٰ نے آدم کو کائنات تخلیق کے دائرے میں لا کر عالم بریۃ سے عالم عصر اور پھر عالم اشیاء میں جلوہ گر فرما دیا تو ابناء نور اور ابناء نار حیرت زدہ رہ گئے۔ اس پوری تدریج پر غور کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

(۱) 'واذقال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفه' مجمل اعلان ہے۔ اس کے بعد قالوا میں ایک طویل فصل ہے جس کی تفصیلات یہاں محذوف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان تقدم کے اعتبار سے تو کتنا ہی پہلے ہو سکتا ہے لیکن تاخر کے اعتبار سے اس وقت ہوا ہوگا جب آدم ابھی عالم بریۃ میں ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ عالم عصر میں آچکے ہوں گے۔ لیکن آدم کا عالم عصر میں ہونا بھی ان کی حقیقت کو ابناء نور اور ابناء نار کی سمجھ سے باہر رکھنے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ ایک عرصے کے بعد جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرا اعلان سنا ہوگا تو اس وقت تک آدم عالم عصر سے عالم اشیاء میں آچکے تھے لہٰذا ابناء نور اور ابناء نار کو ان کی حقیقت سمجھنے اور اس کے ادراک کرنے میں دیر نہ لگی ہوگی کہ خلیفہ اصلاً کون بنایا جا رہا ہے اور جسے بنایا جا رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہی وہ دوسرا اعلان ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

(۱) لقد خلقناکم ثم صورنکم ثم قلنا للملائکة اسجدوا لآدم (الاعراف:۱۱)

ترجمہ: اور تحقیق کہ ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہیں صورت والا بنادیا پھر ہم نے کہا ملائکہ کو کہ آدم کو سجدہ کرو۔

(۲) فاذا سویته ونفخت فیه من روحی فقعوا له سٰجدین (الحجر:۲۹ اور ص:۷۲)

ترجمہ: پھر جب ڈھانچہ بنادوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ میں۔

چنانچہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ البقرہ آیت ۳۰ کا پہلا حصہ اس اعلان پر مشتمل ہے جن میں دو باتیں واضح تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کائنات میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کائنات میں اپنا خلیفہ السماء یا السموٰت اور الارض میں سے الارض میں بنانا چاہتا ہے۔

لیکن اس وقت تک ملک اور جنوں کو یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ یہ خلیفہ الارض یعنی اس مٹی سے بنایا جائے گا جو نور اور نار کا نقیض ہے۔ وہ یہی گمان کیے ہوئے تھے کہ ممکن ہے اس خلافت کے لیے ان کا انتخاب ہو جائے۔ جو نہیں ہوا۔ چنانچہ اس پر انہیں اعتراض ہوا۔ 'ماکان ومایکون' میں میں نے لکھا:

> "آدم نے اپنا سفر خلافت فی الارض سے شروع کیا۔ اس کی اس برتری پر پہلا اعتراض اس کی ترکیب و ساخت کو مد نظر رکھ کر کیا گیا..... آدم کی فضیلت پر دوسرا اعتراض بھی اس کی ترکیب اور ساخت کو مد نظر رکھ کر کیا گیا۔ ہر چند کہ پہلے اور دوسرے اعتراض میں نوعی فرق تھا۔" (صفحہ:۱۷)

بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلا سوال از قسم اعتراض نہیں تھا، جو اس عاجز کے نزدیک درست نہیں۔ دراصل ان حضرات کا یہ قول اس نقطۂ نظر کی وجہ سے ہے جو وہ یہاں لفظ ملائکہ کے تعلق سے رکھتے۔ جبکہ قرآن نے کہیں بھی ملائکہ کو ان معنوں میں لینے کا پابند نہیں کیا جسے گزشتہ صفحات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ ملائکہ تو ایک منصب ہے ـــــ جو اس اعلان کے وقت تک بنیادی طور پر دو انواع پر مشتمل تھا۔ پہلی نوع نور یعنی ملک تھے اور دوسری نار یعنی جن ـــــ قرآن کے بیان سے ایسا تبادر ہوتا ہے کہ اس وقت ابناء نار میں سے صرف ایک یعنی ابلیس ہی ملائکہ تھا

حمد کی تسبیح کرتے ہیں کیا یہ تسبیح خلافت کے کام نہیں اور کیا ہم اس کے اب مستحق نہیں کیونکہ اب جن بحیثیت نوع تو فساد کر کے اس کے اہل نہیں رہے۔ یعنی جنوں کے فساد ہی فساد کے برخلاف ہم تسبیح ہی تسبیح میں مشغول ہیں۔اس لیے کیا اس کے مستحق ہم نہیں؟

(۲) **ونقدس لك** : یعنی اے اللہ تعالیٰ ہم لوگوں نے اپنی افزائش بالکل روک دی ہے اور ہر شئے سے یکسو ہو کر ہم صرف آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور ہمیشہ آپ کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں اور اس طرح آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا خلافت کا اہل نہیں بناتا اور کیا ہم اس کے مستحق نہیں؟

یہاں مزید واضح ہو کہ ابلیس کا اعتراض صرف اپنی ذات کے لیے تھا۔ پوری نسل نار کے لیے نہیں تھا۔ خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ صرف وہی ملائکہ میں سے تھا اور خود کو ہی اس کا اہل سمجھتا تھا یا اس وقت تک بیشتر جن اسی کے ذریعہ تباہ ہو چکے تھے۔ تاہم چونکہ کچھ یقیناً زندہ تھے اس لیے یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ نسل جن کے لیے خلافت کا مدعی نہیں تھا بلکہ صرف اپنی ذات کے لیے تھا۔ جب کہ ملائکہ کا کہنا شمول رکھتا ہے۔ وہ پوری نوع نور کے تعلق سے یا کم از کم ملکاً ملائکۃ کے تعلق سے یہ بات کہہ رہے تھے۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ جو حضرات ملائکہ کے اس سوال کو اعتراض نہیں قرار دیتے وہ قرآن کے ایک خاص طرز بیان پر غور نہیں کرتے۔ اور وہ ہے:

(۱) فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له سجدين .

(الحجر:۲۹) اور (ص:۷۲)

ترجمہ: پھر جب ڈھانچہ بنا دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑیو اس کے آگے سجدہ میں۔

چنانچہ حکم یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ آدم کو درست کر دے اور اس میں اپنی روح پھونک دے تو ملائکہ فوراً سجدہ ریز ہو جائیں اس میں قابل غور نکتے درج ذیل ہیں:

(۱) بات اس کی نہیں کہ کیا حکم دیا گیا ـــــ یعنی سجدہ کرنے کا یا سلام کرنے کا، کہاں کا حکم دیا گیا ـــــ یعنی آسمان میں یا زمین میں، اور کس کے لیے حکم دیا گیا ـــــ یعنی آدم کو سجدہ کرنے کے لیے یا کسی روح یا پتھر کو۔ بات یہ ہے کہ حکم اللہ نے دیا لہٰذا اگر لایعصون اللہ کا مطلب

جب کہ باقی سارے، ملائکۃ ابناء نور سے ہی تھے۔ چنانچہ پہلا اعتراض ان ملائکۃ کی طرف سے تھا جو ابناء نور تھے اور دوسرا ابلیس کی جانب سے جو ابناء نار میں سے تھا اور اکیلا تھا۔ غور کیا جائے تو پہلا اعتراض پیچیدہ اور دوسرا پیچیدہ تر تھا۔

## پہلا اعتراض :

یہ کتاب اس اعتراض کی تفصیلات میں جانے کی قطعاً متحمل نہیں، اس لیے نہایت مختصر طور پر اور صرف ضروری حد تک اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

ملکاً ملائکۃ کا اعتراض جنا ملائکۃ سے یقیناً مختلف تھا۔ ملکاً ملائکۃ نے جو کچھ کہا اس میں ـــــ ایک استفسار یا استفادہ، دو اعتراضات، اور دو افادہ، مشورہ یا اظہار خیال تھے۔ آخری دو افادے، مشورے یا اظہار خیال بالواسطہ اعتراضات ہی تھے۔ اس طرح ملائکۃ کے اعتراضات میں کل پانچ امور موجود تھے جو درج ذیل ہیں:

(۱) استفادہ : **اتجعل فیھا** : اے اللہ کیا آپ جس خلافت کو قائم فرمانے والے ہیں اس کا خلیفہ اور اس کی خلافت کا مرکز 'الارض' ہوگا؟ کیا وہ خلافت زمین پر قائم کی جائے گی؟ کیا وہ خلیفہ زمین میں ہوگا؟

(۲) اعتراضات :

(۱) **من یفسد فیھا** : یہ آدم جسے ابھی آپ نے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے وہ اس میں فساد کرے گا یعنی کیا یہ فساد نہیں کرے گا؟ اس لیے کہ زمین پر اس سے پہلے جنوں نے فساد کیا تھا جسے آپ نے ابھی ابھی ختم کروایا ہے۔

(۲) **ویسفك الدماء** : یہ آدم جسے ابھی آپ نے درست کیا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے وہ اس میں اسی طرح نہیں بڑھے گا جیسے جن بڑھے اور کیا اسی طرح وہ خون نہیں بہائے گا۔ جیسے جنوں نے بہایا ہے۔

(۳) افادہ، مشورہ یا خیال :

(۱) **ونحن نسبح بحمدك** : یعنی اے اللہ تعالیٰ ہم ان جنوں کی بات نہیں کرتے جنہوں نے فساد کیا تھا اور جنہیں ابھی ابھی ختم کیا گیا لیکن ہم جو عموماً فساد نہیں کرتے اور آپ کے

وہی لیا جائے جو عام طور پر لیا جاتا ہے تو انہیں صرف اس بات سے بحث ہوتی کہ اللہ نے کیا حکم دیا لہٰذا انہیں فوراً سجدہ ریز ہو جانا چاہئے تھا۔ اس صورت میں مَسْجُود، مَسْجَد اور مَسْجِد سب بے معنی ہیں اصل بات صرف حکم الٰہی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ نکتہ یہ نہیں کہ حکم کے ایک ثانیہ کے بعد سجدہ کیا گیا یا ایک لاکھ سال بعد بلکہ نکتہ یہ ہے کہ حکم کے فوراً بعد سجدہ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ آدم کو درست کر دے اور اس میں روح پھونک دے تو ملائکہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ فوراً سجدہ نہ کرنا خواہ تحفظات میں سے ہو یا عذر یا اعتراض یا مخالفت کچھ بھی ہو وہ حکم عدولی ہی تھی جس کا جواب "سبحانك" ہے۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ البقرہ آیت: ۳۴ میں "واذقلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا" سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم تیسرے مرحلے میں دیا گیا اور یہ کہ جب حکم دیا گیا تو ملائکہ نے فوراً عمل کیا اور کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ تو اس صورت میں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ سورہ الحجر آیت: ۲۹ اور سورہ ص آیت: ۷۲ میں جو حکم دیا گیا تھا وہ اس سلسلے میں دوسرا اعلان تھا۔ اس لیے پہلا اعلان البقرہ آیت: ۳۰ کا پہلا حصہ، اور تیسرا اعلان البقرہ آیت: ۳۴ کا پہلا حصہ تو لازماً الحجر و ص کا اعلان دوسرا ہوگا لیکن اسے تخلیق و تسویہ اور انفاخ سے پہلے کا اعلان ہونا چاہئے۔ اس صورت میں یہ بتانا ہوگا کہ البقرہ آیت: ۳۱ تا ۳۳ کا واقعہ کب ہوا؟ اس لیے کہ یہ آیتیں کھول کر بتا رہی ہیں کہ آدم بنائے گئے، انہیں اسماء کا علم دیا گیا پھر ان اسماء کے تعلق سے، کوئی شئے ملائکہ کے سامنے پیش کی گئی جس کا وہ جواب نہ دے سکے۔ پھر آدم کو حکم ہوا کہ وہ انہیں ملائکہ کو بتائیں اور انہوں نے بتا دیا۔ اس پورے معاملے میں آدم کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ حالت تسویہ اور انفاخ کے بعد کی ہے۔ لہٰذا بات یہ نہیں کہ اعلانات دو تھے یا تین اصل بات یہ ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق آدم کے تسویہ اور انفاخ کے فوراً بعد ملائکہ نے آدم کو سجدہ نہیں کیا۔ تاوقتیکہ ان پر حجت پوری نہ ہو گئی اور ان پر ان کی غلطی واضح نہ کر دی گئی۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ استفادہ، اعتراضات اور مشورے کے اس پورے لائحۂ سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا لیکن حقیقت برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک چیز کو کافی حد تک واضح کر دیا اور ان پر اپنی حجت پوری فرما دی۔

واقعہ یہ ہے کہ ملائکہ کا لائحۂ سوال نہایت دقیق، بھرپور اور اہم ہے۔ اس میں اس پوری

کائنات کے سارے اہم سوالات اور بطور خاص خلیفہ اور خلافت کی حقیقت سے بنیادی بحث ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھرپور طریقے سے ان پر اپنی حجت پوری فرمائی۔ جو اس وقت ہمارے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کی حجت کے تجزیے سے قبل لائحۂ سوال کی تنقیح کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

(۱) پہلا سوال : خلیفہ الارض پر ہی کیوں بنایا جارہا ہے۔ السماء میں کیوں نہیں؟

(۲) دوسرا سوال : کائنات کی خلافت الارض میں کیوں قائم کی جارہی ہے اور کائنات کا خلیفہ الارض میں کیوں بنایا جارہا ہے جس کے ایک ٹکڑے یعنی ارض (Earth) میں ابھی ابھی فساد پیدا ہو چکا ہے اور خون بہایا گیا ہے اور یہ بھی فساد کر سکتا ہے اور خون بہا سکتا ہے۔

(۳) تیسرا سوال : کائنات کا خلیفہ الارض کے ایک ٹکڑے میں کیوں بسایا جارہا ہے خواہ وہ الجنۃ ہی کیوں نہ ہو (اور بعد میں اسے وہاں سے منتقل کر کے دوسرے ارضی ٹکڑے پر ہی کیوں نہ ہی بھیج دیا جائے جو یہ ارض ہے) بحیثیت مجموعی وہ السماء میں کیوں نہیں بسایا جارہا ہے۔

(۴) چوتھا سوال : چنانچہ کیوں نہ جنوں اور آدم کے بجائے ملکاً ملائکۃ کو خلافت دی جائے۔

(۵) پانچواں سوال : ہماری سمجھ کے مطابق خلافت کی اہلیت جنوں میں نہیں جو کلی حکم عدولی اور فساد کرتے ہیں بلکہ وہ اہلیت دراصل ہم ملک ملائکۃ میں ہے جو کلی طور پر اتباع کرتے ہیں اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی جانب ہی متوجہ ہیں اور اس کے علاوہ کسی شئے سے تعارض نہیں کرتے۔

(۶) چھٹا سوال : ہماری سمجھ میں خلافت کی اہلیت یہ ہے کہ کوئی مخلوق ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اس کی تسبیح اور تقدیس کرے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو حجت قائم کی وہ نہایت دقیق تھی جس نے ملائکۃ پر ثابت کر دیا کہ ان کے سارے سوالات یا تو بے جا قیاس کا نتیجہ ہیں یا مبنی پر غلط۔ اس پورے واقعہ کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے:

> "اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو سب نام ـــ سامنے کیا ان سب کو ملائکۃ کے اور فرمایا: بتاؤ مجھے نام ان کے اگر تم سچے ہو۔ بولے پاک ہے تو ہمیں علم نہیں مگر جتنا تو

نے ہم کو سکھلایا ہے بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔ فرمایا: اے آدم بتادے ملائکہ کو ان کے نام پھر جب بتادیئے اس نے ان کے نام فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی باتیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔"

——"ان آیات کے تعلق سے عام طور پر مفسرین کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھلا دیئے اور اس کے بعد ملائکہ کے سامنے ان اشیاء کو پیش کر کے پوچھا کہ ان کے نام مجھے بتاؤ۔ چنانچہ ملائکہ چونکہ ان اشیاء کو نہیں جانتے تھے لہٰذا بتانے سے عاجز ہوئے اور اپنے عجز کا اظہار اس طرح کیا کہ اے اللہ تعالیٰ آپ پاک ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ ہم اس سے زیادہ نہیں جانتے اور ان چیزوں کا علم تو نے ہمیں نہیں دیا اس لیے ہم اس کے بتانے سے عاجز ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ ان اشیاء کے نام ملائکہ کو بتادو چنانچہ آدم نے بتادیئے۔ چنانچہ جب آدم نے ملائکہ کو یہ بتادیئے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم زیادہ رکھتا ہوں اور میں ان باتوں کو زیادہ جانتا ہوں جو تم لوگ ظاہر کرتے ہو اور جو تم لوگ چھپاتے ہو۔"——

اگر مفسرین کی یہ تاویل مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملائکہ کا سوال درست تھا اور اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اپنی حجت پوری کرنے میں ناکام رہے۔ اس تاویل کی تنقیح درج ذیل ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے آدم کو ان اشیاء کے نام سکھلا دیئے۔ مثلاً یہ کہ گھر کے کس بکس میں روپیہ رکھا ہے یا لائبریری کی کون سی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' ہے یا میدان میں جمع لوگوں میں کون صدر مملکت ہے؟

(۲) اب اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو یا اس لائبریری کو یا اس میدان میں جمع بھیڑ کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا بتاؤ کہ روپیہ کہاں ہے یا روپیہ والا بکس کون سا ہے؟ اور حجۃ اللہ البالغہ کون سی کتاب ہے؟ یا کون اس مجمع میں صدر مملکت ہے؟

(۳) چونکہ ملائکہ یہ سب نہیں جانتے تھے اس لیے وہ عاجز رہے اور کہا کہ اے اللہ تعالیٰ ہم یہ سب بتانے سے قاصر ہیں۔ ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جس کا آپ نے علم دیا ہے۔

(۴) اب اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ اے آدم ملائکہ کو بتادو کہ روپیہ والا بکس کون سا

ہے؟اور کون سی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے؟ اور کون اس مجمع میں صدر مملکت ہے؟ چنانچہ آدم نے یہ سب بتلادیئے۔

غور کیا جائے کہ اس تاویل سے حجت ملائکہ پر قائم ہوتی ہے یا ملائکہ کی حجت اللہ تعالیٰ پر۔

اس تاویل میں آدم کی خوبی اس علم پر قائم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کو بتادیا تھا۔اور ملائکۃ کا نقص اس علم کے تعلق سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملائکۃ کو نہیں بتایا تھا۔اس میں اس قول کی کیا گنجائش ہے کہ: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں۔" اسی طرح اس بات کی کہ ملائکۃ کیا ظاہر کر رہے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کی کہ ملائکۃ کیا چھپا رہے تھے۔

اس عاجز کے نزدیک یہ پورا معاملہ ـــــ یہ سوالات ـــــ اور اس پر اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حجت اتنی آسان نہیں کہ اس کی تاویل اس طرح سرسری طور پر کی جائے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ اسی حجت میں خلافتِ کائنات کے سارے حقائق پوشیدہ ہیں۔اس لیے اس طرح کی تاویل کرنا کمال سادگی کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔اب ہم اس کی حقیقی تاویل تک رسائی کے لیے اس کا تجزیہ کرتے ہیں:

(۱) **وعلم آدم الاسماء** : سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سارے اسماء سکھادیئے۔ اشیاء کی قید لگانا زائد ہے۔ تاہم اگر یہ بھی مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اشیاء کے نام آدم کو سکھادیئے۔ مثلاً: لوہا، نمک، گھر۔

(۲) **کلھا** : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) ساری اشیاء کے نام یعنی دنیا کی تمام اشیاء کے نام (۲) اشیاء کے اجمالی نام مثلاً: لوہا معدن ہے۔ نمک مزہ دار ہوتا ہے۔ گھر میں رہا جاتا ہے۔

(۳) **ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبؤنی باسماء ھؤلاء** :

اب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سامنے لوہا، نمک اور گھر حقیقی صورت میں پیش کیے۔اور ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے ان کے نام بتاؤ یہ کیا کیا ہیں؟

(۴) **ان کنتم صادقین** : اگر تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ فساد قطعانہ کرنا اور خون قطعانہ بہانا اور ہمہ دم بارگاہ رب العزت میں متوجہ رہ کر اس کی تسبیح و تقدیس کرنا ہی وہ عظیم ترین

خوبی ہے جو اس کی مستحق ہے کہ ایسی خوبی رکھنے والوں کو خلافت دی جائے۔ اور یہ کہ اس سے نہ عظیم الشان کوئی خوبی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مخلوق اس سے عظیم الشان خوبی سے ملائکہ کے علاوہ متصف ہے ـــــ تو ثابت کرو تم ہی سب پر فائق ہو۔

**(۵) قالوا سبحٰنك ..... انك انت العليم الحكيم :** ملائکہ اس سوال پر حیرت زدہ اور عاجز رہ گئے۔ ان کو کچھ بھی علم نہیں تھا کہ یہ اشیاء جو سامنے ہیں یہ فی الواقع کیا ہیں؟ انہوں نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اظہار عجز کرتے ہوئے اپنی حقیقت کا اظہار کیا اور کہا: اے اللہ! ہم صرف وہی جانتے ہیں اور اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں بتایا ہے۔ چونکہ آپ نے ان کا علم ہمیں نہیں دیا اس لیے ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ سامنے نظر آنے والی چیزیں کیا ہیں۔ اور ان سب کا علم اور اس کی حکمت تو صرف آپ جانتے ہیں۔

**(۶) قال يٰادم انبئهم باسمائهم:** یہ ایک نازک بات ہے۔ اور اسے سمجھنے کے لیے شق نمبر ۱، ۲ اور ۳ کا تجزیہ ضروری ہے۔

(۱) شق نمبر[۱] اور[۲] میں جو یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو سارے اسماء سکھا دیئے اور شق نمبر[۳] میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے کہا کہ ان کے نام بتاؤ۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور اس میں یہ بات نہیں کہ آدم کے ساتھ سکھا کر رعایت کی گئی اور ملائکہ کو نہ سکھا کر ظلم کیا گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو صرف اسماء سکھائے اور اشیاء نہیں دکھلائیں اور ملائکہ کو اشیاء دکھلا دیں اور نام پوچھا۔

چنانچہ جب ملائکہ کو اس آزمائش سے گزارا تو ان کے سامنے اشیاء کی حقیقت پیش کی اور نام پوچھا اور وہ بتانے سے قاصر رہے اور اس کا سبب بتایا کہ اے اللہ تعالیٰ آپ نے تو نام نہیں بتایا تھا۔ اب دوسرے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے آدم کے سامنے ان چیزوں کو مخفی رکھا جن کے صرف نام اسے بتائے تھے اور حکم دیا کہ جاؤ اس نام کی چیز ان کے سامنے پیش کرو۔ آدم نے لوہا یا نمک یا گھر کا نام تو سن رکھا تھا لیکن اس نے کبھی انہیں دیکھا نہیں تھا۔ اس نے اپنی عقل کا سہارا لیا اور غور و فکر کے بعد اور ان کے خواص کے تجزیئے کے بعد انہیں پہچان لینے اور لا کر پیش کر دینے پر قادر ہو گیا جن کا اس سے مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس کے لیے ایک مثال دینی ضروری ہے:

دو یکساں درجے کے دیہاتی جنہوں نے نہ تو کوئی علم سیکھا ہو، نہ دنیا دیکھی ہو لائے جائیں اور ایک کمرے میں رکھے جائیں۔ دونوں کو دو طرح کی آزمائشوں سے گزارا جائے۔ پہلے کو الگ بلا کر کہا جائے دیکھو ایک چیز انٹرنیٹ ہوتی ہے لیکن اسے نہ تو اس کی تفصیل بتائی جائے نہ دکھلایا جائے۔ اب دوسرے کو بلا کر ایک جگہ کھڑا کیا جائے اور اس کے سامنے انٹرنیٹ رکھ دیا جائے اور اس سے پوچھا جائے بتاؤ یہ کیا ہے۔ وہ جواب دے میں نہیں بتا سکتا۔ اب انٹرنیٹ کو پھر چھپا دیا جائے۔

اب پہلے کو بلا کر کہا جائے کہ جا کر کمرے میں سے انٹرنیٹ اٹھا لاؤ۔ وہ کمرے میں جائے۔ کمرے میں لاکھوں چیزیں رکھی ہوئی پائے جن کو اس نے کبھی نہیں دیکھا صرف نام سنے ہیں لہٰذا وہ نہیں جانتا کون سی چیز کیا ہے؟ لیکن وہ اپنی عقل سے کام لے اور چیزوں کے رنگ، شکل اور ان رنگوں اور شکلوں کے خواص پر غور کرے اور اپنی عقل سے یہ معلوم کرلے کہ اچھا فلاں چیز لوہا ہے اور فلاں چیز نمک اور فلاں انٹرنیٹ اور اس طرح انٹرنیٹ کو باہر لا کر پیش کر دے کہ لیجئے یہ انٹرنیٹ ہے چنانچہ آدم نے یہی کیا۔

ملائکہ: کو نام نہیں بتائے گئے تھے لہٰذا وہ ان کے نام نہیں جانتے تھے لیکن وہ اشیاء بعینہٖ ان کے سامنے پیش کی گئیں اور وہ انہیں دیکھ کر یا چھو کر یا ان پر غور کر کے صرف یہ جان نہ سکے کہ ان اشیاء کا کیا نام ہے۔ اس کے بر خلاف آدم نے صرف نام سنا تھا اور کبھی نہ شکل دیکھی تھی نہ حقیقت لیکن اس کے باوجود اس نے عقل سے کام لیا، شکل، رنگ اور بناوٹ پر غور کیا اور حقیقت پالی۔ غور کیا جائے تو پہلا سوال کمتر درجے کا ہے اور آسان ہے۔ دوسرا سوال پیچیدہ تر ہے اور مشکل۔

(۷) **فلما انباھم باسمائھم..... غیب السمٰوات والارض** : ظاہر ہے جب آدم نے ملائکہ کے مقابلے میں مشکل آزمائش میں کامیابی حاصل کرلی اور ملائکہ ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میرا فیصلہ درست ہے کہ آدم ہی خلافت کائنات کے لائق ہے اور یہ کہ تم لوگ جو یہ خیال رکھتے ہو کہ فساد نہ کرنا اور خون نہ بہانا اور ہمہ دم بارگاہ رب العزت میں متوجہ رہ کر اس کی تسبیح و تقدیس کرنا ہی وہ عظیم ترین خوبی ہے جو اس کی مستحق ہے کہ ایسی خوبی رکھنے والوں کو خلافت دی جائے اور یہ کہ اس سے نہ عظیم الشان خوبی ہو سکتی ہے نہ کوئی اس سے زیادہ عظیم الشان خوبی سے ملائکہ کے علاوہ متصف ہے تو یہ بات غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب سے سب سے زیادہ باخبر ہوں۔ چنانچہ آدم تم سے بھی زیادہ عظیم الشان

صلاحیتوں کا مالک ہے۔

**(۸) واعلم ما تبدون وماکنتم تکتمون** : یہ فقرہ سب سے زیادہ غور طلب ہے خاص طور پر ان حضرات کے لیے جو ملائکہ کے سوال کو اعتراض تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے:

"اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔"

اگر یہ فقرہ اس معنی میں ہوتا تو اس کا متن یوں ہوتا:

"واعلم ما تبدون وماتکتمون"

جیسا کہ سورۂ النور آیت:۲۹ میں ہے:

"والله یعلم ماتبدون وماتکتمون"

یا پھر اس کا متن ایسے ہوتا ہے!

"واعلم ما کنتم تبدون وما کنتم تکتمون"

جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے:

"بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون."

اس کا درست ترجمہ اس عاجز کے نزدیک یہ ہے:

"اور جانتا ہوں جو تم (اس وقت) ظاہر کر رہے ہو اور جو تم (عرصے سے اپنے دلوں میں) چھپاتے چلے آ رہے ہو۔

چنانچہ اس وقت ظاہر کرنا یہ ہے کہ الارض میں کیوں خلافت قائم کی جا رہی ہے اور اصلِ ارض آدم کو کیوں خلیفہ بنایا جا رہا ہے، اور یہ کہ کیا اس سے فساد سرزد نہ ہوگا اور خوں ریزی نہ ہوگی اور یہ کہ ہم تو آپ کی تسبیح اور تقدیس کر ہی رہے ہیں ـــــ اور (عرصے سے اپنے دلوں میں) چھپاتے چلے آنا یہ ہے کہ اے کاش ہم ملائکہ کو خلیفہ بنایا جاتا ـــــ

# خلافت کائنات کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پر یہ بات واضح کردی کہ فساد اور ایسی خوں ریزی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو جہاں اس قابل نہیں کہ اس کی تحسین کی جائے بلکہ ایسا کرنے والے سزا کے مستحق ہوئے وہیں یہ بات بھی واضح کردی کہ فساد و خوں ریزی سے دور ہونا اور ہر طرح کے علائق سے کنارہ کش ہو کر صرف، تسبیح و تقدیس کرنا بھی قابل تحسین تو ہے مگر یہ وہ مطلوبہ صلاحیت نہیں جو خلافت کائنات کے شایان شان ہو۔ پہلی صورت میں نافرمانی ہی نافرمانی اور فساد ہی فساد کا رجحان ہے اور دوسری صورت میں فرمانبرداری ہی فرمانبرداری اور کلیتاً توجہ الی اللہ کا رجحان ہے۔ اس مقام پر چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو درج ذیل ہیں:

## عالم خلق :

رب العٰلمین کا ایک نام ـــــ النور ہے۔ لیکن النور ہونا کیا ہے کہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس النور کا اس مخزن نور سے صرف اتنا تعلق ہے کہ النور خالق کا ایک نام ہے اور مخزن نور، مخلوق۔ چنانچہ اللہ رب العٰلمین نے تین مخازن سے تین انواع پیدا فرمائے۔ نور سے نوری انواع، نار سے ناری انواع اور ارض سے ارضی انواع۔ نوری انواع سے ملک ہیں، جن پر غلبۂ فرمانبرداری اور کلیتاً متوجہ الی اللہ ہونا ہے۔ عام طور پر ان کی طبیعت نہ نافرمانی کی طرف مائل ہوتی ہے نہ کسی اور بات کی طرف۔ وہ صرف اور صرف متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں۔ ناری انواع سے جن ہیں۔ جن پر غلبۂ نافرمانی اور فساد ہے۔ عام طور پر ان کی طبیعت فرمانبرداری کی طرف مائل نہیں ہوتی بلکہ نافرمانی، فساد اور قتل و غارت گری کی طرف عام رجحان ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک عموماً اللہ تعالیٰ کے مطیع ہوتے ہیں اس طرح بیشتر مقربین ملائکہ ملک یعنی انواع نور سے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمام ملائکہ کے سردار اور سب سے مقرب حضرت جبرئیل ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت میکال (قرآن نے صراحتاً صرف حضرت جبرئیل اور میکال کا نام لیا ہے)، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ملک جنہوں نے سرتابی اور نافرمانی کی ہو صرف ہاروت و ماروت ہیں۔ (ہر چند کہ قرآن اس پر خاموش ہے کہ وہ دونوں ملک جو انسانوں کے مابین آئے وہ کیوں آئے تھے اور پھر ان کا کیا انجام ہوا؟ لیکن اس امر کا یہاں تذکرہ بے محل ہوگا)

دوسری طرف انواع نار میں صرف ابلیس ہی فرمانبرداری، تقویٰ اور عبادت میں آگے بڑھا یہاں تک کہ ملائکہ اور مقرب ہو گیا۔ چنانچہ ایسے ابناء نار جو فرمانبردار ہوئے نافرمانوں کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑے تھے اور مقرب تو غالباً صرف ایک ہو سکا۔

ان دونوں کے برخلاف اللہ رب العٰلمین نے ارض سے آدم کی تخلیق کی۔ آدم میں دونوں مخلوقات یعنی ابناء نور اور ابناء نار کے مقابلے میں اعتدال تھا۔ یہ ارضی نوع فرمانبرداری بھی کر سکتی تھی اور نافرمانی بھی۔ یہ دونوں کا مجموعہ تھی۔ اگر انواع نور میں خیر و شر کے تناسب کو ۹۹ اور ۱ قرار دیا جائے اور انواع نار میں ۱ اور ۹۹ تو گویا انواع ارض میں آدمی میں یہ تناسب ۵۰ اور ۵۰ تھا۔ اور اس کا سبب اس کے اندر پائی جانے والی دو اضافی قوتیں ہیں۔ یعنی (۱) عقل اور (۲) قوت تمیز و تخییر۔ اس اعتبار سے اگر انواع نور یعنی ملک اور انواع نار یعنی جن کو مخلوق مطرف یعنی انتہا پسند مخلوق کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا یعنی ملک مخلوق مطرف للخیر اور جن مخلوق مطرف للشر۔ جب کہ ان دونوں کے مقابلے میں ابناء ارض مخلوق معتدل تھے۔ مخلوق معتدل تو وہ بنیادی طور پر نور اور نار کے بجائے ارض کے ہونے کی وجہ سے تھے لیکن یہ بجائے خود کوئی خوبی نہ تھی۔ ابناء ارض کے پاس اس اعتدال پر مستزاد دو اور خوبیاں تھیں۔ جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو تھا۔ نہ اس سے ملک واقف تھے نہ جن۔ چنانچہ ابناء ارض کی ان دو میں سے ایک خوبی اسے ابناء نور سے ممتاز کرتی تھی اور دوسری ابناء نار سے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مخلوقات یعنی ملک اور ابلیس پر آدم کی یہی خوبیاں منکشف کیں۔ چونکہ ملک اور جن الگ الگ طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کے رویے الگ الگ ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ملک پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ ان کے پاس کوئی آزاد عقل نہیں اور وہ کلی طور پر مزود و محروس عقل (Recorded & Regulated Intuition) سے متصف ہیں۔ جب کہ آدم آزاد عقل رکھتا ہے۔

جب یہ بات ملک پر واضح کر دی گئی تو وہ حسب عادت فوراً نہ صرف اطاعت کی طرف راجع ہو گئے بلکہ انہوں نے آدم کی خلافت کو کلی طور پر تسلیم کر لیا اور اب بحیثیت خلیفہ خلافت کی تمام ذمہ داریوں میں آدم کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

(۲) جن یعنی ابلیس کا رویہ ملک سے بالکل مختلف تھا اس نے اپنا مسئلہ دوسری طرح سے

پیش کیا۔ اس نے استفادہ یا استفسار حتی کہ اعتراض کرنے کے بجائے تمرد اُسب سے پہلے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی خلافت کا دعویٰ اس طرح پیش کیا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نافرمانیوں کے بعد بھی اس سے کلام فرمایا اور پوچھا کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب تکبر سے بھرا ہوا اور سرکشی پر مبنی تھا۔ یہ پورا مکالمہ غیر معمولی ہے اور دقیق نکات بیان کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا: قال ما منعك الا تسجد اذا مرتك۔ (الاعراف:۱۲)

ترجمہ: کہا! کس چیز نے تجھ کو روکا کہ تو سجدہ نہ کرے جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔

بات اگر صرف یہ ہوتی یعنی 'ما منعك الا تسجد' تو کوئی بات نہیں تھی۔ بات غیر معمولی اس لیے ہو گئی کہ اس قول میں اصل زور "الا تسجد" پر نہیں بلکہ اس کے بعد کے فقرے پر ہے۔ یعنی 'اذ امرتك'۔ خلاف معمول اور اب تک اپنے ریکارڈ کے برعکس اس کا جواب ابلیس نے دیا: "قال انا خير منه" (اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں) اور اس پر مستزاد ـــــ خواہ اللہ نے پوچھا ہو کہ کیسے خواہ نہ پوچھا ہو ـــــ اس نے اس کا سبب بتایا:

خلقتنی من نار وخلقته من طين۔ (آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے) (الاعراف:۱۲)

چونکہ ملک کی طرح اس نے اللہ تعالیٰ سے حقیقت کے جاننے کی کوشش نہیں کی نہ ہی کچھ ایسا اعتراض کیا کہ جس کے بعد اس کی غلط فہمی یا غلطی اس پر واضح کی جاتی بلکہ اس کے بجائے اس نے اللہ تعالیٰ پر ان کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ آگ سے بنا ہے اور آدم مٹی سے آگ والا اس مٹی والے سے افضل ہے بھلا اللہ نے افضل کو مفضول اور مفضول کو افضل کیسے بنا دیا؟ ظاہر ہے اس تمرد کی اسے سزا ملتی چنانچہ اس سے کہہ دیا گیا:

قال فاهبط منها فما يكون لك ان تتكبر فيها فاخرج انك من الصاغرين۔ (الاعراف:۱۳)

ترجمہ: کہا تو اتر یہاں سے ـــــ تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں ـــــ پس باہر نکل ـــــ تو ذلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس عتاب پر نادم ہو کر تائب ہونے کے بجائے اس نے اللہ تعالیٰ کو اس

طرح چیلنج دیا:

قال انظرنی الی یوم یبعثون۔

ترجمہ: کہا مجھے اٹھائے جانے کے دن تک مہلت دے دیجئے۔

گویا اس نے کہا ذرا مجھے ایک موقع تو دیجئے پھر میں ثابت کر دوں گا کہ آپ غلط ہیں یا میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو موقع عنایت فرما دیا:

قال فانك من المنظرین۔

ترجمہ: کہا: تحقیق تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہو گیا۔

یہاں غور طلب بات آدم کی وہ خوبی ہے کہ جو اسے ابناء جن سے ممتاز کرتی ہے۔ جسے اگر ابلیس موقع دیتا تو اللہ تعالیٰ اس پر اسی وقت واضح کر دیتا جیسا کہ اس نے ملک کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن اب صورت بدل چکی تھی لہٰذا اب ابلیس کو اجازت مل گئی اور عند اللہ یہی بات ہے کہ بالآخر آدم ابلیس پر اپنی وہ برتری ثابت کر کے رہے گا۔ جنوں کے مقابلے میں آدم کی وہ خوبی خیر و شر میں قوت تمیز ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کا فقدان ابناء نار کو فساد اور خونریزی اور نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور یہی وہ قوت ہے جو آدم کے پاس بطور خاص ہے۔ اس اعتبار سے خلیفۃ اللہ کی آزمائش عقل اور تخییر ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیفۃ اللہ کا اصلی منصب کیا ہے اور اس کی منتہا کیا ہے؟

رب کائنات کی ربوبیت کے منصوبے میں ایک ایسی خلقت کا ظہور تھا جو خلقت اس رب کائنات کی ربوبیت کی مظہر اتم ہوتی اور وہی خلقت اس کی مستحق ہوتی کہ وہ خلافت اللہ کی حامل ہوتی اور اسی میں وہ ذات ہوتی جو اپنی ذات میں خلیفۃ اللہ ہوتی۔[۹]

چنانچہ وہ خلقت جو خلافت اللہ کی مستحق ہوتی دراصل وہ لوگ ہیں جو بحیثیت مجموعی اپنے نفس کو روح اور روح کو نفس مطمئنہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور جو لوگ اس کامیابی کو پالیں وہی اس مقام کے مستحق ہیں جسے قرآن نے 'مقعد صدق عند ملیك مقتدر' کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان المتقین فی جنت ونهر فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر (القمر: ۵۴۔۵۵)

ترجمہ: بے شک متقین جنت اور ندی میں ہیں۔ سچی بیٹھک میں نزدیک ہمیشہ قائم بادشاہ

کے جس کا سب پر قبضہ ہے۔

میں نے 'بحیثیت مجموعی' کا جو ذکر کیا ہے اس کی کنہہ یہ ہے کہ ہر چند کہ مطلوب اور محبوب یہی ہے کہ سارے، انسان المتقین ہو کر مقعد صدق کا حصول کریں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو گا۔ بلکہ ان میں سے کچھ کفر کر کے ناکام ہو جائیں گے اور جہنم کی طرف چلے جائیں گے۔ اب باقی بچے وہ انسان جنہوں نے کفر نہیں کیا۔ تو مطلوب تو یہی ہے کہ وہ سارے کے سارے مقعد صدق کا حصول کر لیں۔ لیکن عملاً ایسا بھی نہیں ہو گا۔ بلکہ ان میں سے کچھ شرک کے علاوہ گناہ کبیرہ و صغیرہ کر کے اور توبہ کے بغیر زندگی گزار کر ناکام ہو جائیں گے اور جہنم کی طرف چلے جائیں گے۔ اور ایک مدت تک وہاں سزایاب ہوں گے۔ اب باقی بچے وہ انسان جو فی الواقع المتقین کی طرح اپنے نفس کو روح تک اور روح کو نفس مطمئنہ تک لے جانے میں اسی دنیا میں کامیاب ہوں گے اور وہ یوم الدین کے بعد سیدھے مقعد صدق تک چلے جائیں گے۔ اگر کہا جائے تو بہت سے ایسے نفوس قدسیہ ہیں جو اسی حیات میں اپنے نفس کو روح تک اور روح کو نفس مطمئنہ تک لے جانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اسی حیات میں مقعد صدق تک پہنچ جاتے ہیں۔ چونکہ کوئی نفس بشر اسی حیات میں مقعد صدق کا عملاً حصول نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس کے حصول میں موت، برزخ اور یوم الدین حارج ہیں اور اس لیے وہ عملاً کے بجائے ان دروازوں سے گزرنے سے قبل صرف حکماً ہی مقعد صدق کا حصول کر پاتے ہیں۔ چنانچہ یہی لوگ عشرہ مبشرہ ہیں اور ان سے اوپر حضرات انبیاء کرام۔

یہ تو مقام ہے اس گروہ کا جو خلافت اللہ کا حامل ہے۔ لیکن اس مقام کا صدر نشین وہ فرد ہے جو فی الواقع ذات کے اعتبار سے خلیفۃ اللہ ہے۔ اور اس صدر نشین کا ایک منصب ہے جو دراصل خلیفۃ اللہ کا ذاتی منصب ہے۔ اور اسی منصب کا نام مقام محمود ہے۔ مقام محمود نام ہے اس مقام کا جو اس پورے منصوبہ کائنات کا حاصل ہے۔ اور اس مقام پر جاگیر ذات ہی فی الواقع خلیفۃ اللہ کائنات ہے۔

اور یہی وہ مقام ہے جس پر سردار کون و مکان، اشرف الناس، اشرف الانبیاء، خاتم النبیین، حضرت محمد ﷺ فائز ہونے والے ہیں۔

یہ سمجھنا قطعاً مشکل ہے کہ یہ مقام کیا ہے؟ لیکن ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ اس مقام پر

آنحضور ﷺ کا فائز ہونا صرف ذات اقدس کا فائز ہونا نہیں بلکہ:

(۱) تمام نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو پہلے درجے کے المتقین ہیں۔ اور اس دنیا سے سیدھے الجنۃ میں جانے کے مستحق ہیں۔

(۲) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو دوسرے درجے کے المتقین ہیں اور اس دنیا کے بعد گناہوں کے سبب جہنم میں جائیں گے اور پھر الجنۃ میں جانے کے مستحق ہوں گے۔

(۳) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو تیسرے درجے کے المتقین ہیں اور اس دنیا میں ہی مقام المتقین سے اٹھنے کے بجائے کفر و شرک کر کے نیچے گر گئے اور اس سبب سے جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال دراصل مقام محمود پر آنحضور ﷺ کو عملاً فائز کرانے سے پہلے کی ہے۔ اس وقت آپ کیا دعا فرمائیں گے اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اس لیے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ اپنے مقام سے کفر و شرک کرنے کی وجہ سے گر جانے والے ایسے المتقین کے لیے قرآن میں بیان کردہ، فی نار جهنم خالدين ابداً سے مراد محض زمان و مکان کی موجودہ اصطلاح میں دوام ہے۔ (ورنہ اس کی حقیقت اللہ ہی جانتے ہیں۔)

(۴) تمام ان نفوس کی طرف سے فائز ہونا ہے جو کسی درجے میں مخلوقات مختار ہیں یعنی ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض۔

(۵) حتیٰ کہ اس مقام محمود پر آنحضور ﷺ کا فائز ہونا دراصل پورے ماکان و مایکون کی طرف سے فائز ہونا ہے۔

اور یہی مقام محمود ہے۔ اور یہی خلافت کبریٰ ہے۔ مقام محمود اس مقام کا نام ہے۔ اور اس مقام کے حامل کے انعامات یا اختیار کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور لفظ سے واضح کیا ہے اور وہ لفظ ہے:

## الکوثر

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

انا اعطيناك الكوثر۔ (الکوثر: ۱)

ترجمہ: بے شک اے محمد! ہم نے آپ کو الکوثر عطا کر دیا۔

یہ الکوثر کا عطا کیا جانا خیر کثیر کا عطا کیا جانا نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ وہ عظیم ترین اعلان ہے جو دراصل منصوبہ کائنات کی تکمیل کا اعلان ہے! اس اعلان کا مفہوم ہے:

(۱) اے محمد! ہم نے آپ کو مقام محمود عطا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

(۲) اے امت محمدیہ! ہم نے تم کو خلیفہ بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا میں ـــ اللہ ـــ اس کی توثیق کرتا ہوں۔

(۳) اے بنی آدم! ہم نے تم کو خلیفہ بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا میں ـــ اللہ ـــ اس کی توثیق کرتا ہوں۔

(۴) اے میری کائنات! ہم نے تجھے کائن کر کے اپنی ربوبیت کا جو اظہار کرنا چاہا تھا میں ـــ اللہ ـــ اس کی توثیق کرتا ہوں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت اس دنیا میں اور آپ ﷺ کے عالم اشیاء یعنی نفس کی حالت میں ہونے کی صورت میں دی اور ابھی اس کے اصل تک پہنچنے (Realise or Actualise) ہونے میں موت، برزخ اور یوم الدین کے پردے حائل تھے اس لیے یہ الکوثر یعنی مقام محمود کی خوش خبری ہی نہیں بلکہ حکماً اس کا حصول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا۔ (اسریٰ :۷۹)

ترجمہ: قریب ہے کہ تیرا رب تیری بعثت کر دے مقام محمود میں۔

واضح ہو کہ یہی سبب ہے کہ سورۂ الکوثر کے نزول کے تعلق سے یہ اختلاف ہے کہ یہ سورہ مکی ہے یا مدنی۔ دراصل جب سے کائنات بنی اور پھر جب سے اس میں معرکۂ خیر و شر کا آغاز ہوا کائناتی سطح (Macro Cosmic Plane) پر یہ وہ آخری مرحلہ تھا جب اللہ تعالیٰ اپنے کائنات کے خلیفہ اصل کو عالم اشیاء کے مراحل سے گزار رہا تھا اور اب کائناتی سطح پر وہ گھڑی آگئی تھی جب اس کا فیصلہ کیا جاتا اور اس کی توثیق کی جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو جنت ماویٰ کے قریب بلایا۔ اور بلانے سے قبل ان کی تمام انبیاء کی ارواح سے توثیق کرائی کہ وہ ان کے سردار ہیں اور یہ کہ وہ انبیاء ان کی قیادت میں مطمئن ہیں۔ پھر انہیں ایک مقام پر لے جا کر ابناء نور میں سے سب سے مقرب حضرت جبرئیل سے یہ کہلایا کہ اب آپ آگے تشریف لے جائیں اس کے آگے جانے کی تاب کسی بنی نور میں نہیں۔ اسی دوران بلکہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مقعد

صدق اور اس الجنۃ اور اس نہر کا مشاہدہ کروایا۔ واپسی میں بشارتا چند ہی دنوں کے اندر اس سورۃ کے ذریعہ تسلی دی جس کا ذکر حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا ہے۔ اسی طرح مزید تسلی کے لیے اور اس وقت جب آنحضور ﷺ عالم اشیاء میں خلافت کبریٰ کے حصول کی آخری کارروائی کا مرحلہ شروع کر چکے تھے یعنی الفتح اور بدر سے قبل ہجرت تو اللہ تعالیٰ نے مزید تسلی دی۔ (ان شاءاللہ ان کی تفصیلات آئندہ آئیں گی) اور فرمایا:

عسی ان یبعثك ربك مقاماً محموداً۔ (اسریٰ: ۷۹)

جو حضرات قرآن میں رسوخ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنی غیر معمولی، سنگین اور فیصلہ کن (Critical) گھڑی تھی ـــ پوری کائنات کی تاریخ میں شاید ہی کائنات ـــ معرکۂ خیر و شر شروع ہونے کے بعد کبھی ایسی قیامت کی گھڑی سے گزری ہو اور ایسے وقت میں پوری کائنات میں جو طوفان برپا تھا اس میں آپ ﷺ کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی کہ ان کی تسلی کی جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ومن الیل فتهجد به نافلة لك۔ (اسریٰ :۷۹)

ترجمہ: اور رات کے تھوڑے حصے میں بیدار رہ قرآن کے ساتھ یہ تمہارے لیے اللہ کی توجہ اترنے کا سبب ہوگا۔

اگرچہ اس کی تفہیم کے لیے یہ مثال شایان نہیں تاہم تقریب فہم کے لیے یہ مثال دینی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اس صورت حال کا نقشہ عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آجائے:

پوری کائنات میں ایک کائناتی جنگ کے آثار ہیں۔ یہ کائناتی جنگ دراصل وہ جنگ ہے جس میں سارے ملائکۃ اور مومنین ایک جانب ہیں اور سارے نافرمان ابناء نور، ابناء نار اور ابناء ارض ابلیس کے ساتھ ہیں۔ ابلیس ہر طرح کے ہتھیار جس میں جوہری اور کیمیادی ہتھیاروں سے بھی اربوں گناہ زیادہ خطرناک ہتھیاروں سے اور پوری کائنات میں لڑنے کے لیے حملہ کرنے ہی والا ہے۔ اس جنگ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے کائنات میں کسی رسول کے ذریعہ کی جانے والی آخری ہجرت کا فیصلہ کیا اور اس طرح اسے بعض مصالح کے سبب ملائکۃ کے ذریعہ ایک محفوظ مقام سے دوسرے محفوظ مقام میں منتقل کرنے کا فیصلہ لے چکا ہے یا لینے والا ہے۔ کسی بھی وقت وہ بھیانک لڑائی چھڑ سکتی ہے اور کائنات تہہ و بالا

ہو سکتی ہے۔ ٹھیک، ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مطلع کرتا ہے اور تسلی دیتا ہے کہ سارے انتظامات ٹھیک ٹھیک ہیں۔ ابلیس اپنی فوج کے ساتھ چاہے جدھر سے حملہ کرے ملائکۃ مومنین کی مدد کریں گے۔ اور یوں تو اس جنگ میں فتح اے رسول آپ کی ہی ہو گی اور ابلیس آپ کو مقام محمود کے پانے سے روکنے میں ناکام ہو جائے گا۔ اور یہ کہ ملائکۃ اور مومنین سب ٹھیک ٹھیک تیار ہیں اب آپ سارے کاموں کے ساتھ اس کا بھی التزام کریں کہ ہمہ وقت Hot Line پر مجھ سے ربط رکھیں۔

یہ ہے وہ پوری مثال جو اس آیت کی تفہیم کے لیے ضروری تھی۔

اور پھر چند سالوں کے بعد بدر کا واقعہ ہوا جس میں مومنین آنحضرت ﷺ کی قیادت میں خلافت کبریٰ کی راہ میں آنے والی اس ہولناک آزمائش میں کامیاب رہے تو اللہ تعالیٰ نے مقام محمود کی توثیق کر دی۔ اور اس طرح سورۂ الکوثر نازل ہوئی جس کی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔

## باب چہارم

# معرکۂ خیر و شر کی تاریخ

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب
اقبال [1]

معرکۂ خیر و شر کی اس تاریخ کو جو 'فانظرنی إلی یوم یبعثون' کے جواب میں 'فإنك من المنظرین' سے شروع ہوتی ہے ـــــ تفہیم کی آسانی کے لیے ـــــ ہم دس حصوں یا مرحلوں میں منقسم کرتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر حصے میں نہایت مختصر طور پر جائزہ لیں گے کہ معرکہ کی کیا صورت حال رہی۔ ان دس مرحلوں کا ہم آٹھ پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔ یہ آٹھ پہلو ہیں:

(۱) مرکزی میدان کار (۲) صفت فریقین (۳) وسعت دائرۂ معرکہ (۴) حکمت عملی: طریقۂ کار (۵) اسلحہ: قوات (۶) ہلاکت و نقصان (۷) نتیجہ (۸) مابعد اثر (Post Effect)۔

چنانچہ یہ دس مرحلے درج ذیل ہیں:

# (۱) مرحلۂ اوّل : آدم قدیم

جس وقت سجدۂ آدم کا حکم ہوا اور ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے انکار ـــــ اس وقت آدم عالم عصر سے نکل کر عالم اشیاء میں آچکے تھے۔ لیکن یہ وہ آدم نہیں تھے جو دوسرے مرحلے میں وہ ہو گئے۔ اس کے پہلے مرحلے میں وہ آدم قدیم تھے۔ آدم قدیم آدم کی وہ حالت تھی جب حضرت حوا کا جسم ان سے جدا نہیں ہوا تھا اور وہ بیک وقت اپنی ذات میں آدم اور حوا دونوں تھے۔ چنانچہ ملائکہ نے جس آدم کو سجدہ کیا اور ابلیس نے جس کا انکار وہ آدم و حوا دونوں بیک جان تھے۔ یہی وہ دور ہے جسے قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

خلق منها زوجها۔ (النساء : ۱)

اس میں منھا کی ھا جس کی طرف راجع ہے وہ وہی آدم اور ان کا جسم ہے۔ چنانچہ اسی جسم کو کہا گیا کہ وہ الجنۃ میں جا کر رہے۔ قرآن نے کہا:

وقلنا یاٰدم اسکن انت۔ (البقرہ : ۳۵)

ترجمہ: اور ہم نے کہا اے آدم! بس جاؤ تم۔

اس وقت الجنۃ میں صرف آدم قدیم تھے۔ اور کوئی نہ تھا۔ یہی پہلا مرحلہ تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے یہ مرحلہ کتنے سالوں یا کتنے ہزار سالوں پر مشتمل تھا۔ تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں ابلیس جو اب الشیطان ہو چکا تھا اپنی تدبیروں میں کلیتاً ناکام رہا اور وہ آدم قدیم کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا۔ اس طرح یہ مرحلہ شیطان کی کلی ناکامی پر منتج ہوا۔ اس ناکامی نے الشیطان کو باور کرایا کہ وہ طریقہ کار جس پر وہ اب تک عامل رہا ہے بے سود رہا لہٰذا اسے اس حکمت عملی کو وسعت دینی چاہئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تک ابلیس نے تنہا کوشش کی تھی۔ اور آدم قدیم بمقابلہ ابلیس کا معاملہ تھا اور طریقۂ جنگ محض ایک قولی کوشش تھی جس کا آدم قدیم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

# (۲) مرحلۂ دوم : آدم وحوا

الجنۃ کا دوسرا دور وہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے جسم سے حوا کو الگ کر دیا۔ قرآن کا بیان ہے: خلق منها زوجها. (النساء: ۱)

ترجمہ: اور اس سے پیدا کیا اس کا جوڑا۔

اس 'زوجھا' میں آدم قدیم کے دو حصے کیے گئے اور ہر حصہ دوسرے کا زوج قرار پایا۔ چنانچہ سورہ البقرہ میں 'وقلنا یادم اسکن انت وزوجك' میں 'و' کو عطف سمجھنا درست نہیں۔ بلکہ فصل زمانی ہے۔ جب آدم کو الجنۃ میں بسایا گیا تو وہ تنہا تھے۔ اس لیے 'اسکن' کا اطلاق صرف آدم قدیم پر ہوگا حوا پر نہیں۔ اس وقت تک حوا پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ لہٰذا اس آیت میں 'و' کا مفہوم وہ نہیں جو اذهب انت واخوك (طہ :۴۲) میں 'و' کا ہے۔ ممکن ہے یہاں یعنی طٰہٰ:۴۲ میں بھی فصل زمانی ہی ہو۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں الشیطان کی کوششوں کے باوجود اس کے ناکامی اور اس کے ذریعہ نئے طریقۂ کار، نئی قوت اور نئی حکمت عملی کے اختیار کرنے کا علم اللہ تعالیٰ کو تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں آدم وحوا کو پوری رہنمائی عطا کر دی کہ الشیطان کیا کچھ کر سکتا ہے اور اسے ناکام بنانے کے لیے آدم وحوا کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت اللہ تعالیٰ نے دو تجویزیں دیں۔ ایک معروف اور دوسری منکر۔[۲]

- معروف: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وكلا منها رغدا حيث شئتما. (البقرہ:۳۵)

ترجمہ: اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو۔

منکر: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا تقربا هذه الشجرة. (البقرہ:۳۵)

ترجمہ: اور پاس مت کرنا اس الشجرۃ کو

چونکہ دوسرے مرحلے کا مرکزی دائرۂ کار الجنۃ تھا۔ جس میں الشیطان کا داخلہ ممکن نہ تھا۔ اس لیے اس نے قوت کار اور طریقۂ جنگ میں تبدیلی کی جو دو باتوں پر مشتمل تھی۔ اس نے پہلی کوشش کی اور اپنے ساتھ ایک ملک کو ملانے میں کامیاب ہو گیا جس کا داخلہ الجنۃ میں ممکن تھا۔ اور دوسری کوشش تدبیری تھی اور اب اس نے اپنی توجہ کا مرکز آدم وحوا کی ساخت کو بنایا۔

چنانچہ اس نئی تدبیر سے وہ پہلی بار ایک عظیم کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

فازلهما الشيطان عنها۔ (البقرہ:۳۶)

ترجمہ: پھر ہلا دیا شیطان نے ان کو اس جگہ سے۔

ابلیس کی یہ عظیم ترین کامیابی آدم کی بدترین ناکامی تھی۔ اس کا نتیجہ ابلیس کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ اس کا معمول (آدم) اب اس کی دسترس سے دور الجنۃ میں محفوظ و مامون نہیں رہ گیا وہ اپنے شکار کو اس محفوظ و مامون جگہ سے ایسے کھلے میدان میں لانے میں کامیاب ہو گیا جہاں اس کی رسائی بلاواسطہ تھی۔ دوسری طرف آدم کے لیے اس کا نتیجہ تباہ کن (Disastrous) ہوا جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) آدم، حوا نے اللہ کی نافرمانی کی۔

(۲) الشجرۃ کے قریب ہو گئے اور اس کا مزہ لے لیا۔ چنانچہ اس کے قریب ہونے اور مزہ لینے کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ ایک فساد عظیم تھا جو آدم و حوا میں پیدا ہو گیا۔ قرآن نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے ابلیس کے طریقۂ جنگ، حکمت عملی، اسلحے، مقصد، نتیجہ اور فساد عظیم سب پر روشنی پڑتی ہے۔ قرآن نے فرمایا:

**فوسوس لهما الشيطان ليبدى لهما ماورى عنهما من سواتهما**

(الاعراف: ۲۰)

ترجمہ: اس نے ان دونوں کے اندر وسوسہ ڈلوایا تاکہ کھلوا دے ان پر وہ جو ان کی نظر سے پوشیدہ ہے ان کے جسم میں۔

اس کا یہ ترجمہ جو عام طور کیا جاتا ہے اس عاجز کے نزدیک درست نہیں:

"پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھیں ان کی شرمگاہوں سے۔"

الشیطان کی رسائی الجنۃ تک اب نہیں رہ گئی تھی۔ اس لیے وہ آدم و حوا کو راست بہکا نہیں سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ساری تدبیریں پہلے مرحلے میں ناکام ہو گئی تھیں۔ اس لیے الشیطان کی اب اس دوسرے مرحلے میں پہلی ترجیح تھی آدم و حوا کو الجنۃ سے باہر نکالنا۔ اس لیے کہ الشیطان الجنۃ میں بلاواسطہ وسوسہ نہیں ڈال سکتا تھا۔ بلاواسطہ وسوسہ کے لیے ــــ فی یا ب ــــ آتا

ہے ـــــ ل یا اِلی نہیں۔ (ملاحظہ ہو طٰہٰ:۱۲۰ اور الناس :۵ اور ق:۱۶)

یہاں ان تمام امور کی تفصیل کے بیان کرنے کا موقع نہیں بہر حال اس نے ایسی حکمت عملی اپنائی کہ آدم و حوا اس الشجرۃ کو قریب کر بیٹھے اور انہیں اس کا مزہ مل گیا۔ جس سے ان کے جسم میں تبدیلی ہو گئی۔ اور یہ ایک فساد عظیم تھا۔ اور الشیطان یہی چاہتا تھا۔ اس نے اس کا تو علم حاصل کر لیا تھا کہ الجنۃ کی میکانکیت کیا ہے؟ آدم کی میکانکیت کیا ہے؟ چنانچہ الجنۃ سے آدم کو باہر لانے کی ایک ہی صورت اسے سمجھ میں آئی اور وہ یہ تھی کہ ان دونوں کی میکانکیت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے کہ یہ دونوں یعنی آدم و حوا اور الجنۃ ایک دوسرے کو Accomodate نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے وہ الجنۃ کی میکانکیت کو تباہ نہیں کر سکتا تھا اور آدم و حوا کی میکانکیت کو آدم و حوا کے تعاون کے بغیر تباہ نہیں کروایا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک الگ طرح کی راہ نکالی۔ اور اس میں کامیاب ہو گیا۔

(۳) آدم و حوا کو فوراً علم ہو گیا کہ انہوں نے غلطی کر ڈالی ہے۔ لہٰذا وہ تائب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کے گناہ کو معاف کر دیا۔ لیکن وہ طبعی اور روحانی فساد جو الشجرہ کے مزہ لینے سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے اثرات نے آدم و حوا کو الجنۃ کے لیے غیر مناسب (Unsuitable) بنا دیا۔ چنانچہ مغفرت کے باوجود آدم و حوا کو الجنۃ سے باہر جانے اور زمین پر بسنے کا حکم ہوا۔ اس طرح اب وہ اپنے دشمن کے بلاواسطہ ضرب کے لیے کھلے میدان میں اس کے سامنے تھے۔

(۴) غور کرنے سے ایسا لگتا ہے کہ الجنۃ میں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کے اندر Internal Evolution یا (Closed-Circuit External Evolution) کی سنت جاری فرمائی تھی۔ یعنی ممکن ہے کہ الجنۃ میں سارے انسان پیدا ہوتے جن کو آدم سے قیامت تک پیدا ہونا تھا لیکن وہ آدم و حوا سے باہر نکل کر الگ الگ پیدا نہ ہوتے بلکہ ممکن ہے کہ ہر چند لمحوں کے بعد آدم و حوا کا جسم ہی ان لوگوں کے جسم میں بدل جاتا۔ یہ Internal Evolution ہے۔ اس کی حقیقت ایک مثال سے اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک آدمی کے جسم میں دس طرح کے عناصر آج بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو الگ الگ مدت میں بدل جاتے ہیں یا فنا ہو جاتے ہیں جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) وہ عنصر یا عناصر جو ہر سکنڈ پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض سیل Cell وغیرہ

(۲) وہ عنصر یا عناصر جو ہر منٹ پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بعض سیل وغیرہ

(۳) وہ عنصر یا عناصر جو ہر ہفتے یا پندرہ روز میں پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً بال وغیرہ

(۴) وہ عنصر یا عناصر جو ہر مہینے پیدا ہو کر مرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ناخن وغیرہ

(۵) وہ عنصر یا عناصر جو پانچ سال سے دس سال میں مر جاتے ہیں۔ مثلاً جسم کے بعض حصے اور بعض دانت

(۶) وہ عنصر یا عناصر جو پچیس تیس سال میں مر جاتے ہیں مثلاً بعض دانت یا جسم کے بعض حصے

(۷) وہ عنصر یا عناصر جو پچاس سال میں مر جاتے ہیں مثلاً بعض غدود

(۸) وہ عنصر یا عناصر جو سات سات نسلوں کے بعد ہی مرتے ہیں مثلاً بعض جین یا سیل

(۹) وہ عنصر جو بیس بیس نسلوں کے بعد مرتے ہیں۔ مثلاً بعض جین یا سیل

(۱۰) وہ عنصر یا عناصر جو پہلے آدم سے آخری آدم تک مسلسل برقرار رہیں گے جسے آدم کا بنیادی زرثانیج (Seed) کہتے ہیں۔

اب اگر الجنۃ کے میکانزم کو Seed میکانزم مان لیا جائے جو صرف ایک بار پیدا ہوتا اور صرف ایک بار مرتا ہے اور اس دوران صرف جسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی اس Seed پر نوح کا جسم ہوتا ہے تو ہزاروں سال کے بعد ابراہیم کا یہی Internal Evolution ہے۔

Closed-Circuit External Evolution اس کی تھوڑی سی توسیع ہے۔ یعنی الجنۃ میں آدم و حوا کے جسم قائم ہوتے ہوئے اندرونی طور پر بدلنے کے بجائے اور تناسل کے بجائے استنساخ کے طریقے پر بدلتے رہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے حضرت آدم سے حضرت حوا برآمد کی گئی تھیں۔ اور اس طرح الجنۃ میں اولادیں پیدا ہوتیں۔ اور ان اولادوں میں صرف اور صرف صالحین ہی پیدا ہوتے۔ اور ان صالحین کے علاوہ جتنے غیر صالحین کی سینکڑوں قسمیں اب پائی جاتی ہیں۔ وہ پیدا ہونے کے بجائے اندرونی طور پر پیدا ہو کر مر جاتیں مثلاً۔ جیسے یہاں کے جسم کے کسی زخم میں وہ پیپ جو خون ہی ہے مگر غیر صالح ہے وہ بنا ضرور لیکن وہ جسم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا بلکہ نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے افزائش (Culture) سے گزارے تو ممکن ہے کہ اس سے خطرناک قسم کے ذی روح پیدا ہوں۔ اس طرح الجنۃ کے اس Closed Circuit External Evolution میں ممکن ہے صرف انبیاء اور صالحین پیدا ہوتے اور یہ جو کھربوں

غیر سعید انسان پیدا ہوئے یہ پیدا ہو کر اندرون میں ہی مر جاتے اور الجنۃ میں صرف سعید لوگ ہی ہوتے۔

الشیطان نے آدم وحوا کے الشجرہ کو باہم قریب کرا کے اس پورے میکانزم کو دھماکے (Blast) سے اڑا دیا۔ چنانچہ اب آدم وحوا میں نتیجتاً جو تبدیلی آچکی تھی الجنۃ اسے Accomodate نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس فساد کے ظہور کے بعد آدم کا Evoluton ـــ Internal Evolution ـــ یا Closed-Circuit External Evolution کے بجائے Free External Evolution میں ہی نہیں بلکہ Unrestrained External Evolution میں بدل گیا۔

ان تفصیلات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے مرحلے میں الشیطان کو کس طرح کھلی فتح نصیب ہوئی اور آدم وحوا کو شکست۔ اور یہ شکست آدم وحوا کے لیے کتنی تباہ کن (Disastrous) تھی اور الشیطان کے لیے کتنے دور رس فوائد کی حامل بعد کے حالات کے تناظر میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ آدم وحوا کو الجنۃ سے باہر چلے جانے کا حکم ہو گیا۔ یہاں ایک اہم اور بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آدم وحوا کے باہر چلے جانے کا فوری سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اس تعلق سے مفسرین کی قابل ذکر رائیں دو ہیں:

(۱) چونکہ الشجرۃ کے کھانے سے جہاں ایک طرف شرمگاہیں کھل گئیں وہیں دوسری طرف بول و براز کی ضرورت بھی پیش آنے لگی لہٰذا الجنۃ سے باہر چلے جانے کا حکم ہو گیا۔ تقریباً بیشتر مفسرین یہی رائے رکھتے ہیں۔

(۲) چونکہ الشجرۃ کے کھانے سے جہاں شرمگاہیں کھل گئیں اور بول و براز کی ضرورت پیش آنے لگی وہیں ولادت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور ان اولادوں کے لیے الجنۃ غیر مناسب (unsuitable) ہو گئی اس لیے انہیں حکم ہوا کہ وہ الجنۃ سے باہر چلے جائیں۔ یہ رائے مولانا شبیر ازہر میرٹھی صاحب کی ہے۔ مولانا اس کی دلیل میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

(۱) **قلنا اهبطو منهاجميعا.** (البقرہ :۳۸)

ترجمہ: ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب۔

اس عاجز کے نزدیک پہلی رائے سرے سے قابل اعتناء نہیں۔ دوسری رائے ہر چند کہ مجمل اور گنجلک ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں بہر حال قابل اعتناء ہے۔ لیکن اس رائے کے تسلیم کرنے میں کئی قباحتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) جب الشجرۃ کے کھانے سے شرمگاہیں منکشف ہو گئیں، بول و براز کا سلسلہ بھی شروع ہی ہو گیا حتیٰ کہ اولاد بھی ـــــ وہ بھی کئی کئی ـــــ ہو ہی گئیں ـــــ (مولانا متعدد اولاد کے پیدا ہونے کو مستبعد نہیں سمجھتے) تو پھر اب الجنۃ سے نکلنے کی مجبوری کیا ہو سکتی ہے؟

ان تمام مجبوریوں کو صرف دو شقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

(۱) الجنۃ اپنی وسعت اور وسائل کے اعتبار سے تنگ ہو چکی ہو یا ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۲) آدم و حوا کو ان کے گناہ کے نتیجے میں تادیباً یا بطور سزا الجنۃ سے باہر جانے کا حکم ہوا ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ قرآن کی صراحت کے بعد شق نمبر دو کی گنجائش قطعاً باقی نہیں رہتی۔ اور شق نمبر ایک کا ہونا محال ہے اور وہ اس لیے کہ الجنۃ نقیض ہے تنگی کی۔

اور پھر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ آدم و حوا جنت سے کوئی ایک یا ایک سے زائد مولود اولاد لے کر اس روئے زمین پر آئے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ثبوت ہے کہ الجنۃ یا کہیں اور وہ اپنی کوئی ایک یا ایک سے زائد اولاد چھوڑ کر آئے ہیں۔

دراصل اس ساری الجھن کی گرہ اس میں ہے کہ الجنۃ سے باہر جانے کا سبب کون سی مجبوری تھی۔ اس عاجز کی رائے میں سب سے پہلے حضرت آدم و حوا سے جو نافرمانیاں ہوئیں ـــــ ان کی پیچیدگی کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہ وہی پیچیدگی ہے کہ توبہ کے بعد ہر چند کہ تمام نافرمانیوں سے مغفرت مل گئی لیکن اس کے طبعی اور روحانی نتیجے وہ مجبوری بن گئے جن کے سبب آدم و حوا کو الجنۃ سے باہر جانے کا حکم ہوا۔

(۱) آدم و حوا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور الشجرۃ سے قریب ہو گئے:

"الشجرۃ سے قریب ہونا اور الشجرۃ کو چکھنا" کیا ہے؟ قرآن کی اس عبارت سے یہ مراد لینا جیسا کہ بیشتر مفسرین نے لیا ہے کہ وہاں کوئی پھل یا اناج کھانے کی کوئی چیز تھی قرآن کی زبان اور بیان کے خلاف ہے۔ (جس کی تفصیلی تقریر کا یہاں موقع نہیں) اس عاجز کے نزدیک نہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے کوئی پھل یا اناج کھایا نہ کوئی ایسا پھل یا اناج کھانے کی ممانعت تھی۔ بلکہ

انہوں نے وہ عمل کرلیا جسے موجودہ انسانی معاشرہ میں 'جماع' کہتے ہیں۔ لیکن اس عمل کی صورت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں واضح ہو جائیں۔ پہلی بات یہ کہ (۱) الجنۃ میں آدم و حوا کا ایک دوسرے کے لیے زوج ہونا کیا تھا؟ اور دوسری بات یہ کہ الجنۃ میں حضرت آدم اور حضرت حوا کی جسمانی ساخت اور اس کی شکل کیسی تھی؟ جہاں تک پہلی بات یعنی زوج کا تعلق ہے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا الجنۃ میں موجودہ انسانی سماج کے میاں بیوی کی طرح تھے اور اسی طرح زندگی گزار رہے تھے جیسے کوئی میاں بیوی اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے۔ جب کہ ایسا قطعاً نہیں تھا۔ تقریب فہم کے لیے مثلاً وہ اس طرح زوج تھے جس طرح بجلی کے مثبت اور منفی تار یا ٹیلی فون میں الگ کردہ رسیور اور ٹرانسمیٹر یا جوتوں کا ایک جوڑا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے الجنۃ میں جو سنت تولید جاری فرمائی تھی وہ استنساخ (Cloning) تھی۔ خود آدم الجنۃ کی پیداوار نہ تھے۔ حضرت آدم الجنۃ سے باہر بنے۔ الجنۃ کی پیداوار تو صرف اور صرف حوا تھیں۔ جو دراصل آدم کا استنساخ (Cloning) تھیں۔ اور یہی الجنۃ میں اللہ تعالیٰ کی جاری کردہ سنت معلوم ہوتی ہے۔ زمین میں جس طرح زوجین کے اتصال سے ولادت کی سنت عادیہ قائم ہے وہ الجنۃ میں مفقود تھی بلکہ ممنوع تھی۔ اور اسی سے آدم و حوا کو روکا گیا تھا۔

(۲) زوج کی صورت حال اور حضرت آدم اور حضرت حوا کے عمل کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ الجنۃ میں ان دونوں حضرات کی جسمانی اور طبعی حالت اور ان کی شکل کو سمجھا جائے۔

فرض کرلیا جائے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں کے جسم ظاہر میں کلیتہً ایک جیسے تھے۔ عام طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اس زمین پر مرد اور عورت میں دو فرق وقوع پذیر ہوتے ہیں جن سے وہ مرد اور عورت سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ فرق ہے جو پیدائش سے لے کر دونوں کے جوان ہونے تک، دونوں میں واقع ہوتا ہے۔ مثلاً مردانہ اور زنانہ اعضا کا بڑھنا۔ دوسرا فرق وہ ہوتا ہے جو عین پیدائش کے وقت ہی موجود ہوتا ہے۔ اب غور کیا جائے کہ خود یہ فرق جو پیدائش کے وقت ہوتا ہے وہ تقریباً چار ماہ قبل یعنی پانچ ماہ کے حمل میں نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ اور اس وقت باطن میں چاہے، دو الگ الگ صنف بن رہی ہوں لیکن ظاہر میں ان کے اشکال یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جن کے ان اعضا کی دوران حمل افزائش نہیں ہوپاتی

ہے یا تو دونوں میں سے شمار ہوتے ہیں یا عمل جراحی کے ذریعہ یا دواؤں کے ذریعہ انہیں افزودہ بنا کر کسی ایک صنف کی طرف جن کا غلبہ ہوتا ہے لایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا الجنۃ میں اس طرح زوج ہوں کہ بس دو ہوں۔ ان کا باطن یقیناً الگ الگ ہوگا لیکن ان کے ظاہر میں کوئی فرق نہ تھا۔ بلکہ قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں باہم یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ دونوں دو الگ الگ صنف ہیں۔ جیسے بعض اوقات دو صنف کے چھوٹے بچوں کو اس کا احساس نہیں رہتا جبکہ اس دنیا میں وہ پیدائش ہی سے ظاہری طور پر بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں کی صورت یہ ہو کہ دونوں کے جسم ہوں اور ان دونوں کے دو جانب دو یعنی اوپر اور نیچے دو دو سوراخ ہوں۔ یا یہ کہ صرف اوپر کے دو سوراخ کھلے ہوں اور دونوں کے نیچے کے دو سوراخ تو ہوں مگر اس پر کوئی بندش، پُلپہ یا پردہ لگا ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دراصل یہ حکم دیا تھا کہ دیکھو تم دونوں اپنے جسم کے ان دونوں نیچے کے حصوں کو مت ملانا۔ اور الشیطان نے اس مَلَک کے ذریعہ اسی میں کامیابی حاصل کرلی اور ان دونوں نے اپنے دونوں حصوں کو ملالیا۔ یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے 'ذاقا الشجرۃ' سے موسوم کیا ہے۔

چنانچہ حضرت آدم اور حضرت حوا کا یہ عمل نہ صرف ایک عمل تھا بلکہ ایک ایسا عمل تھا جس نے الجنۃ کے پورے نظام کو Blast کر دیا۔ جس طرح بجلی کے دو تاروں کا آپس میں مل جانا۔ اگر دو تار اس بجلی کے قاعدے سے ملیں یعنی اس کی سنت عادیۃ کے مطابق تو مثبت نتیجہ برآمد ہو اور بلب روشن ہو جائے یا چولہا اور استری گرم ہو جائے لیکن خلاف قاعدہ ملیں تو شارٹ سرکٹ ہو جائے اور دھماکہ ہو جائے۔ الجنۃ میں یہی ہوا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیزی سے دونوں کے جسم دیکھتے دیکھتے اب ظاہری طور پر بھی بڑھ گئے اور ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہو گئے۔ یہی وہ صورت حال ہے جو دنیا میں بھی نظر آتی ہے اور خاص طور پر ایسے جوڑوں میں جن کی شادی عنفوان شباب میں ہو تو بعض اوقات دو چار دنوں میں ہی دونوں کے جسم میں نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

**بدت لهما سوآتهما.** (الاعراف:۲۲)

ترجمہ: اور دونوں کے جسم (مخصوص اعضا) ظاہر ہو گئے۔

اس دنیا میں اس کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں کہ کسی ہارمون کے انجکشن سے اس عمل کو اتنا

تیز کیا جاسکتا ہے کہ چند گھنٹوں میں کسی جسم میں نمایاں فرق آجائے۔ چنانچہ یہی وہ عمل تھا جس کے ہوتے ہی الجنۃ کی ساری سنتوں کی خلاف ورزی ہو گئی۔ اب اس کا نتیجہ ایک سلسلہ کی طرح ظاہر ہونا شروع ہوا۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) شعور جنس جاگ گیا۔ اور مزید مقاربت کی خواہش ہونے لگی اور نتیجتاً مقاربت ہونے لگی۔

(۲) دونوں کے جسموں کے نیچے کی بندش، پنبہ یا پردہ کا خاتمہ ہو گیا لہٰذا کئی نئے اعمال صادر ہونے لگے مثلاً بول، براز، احتلام، حیض وغیرہ

(۳) ایسا لگتا ہے کہ حضرت حوا اس یا ان مقاربت سے حاملہ ہو گئیں اور استنساخ (Cloning) پر بنائی گئی الجنۃ میں ابذار (Insemination) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اب اس کا نتیجہ یہی بر آمد ہوتا کہ وہاں استنساخ سے تولید کی سنت تو تھی لیکن ابذار سے ہونے والی تولید کا نظم کرنا الجنۃ کی سنت کے خلاف تھا اور نتیجتاً وہاں فساد برپا ہوتا۔

اور اس طرح اس ایک عمل نے پورے الجنۃ کے نظم کو درہم برہم کر دیا۔

اب اگرچہ آدم و حوا نے اللہ تعالیٰ سے اس نافرمانی کے لیے توبہ کر لی اور توبہ و استغفار سے گناہ معاف ہو گئے لیکن اس عمل کا جو طبعی نتیجہ بر آمد ہوا وہ دو اعتبار سے آدم و حوا کے لیے تباہ کن ہوا۔

(۱) روحانی اعتبار سے الآدم عالم اشیاء میں پیدا ہونے کے باوجود نیچے گر گیا اور بہیمیت کی سطح پر آگیا جہاں اس کی ضرورتیں بہائم کی طرح ہو گئیں اور بہائم کی طرح ہی پوری کی جاسکتی تھیں۔

(۲) اب آدم و حوا میں جو تبدیلی سنت عارض ہو گئی تھی اس کا نظم کرنے اور اس کی بقیہ زندگی کو اس نئی سنت کے مطابق اس وقت تک آگے لے جانے کی ضرورت آن پڑی جب تک دو میں سے کوئی ایک یا دونوں بات نہ ہو جائے۔

(۱) پہلی بات یہ کہ اب الآدم کو اس کی نئی تبدیل شدہ سنت یعنی عادت بہیمیہ کے مطابق 'الیوم الوقت المعلوم' تک ایک ایسی جگہ فراہم کرنا ضرور تھا جہاں وہ اس سنت کے مطابق جی سکے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس نئی اور تبدیل شدہ سنت کے مطابق قابل رہائش جگہ میں

الیوم الوقت المعلوم تک رہنے کے دوران اگر وہ سابقہ مقام اور منصب کو بحال کر سکے تو اس کو اس کی اجازت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو اس کی بھی اجازت ہے بلکہ مطلوب ہے کہ وہ الشیطان سے اپنی لڑائی جاری رکھے اور اس ہزیمت کے باوجود اگر وہ مقام محمود حاصل کر سکتا ہے تو کرے۔

چنانچہ حالات کی یہ مذکورہ تبدیلی اور سنگینی ہی ہے جو سبب بنی اس حکم کا جس کے نتیجے میں حضرت آدم اور حوا زمین پر بھیج دیئے گئے۔

یہاں دو اور باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) حضرت آدم اور حضرت حوا کے اس عمل کی شرعی حیثیت کیا تھی؟

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا جس الجنۃ میں تھے وہاں کی شرع کے اعتبار سے باہم زوج ہونے کے باوجود ان لوگوں نے خلاف عادت بھی عمل کیا۔ اور خلاف حکم بھی۔ اس لیے وہاں دو مفسدہ پیدا ہوئے۔ پہلا مفسدہ حکم کی خلافت ورزی کرنے کا اور دوسرا مفسدہ تھا الجنۃ میں جاری عادت یا سنت کے خلاف کرنے کا۔ چنانچہ ان دونوں کے تعلق سے حکم ہوا کہ: اترو!

حالات کی یہی وہ زمانی ترتیب ہے جو اس تعارض کو سلجھاتی ہے جو البقرہ کی آیت: ۳۶ اور ۳۸ میں پایا جاتا ہے: کہ جب آدم و حوا سے نافرمانی ہو گئی تو انہیں حکم دیا گیا کہ اتر جاؤ! اور بعد میں جب کہ انہوں نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ قبول بھی ہو گئی تو پھر آیت: ۳۸ کیوں کہتی ہے کہ اترو؟

دراصل بات یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا کے عمل سے دو مفاسد کا صدور ہوا۔ پہلے ان دونوں کے لیے کہا گیا: ــــ اترو۔ چنانچہ اس اترو میں فی الواقع دو حکم مستتر تھے۔ پہلا حکم عتابا تھا اور دوسرا تبدیلیٔ مکان کا جس کا سبب اب الجنۃ کا اس صورتحال کے نظم کرنے سے قاصر رہنا تھا۔ چنانچہ جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے توبہ کر لی اور وہ قبول ہو گئی تو پہلا حکم تو ختم ہو گیا لیکن دوسرا علیٰ حالہٖ باقی رہا۔

(۲) دوسری بات یہ کہ ان آیات میں دونوں بار جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا اور کہا گیا: اهبطوا اور پھر کہا گیا: اهبطوا منها جميعاً. تو اس سے کیا مراد ہے؟ اس عاجز کی رائے میں مولانا میرٹھی کا استدلال درست نہیں۔ اس لیے کہ جب الجنۃ میں ولادت ہو ہی جاتی تو پھر نکلنے کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی۔ بعض لوگوں کا یہ قول کہ کبھی کبھی تثنیہ کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال

لیا جاتا ہے بے جا بات ہے۔اس سے زیادہ تو واحد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الجنۃ سے باہر آنے کا اصلی سبب الشجرۃ سے تقارب کا سلسلۂ ردعمل (Chain Reaction) ہے جس کی انتہا وضع حمل ہو سکتی تھی جس کے لیے الجنۃ بالکلیہ (Unaccomodative) ہو گئی تھی۔ خاص طور پر ایک منفرد بات کے تعلق سے۔اور وہ بات یہ ہے کہ جب یہ 'جماع' خلاف سنت عادیہ تھا تو اس حمل اور اس بچہ کا کیا حکم ہو سکتا تھا جو اس کے نتیجے میں حمل میں آیا۔ قرآن کے مطابق جائز عمل سے مگر دیگر کوتاہیوں کے نتیجے میں غیر صالح اولاد کا حمل قرار پا سکتا ہے جو غیر صالح ہو تو ناجائز عمل کے نتیجے میں ایسی اولاد کا حمل قرار پانا زیادہ یقینی ہے۔ لہٰذا اگر ان تمام اسباب کی بنیاد کو لیا جائے تو الجنۃ سے نکلنے کا بنیادی سبب یہی غیر صالح حمل کے سوا اور کچھ نہیں تھا جسے کسی صورت میں بھی الجنۃ اپنے یہاں پیدا ہونے نہیں دے سکتی تھی۔ دراصل یہ حکم ہی اس وقت دیا گیا جب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوا کہ الجنۃ میں اس کے دیئے گئے حکم کی خلاف ورزی کر دی گئی ہے اور الجنۃ میں قائم اور جاری کردہ سنت کو درہم برہم کر دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ حمل قرار پا چکا ہے جسے کسی صورت الجنۃ میں رہائش کی حتی کہ ولادت تک کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ اب اسکی گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ اس سنت کے بجائے دوسری جاری ہونے والی سنت کے بعد آدم وحوا الی الیوم الوقت المعلوم تک الجنۃ میں رہائش پذیر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ الجنۃ میں واپسی کی اب صرف دو صورتیں تھیں:

(۱) اس مدت میں آدم وحوا ایک ایسی جگہ جا کر رہیں جو ان کی اس نئی سنت کو Accomodate کر سکے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس دوران وہ طبعاً نہیں بلکہ حکماً اپنی بحالی کی کوشش بھی کرتے رہیں اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو الی الیوم الوقت المعلوم کے ختم ہوتے ہی انہیں جسماً بھی الجنۃ میں بحال کیا جا سکتا ہے بلکہ اپنے سابقہ سفر میں انہیں آگے ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہی مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا:

"ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔" (البقرہ:۳۶)

ترجمہ: اور تمہارے لیے ہے زمین میں ٹھکانا اور سامان کچھ عرصے تک۔

اس مقام پر ایک دقیق اور نہایت اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا برمحل ہوگا اس لیے کہ

معرکۂ خیر و شر کے بعد کے مرحلوں میں اس نکتے کو ہی دراصل محور کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسی نکتے کے فہم پر دین اللہ کا فہم منحصر ہے۔

واضح ہو کہ ابلیس نے معرکۂ خیر و شر کو غیر معمولی ذہانت (Superintelligence) کا مسئلہ بنادیا۔ اور اس طرح دین اللہ اور زمین پر جاری ہونے والی شریعتیں اور انبیاء کرام نتیجتاً دراصل اسی Superintelligence کے ربانی مظاہر ہو کر سامنے آئے۔

اس عاجز نے "ماکان ومایکون" میں لکھا تھا:

> "ایسا لگتا ہے کہ ابلیس نے فرشتوں کے اعتراض اور اس اعتراض کے رفع کیے جانے کی پوری کارروائی دیکھی تھی اس لیے اس نے اپنے اعتراض کو درست ثابت کرنے کے لیے آدم پر اسی حربے کا استعمال کیا جو اب تک آدم کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ بات اللہ رب العزت کے علم میں تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس سے باخبر فرمایا۔ پہلے مرحلے میں جب ابلیس نے آدم پر اسی حربے کا استعمال کیا جو اب تک آدم کے لیے باعث افتخار رہا تھا تو اس بار معترض کی حکمت عملی کے سمجھنے میں آدم سے چوک ہو گئی۔" (ماکان ومایکون: ادراک کائنات: آغاز معرکہ، صفحہ: ۱۷)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملک کے مقابلے میں حضرت آدم نے اپنی برتری اپنی عقل کا استعمال کر کے ثابت کی۔ جیسا کہ علم ہے کہ ملک متعین تفویض اور تفویض کے تعلق سے متعین معلومات کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا آدم نے اپنی عقل کے استعمال سے غیر متعین کو معلوم کی شکل میں لا کر اپنی برتری ثابت کر دی۔

لیکن ابلیس ملک نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ ملائکہ کے گروہ کا ایک فرد تھا۔ لیکن اپنی طبع کے لحاظ سے ملک نہیں بلکہ بنی نار ـــــ الجن تھا جس میں ملک کے مقابلے میں عقل (Intelligence) کا زیادہ اختیار پایا جاتا ہے۔

ابلیس سے دھتکارے جانے اور اجازت دیے جانے کے بعد آدم پر حملے کی حکمت عملی بڑی گہرائی سے اور ممکن ہے سالہا سال کے غور و فکر، مطالعہ تجزیہ، تحقیق اور تفتیش کے بعد وضع کی ہو۔ اس نے کتنی باریک بینی سے حملے کا منصوبہ بنایا اس کا اندازہ اس پورے معرکے پر غور کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے سے ہو سکتا ہے جو الجنۃ میں ہوا۔ ابلیس کی حکمت عملی کے ابھرے ہوئے نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس نے اپنے تمام منصوبے کی بنیاد ہی اس بات کو قرار دیا کہ آدم عقل کے اعتبار سے فائق نہیں اور اس طرح عقل بجائے خود فوقیت کا مدار نہیں بن سکتی۔

(۲) آدم عقل رکھتا ہے لیکن وہ اس کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا۔

(۳) آدم اپنی عقل کا استعمال کر سکتا ہے لیکن وہ اس اعتبار سے کمزور اور ناقص ہے کہ اس کا غلط استعمال نہ کرے یا استعمال کر کے غلط نتیجے تک نہ پہنچے۔

اور ظاہر ہے کہ جب یہ سب باتیں اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ فائق اور لائق خلافتِ کبریٰ کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بات عین ممکن ہے کہ ابلیس نے اس منصوبہ بندی کو ترتیب دینے میں بہت سے امور کا تجزیہ کیا ہو:

(۱) آدم نے ملائکہ کے سامنے کس طرح یعنی کس منہج اور طریقے کا استعمال کر کے اپنی عقل کا استعمال کیا تھا؟ اس منہج اور طریقے کو ممکن ہے اس نے Slow Speed Projection کر کے آدم کے طریقۂ فکر پر غور کیا ہو۔

(۲) آدم الجنۃ میں کسی بھی پیش آمدہ مسئلے پر کیسے رد عمل (React) کا اظہار کرتا ہے؟

(۳) اللہ تعالیٰ نے اس کو جو احکامات دیئے ہیں اس میں اس کے مطابق آدم کے ساتھ کیا رعایت (Grace) اور جانبداری (Favour) کی گئی ہے اور اس رعایت اور جانبداری کے پیچھے آدم کی کون سی خصوصیت یا کمزوری چھپی ہوئی ہے؟

(۴) اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ اسے ان میں سے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سراغ ضرور ملے لیکن جو سراغ سب سے زیادہ اہم ملا وہ الجنۃ میں حوا کی پیدائش کے بعد ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے مخصوص رد عمل (Reaction) تھا۔ یعنی ان دونوں میں یگانگت اور انس کا پایا جانا اور بظاہر یکساں ہونا۔ ان کے بظاہر یکساں ہونے اور پھر باہم مونس ہونے نے اسے اس مقام پر پہنچایا کہ یہ بظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں نہیں۔ لیکن اس معرفت سے زیادہ جس بات نے اسے Break through سے ہمکنار کر دیا وہ یہ بات تھی کہ آدم و حوا اندرونی طور پر الگ الگ ہونے کے باوجود باہم اس راز سے بے خبر ہیں۔ اور اس طرح وہ اس راز سے واقف نہیں کہ ان میں باہم یگانگت اور انس کیوں پایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں سے ابلیس نے یہ جانا کہ آدم و حوا کی

عقل کامل نہیں بلکہ ناقص (Flawed) ہے۔اب اس کا چاہے جو سبب ہو لیکن ابلیس نے یہ ضرور معلوم کرلیا کہ جس چیز کو آدم کے لیے طرۂ امتیاز بتایا جاتا ہے وہ کامل نہیں بلکہ ناقص (Flawed) ہے۔

اس طرح ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اس کا دھیان آدم اور حوا کو دیئے گئے اللہ کے احکام کی طرف گیا جس کے تعلق سے اسے پہلے ہی شک تھا کہ اس میں آدم کے ساتھ رعایت اور جانبداری کی گئی ہوگی۔ لیکن اب اس نے اس رعایت اور جانبداری کی کنہ کی تلاش کی۔اس نے پایا کہ احکام کے دو جز ہیں۔

(۱) پہلا جزء معروف کا ہے۔یعنی :

وکلا منها رغداً حیث شئتما.

ترجمہ: اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو۔

——— اور

(۲) دوسرا جزء منہیات کا ہے: یعنی :

ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين.

ترجمہ: اور پاس مت کرنا اس الشجرۃ کو ورنہ تم ہو جاؤ گے ظالموں میں سے۔

اس نے تجزیئے سے یہ بات معلوم کرلی کہ یہ احکام اور بطور خاص منہیات دراصل آدم و حوا کی کسی کمزوری کو ڈھانپنے اور انہیں اس سے بچانے کی تدبیر ہے۔اور اس طرح ابلیس اس نتیجے پر پہنچا کہ آدم اپنی عقل کے اعتبار سے فائق ہو تو ہو لیکن خود اس عقل کے استعمال کے اعتبار سے ناقص ہے اور یہ کہ اس کی عقل کو تو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا لیکن اس کی عقل کا غلط استعمال کروایا جاسکتا ہے اور پھر اس غلط استعمال کو بطور حربہ اسی کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔اور یہی نتیجہ بنیاد بنا ابلیس کے آدم و حوا کے خلاف پہلی کارروائی کی۔

چنانچہ ابلیس نے آدم و حوا کے خلاف جو سازش کی اور جس میں اس نے ملک کا یا کسی بھی دیگر مخلوق کا سہارا لیا ——— اس منصوبہ و سازش کی اساس میں دراصل 'عقل کے استعمال' کی آزمائش میں ان دونوں کو مبتلا کرنا تھا۔

چنانچہ اس نے اس منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک متعدد السطوح (Multi-Layer)

سازش تیار کی جس میں درج ذیل باتیں مقصود تھیں:

(۱) آدم وحوا کی عقل کو عنداللہ ناقص ثابت کرنا ــــ

(۲) آدم حوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ اپنی ذات کے اندر مستور اپنی الگ الگ حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔

(۳) آدم وحوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ دوست اور دشمن میں فرق کر سکے۔

(۴) آدم وحوا پر واضح کرنا کہ ان کی عقل اس قابل نہیں کہ اپنے بھلے یا برے میں فرق کر سکے۔

(۵) آدم وحوا کو الجنۃ کے نظام میں فساد ڈالنے پر اکسانا تاکہ ان کو وہاں سے باہر نکالا جا سکے۔

(۶) آدم وحوا کو الجنۃ سے باہر نکال کر اور نیچے گرا کر مقام خلافت کے لائق ہی باقی نہ رہنے دینا۔

اس منصوبے کی اصلی غایتوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے جو ظاہری غایتیں مقرر کرائیں وہ تھیں:

(الف) (۱) آدم وحوا کے سامنے Multiple Questions رکھ کر اسے کنفیوژ کرنا۔

(۲) آدم وحوا کے سامنے Misinformation کو رکھ کر اسے کنفیوژ کرنا۔

(۳) آدم وحوا کو اس کے مقام، مقصد، نصب العین کے تعلق سے کنفیوژ کرنا۔

(ب) (۱) اس ظاہری منصوبے کی جانب آدم وحوا کی توجہ کو مرکوز رکھنے اور اسے غیر محدود فضا میں کسی حقیقت کا فیصلہ کرنے سے ہٹانے اور اس کے سامنے Conditioned فضا کو مستحکم کرنے کے لیے محدود Input-Output Matrix کا رکھنا اور اسے اس کا پابند کرنا کہ وہ اسی Input-output Matrix میں محدود رہ کر ہی غور کرے جسے ابلیس نے اس کے لیے فراہم کیا ہے۔ اور اس سے تجاوز نہ کرے۔

قرآن کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اپنی ان تمام باتوں کے لیے آدم وحوا کے سامنے اس نے متعدد Projections، Displays اور Activities کی ہوں گی تاکہ اس

کا نقطۂ نظر آدم و حوا پر واضح ہو جائے۔

اور ایسا لگتا ہے کہ آدم و حوا اس دوران عقل کے استعمال میں غفلت کے سبب ناکام ہو گئے۔

غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل جس مقام پر ابلیس نے آدم کو اس کی بنیادی قوت عقل کے تعلق سے منحرف (Detract) کیا وہ وہی مقام ہے جسے 'ماکان ومایکون' میں "انفاقی سائنس سے اکتشافی سائنس" کی طرف لے جانا کہا گیا ہے۔

چنانچہ اس عاجز نے لکھا ہے:

"حیات الجنۃ میں آدم و حوا کو انفاق کا حکم ہوا تھا۔ یعنی علم الاسماء کا استعمال انفاق کے لیے۔ علم الاسماء کا جائز، صالح اور نافع استعمال آدم و حوا کے لیے اگر ہو سکتا تھا تو صرف اور صرف انفاق تھا۔ ابلیس نے انہیں اس جانب مائل کیا کہ وہ علم الاسماء کا استعمال انفاق کے بجائے، اکتشاف کے لیے کریں۔ چنانچہ جب آدم و حوا نے اس علم کا استعمال انفاق کے بجائے اکتشاف کے لیے کیا تو اسی ابلیس نے اس اکتشاف کا استعمال آدم حوا کو تباہ و برباد کرنے، اس کی فضیلت کو چھین لینے اور اس پر اعتراض کو درست ثابت کرنے کے لیے کیا۔" (ماکان ومایکون: ادراک کائنات: کامیابیٔ ابلیس: صفحہ: ۲۱)

چنانچہ اس پوری ابلیسی کارروائی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

**فوسوس لهما الشيطٰن ليبدى لهما ماورى عنهما من سوأتهما وقال ما نهكما ربكما عن هذه الشجرة الا ان تكونا ملكين او تكونا من الخٰلدين. وقاسمهما انى لكما لمن النصحين . فدلهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواتهما وطفقا يخصفٰن عليهما من ورق الجنة**

(الاعراف: ۲۰۔۲۲)

ترجمہ: پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ ظاہر کرے ان پر وہ چیز کہ ان سے پوشیدہ تھی ان کے بدن سے۔ اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس الشجرۃ سے مگر اس لیے کہ کبھی تم ہو جاؤ ملک یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے۔ اور اس نے ان کے لیے پوری تفصیل اور اندازے پیش کیے تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ یہ خیر خواہ ہے۔ پھر غلط ثبوت پر ثبوت دیئے اور نظائر پر نظائر پیش کیے۔ پھر جب ان دونوں نے چکھ لیا الشجرۃ کو تو ان کے بدن (کے مخصوص اعضاء) ظاہر ہو گئے ان کے سامنے اور وہ اس ابھرے ہوئے بدن کو لگے جنت کے پتوں سے چھپانے۔"

غور کیا جائے کہ ابلیس نے پوری منصوبہ بندی نہایت دقت نظر سے کی تھی۔ اور اس کا پورا عمل دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ آدم کی فوقیت عقل کے تعلق سے درست نہیں اور یہ کہ آدم عقل کا حامل تو ہے لیکن عقل کے درست استعمال پر ضابطہ یا مضبوط نہیں۔ دین اللہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسانی عقل کو Optimally درجہ کمال پر بھی پہنچاتا ہے اور اسے مضبوط (Regulated) بھی رکھتا ہے اس کے برخلاف موجودہ سائنس دراصل ابلیس کے اسی حربے کی ارضی قسم ہے جس کا استعمال اس نے آدم وحوا پر الجنۃ میں کیا تھا جس میں عقل کے استعمال کو Maximise کرنے کے اس طریقے پر اکسایا گیا تھا جو غیر مضبوط (Unregulated) ہو اور جس کا بنیادی مقصد انفاق سے اکتشاف کی طرف لے جانا ہو۔

اس طرح معرکۂ خیر و شر کا یہ دوسرا مرحلہ ابلیس کی کلی کامیابی اور آدم کی کھلی ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن آدم نے اس مرحلے میں ایک ایسا عمل کیا جس نے آدم کی کھلی ناکامی کی بہت حد تک بلکہ کہا جائے تو نوے فیصد تک تلافی کر دی اور آدم وحوا کا وہ عمل تھا گناہ کے بعد ان کا متنبہ ہونا اور رجوع الی اللہ کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا کی اس عاجزی اور بندگی کو نہ صرف یہ کہ قبول فرمالیا بلکہ اس کی تحسین کی اور انہیں انعامات سے نوازا۔ اور وہ انعام تھا روئے ارض پر آدم وحوا کو بے یار و مددگار اپنے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے انہیں اپنے سے مربوط رکھنے اور اپنی ہدایات سے نوازنے کا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تسلیم، تحسین اور انعاماً فرمایا:

**فاما یاتینکم من ھدیٰ فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔** (البقرہ: ۳۸)

ترجمہ: پس جب تم لوگوں کے پاس پہنچے میری طرف سے ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے اوپر نہ خوف ہے اور نہ وہ ملول ہوں گے۔

اور آئندہ پھر ایسی غلطی کرنے سے اس طرح ڈرایا:

**والذین کفروا وکذبوا بایٰتنا اولئك اصحٰب النار ھم فیھا خالدون۔** (البقرہ:۳۹)

ترجمہ: اور جو لوگ نافرمانی کریں گے اور جھٹلائیں گے ہماری آیتوں کو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ بات ایسی ہی تھی گویا کوئی کہے:

"اس بار تو ہم نے چھوڑ دیا ہے یا کم سزا دی ہے لیکن اگر آئندہ غلطی ہو گی تو
سخت سزا دوں گا۔ پھر رہنا ہمیشہ عذاب میں۔"

اس طرح معرکۂ خیر و شر کا دوسرا مرحلہ ختم ہوا جس میں الشیطان بہر حال کامیاب ہوا۔ اور آدم و حوا سخت تباہ کن حالات سے دو چار ہوئے۔

# مرحلۂ سوم: آدم و حوا بر زمین

معرکۂ خیر و شر کا تیسرا مرحلہ وہ ہے جب حضرت آدم اور حضرت حوا زمین پر بھیج دیئے گئے اور اس خطۂ ارض پر آدمی کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معرکۂ خیر و شر کے اس تیسرے مرحلے کی شروعات ایک انقلاب سے ہوئی جو آدم و حوا کی زندگی میں آیا اور جس نے ان کی نسل کی پوری زندگی پر حتیٰ کہ نفس معرکۂ خیر و شر پر دور رس اثرات مرتب کیے۔

اس میں پہلی بات تھی آدم و حوا کی الجنۃ کے محفوظ و مامون ماحول سے زمین میں معرکے کے کھلے میدان اور کھلی دھوپ میں آنا۔ گویا الجنۃ میں آدم و حوا ہر طرح کے طبعی اور روحانی ـــــ روایتی، جوہری، کیمیاوی، الیکٹرونی، حیاتیاتی اسلحوں کی زد سے محفوظ گویا ایسے زیر زمین بنکروں میں تھے جہاں ان ہتھیاروں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی آواز کی ذرا سی دھمک بھی نہ پہنچتی تھی۔ اب وہ اس سے محروم ہو گئے اور الشیطان کی پارٹی کے سامنے جو ان تمام ہتھیاروں سے لیس تھی اپنے آپ کو کھلے میدان میں پایا۔

دوسری بات جو غیر معمولی ہوئی وہ یہ تھی کہ اب ان کی حیات میں اکل و شرب، نشست و برخاست، توالد و تناسل کی وہ سنت عادیہ جاری ہو گئی جو بہیمیت سے مشابہ تھی۔ اور اس کا الجنۃ کے نظام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

معرکۂ خیر و شر کا تیسرا مرحلہ زمین پر معرکۂ خیر و شر کے آخری مرحلے کا پہلا مرحلہ تھا۔ چونکہ یہ پہلا مرحلہ تین ادوار پر مشتمل ہے اس لیے ان کا الگ الگ ذکر کیا جانا زیادہ مناسب ہو گا۔

## پہلا دور : آدم کے دو بیٹوں کا دور

یہ وہی دور ہے جس کا قرآن نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

واتل علیھم نبا ابنی آدم بالحق ۔ (المائدہ :۲۷)

ترجمہ: اور (اے رسول!) سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا۔

یہ دور دو حصوں پر مشتمل ہے:

# پہلا حصہ: ولادت قابیل: 12000 قبل مسیح

قابیل ایک غیر صالح حمل تھا جو اللہ کی مرضیات کے خلاف آدم و حوا کے اختلاط سے وجود میں آیا۔ زمین پر آدم و حوا کا بھیجا جانا دراصل جہاں اس سبب سے تھا کہ اس حمل کو الجنۃ اپنے یہاں ولادت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی یعنی الجنۃ کسی ایسی ولادت کو Accomodate نہیں کر سکتی تھی وہیں اس سبب سے بھی تھا کہ اس غیر صالح حمل کو اس زمین پر ڈالنا (Dump) مقصود تھا۔ زمین اس کے لیے (Dumping Ground) کے حکم میں تھی۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ آدم کی تخلیق سے قبل اس زمین پر جنوں نے اس طرح کے بلکہ اس سے بھی بڑے بڑے فساد کر کے زمین کا ناس کیا تھا۔ چنانچہ عنداللہ زمین پر آدم و حوا کا بھیجا جانا پہلے مرحلے میں اس حمل کو جو الجنۃ میں قرار پا چکا تھا زمین پر Dump کرنا تھا۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ الشیطان نے یہاں سے اپنے تیسرے معرکے کی حکمت عملی کا آغاز کیا۔ اسے اس حمل سے جو الجنۃ میں قرار پایا تھا دوسری بڑی عظیم الشان کامیابی ملنے کی امید تھی۔ یعنی ان دو تائب لوگوں آدم و حوا کی نسل سے یعنی نسل ـــــ آدمی سے جس سے اس کی لڑائی تھی اور اب بھلا ایک ایسے دشمن کے گھر میں ـــــ ایک ایسے فرد کی پیدائش ہونے جا رہی تھی جو عنداللہ غیر صالح تھا اور اس طرح یہ اولاد الشیطان کے لیے آئندہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے زیادہ آسان نشانہ (Soft Target) ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کے تعلق سے پوری حکمت عملی (Strategy) تیار کر لی۔

یہاں ایک دقیق بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ ذات جو الجنۃ میں وہاں جاری معتاد سنت کی خلاف ورزی کر کے وجود کی حالت میں آئی اور پھر زمین پر آ کر جس کی ولادت ہوئی وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کیا تھی:

(۱) آدم و حوا کی جنتی عادی اولاد

(۲) آدم و حوا کی جنت میں حمل میں آنے والی مگر زمین پر پیدا ہونے والی اولاد

(۳) آدم و حوا کی جنت میں حمل میں آنے والی مگر زمین پر پیدا ہونے والی غیر آدمی یا نیم آدمی اولاد۔

قرآن اور دیگر صحائف آسمانی کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ حمل اور اس

سے پیدا ہونے والا بچہ آدم وحوا کا بیٹا تو مانا گیا مگر ان کی جنتی عادی بیٹے کی حیثیت سے یا آدم وحوا کی جنت میں حمل میں آنے والے مگر زمین پر پیدا ہونے والے آدمی بیٹے کی حیثیت سے اسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے بجائے اسے ایک ایسا بیٹا مانا گیا جو بیٹا ہوتے ہوئے بھی جنت میں حمل میں آنے والا مگر زمین پر پیدا ہونے والا غیر آدمی یا نیم آدمی تھا چنانچہ یہی سبب ہے کہ قرآن اسے آدم وحوا کی ترتیب کے اعتبار سے پہلی مگر حقیقت کے اعتبار سے اور اس روئے زمین پر اجراء سنت کے مطابق پہلی اولاد نہیں مانتا۔

اس کا اندازہ اس بحث سے ہوتا ہے جو علماء یہود کے یہاں گزشتہ چار ہزار سالوں سے اور علماء نصاریٰ کے یہاں تقریباً انیس سو سالوں سے آدم کی دوسری اولاد کے نام کے معنی کے تعلق سے چلی آرہی ہے۔

ہابیل کے تعلق سے بیشتر علماء یہود کا خیال ہے کہ اس نام کا مفہوم ہے:

(۱) خالی = اس لیے کہ ہابیل نحیف وکمزور اور چھوٹے قد وقامت کا تھا۔

(۲) بے حیثیت، بے وزن، بے مصرف = اس لیے کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے ہاتھوں بڑی بے چارگی سے مارا گیا اور اس کا نام ونشان مٹ گیا۔ اور بڑا بھائی اس پر غالب آگیا۔

علماء نصاریٰ اور بطور خاص عہد جدید کے اکابر علماء نصاریٰ کا خیال ہے کہ نہیں ـــــ ہابیل کا مفہوم نہ تو خالی ہے، اور نہ ہی بے حیثیت، بے وزن اور بے مصرف ـــــ بلکہ اس کا اصل مفہوم ہے:

(۱) سانس = یعنی وہ زمین پر سانس لینے والے نظام کے ساتھ پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔

(۲) بھاپ یا بخار = یعنی اس کی تخلیق بھاپ یا بخارات سے ہوئی تھی یا وہ بھاپ یا بخارات کی طرح ہلکا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ علماء یہود اور علماء نصاریٰ کے یہ سارے خیالات دراصل اندازے ہیں جو غلط ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ان میں جزوی حقیقت پائی جاتی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک ہابیل کا حقیقی مفہوم ہے ـــــ پہلا ـــــ جسے موجودہ عربی میں اوّل کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اور ان کی ہدایت کے مطابق حضرت آدم وحوا نے حضرت ہابیل کو نسل آدم میں اس روئے زمین پر نئی جاری شدہ سنت کے مطابق پیدا ہونے والی جائز پہلی اولاد مانا ہے۔ (اس کی تقریر کے لیے علمی اور بطور خاص لسانی بحث کی یہاں گنجائش نہیں لہٰذا اسے حذف کیا جاتا ہے)

اس سے دو بات سامنے آتی ہے:

پہلی بات یہ کہ ولادت کی ترتیب کے اعتبار سے تو ہابیل آدم وحوا کے یہاں ہونے والی دوسری ولادت تھے لیکن زمین پر پہلی آدم اولاد۔

دوسری بات یہ کہ ھابیل سے پہلے وضع حمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ قابیل ولادت کے اعتبار سے پہلا ضرور تھا اور اس اعتبار سے وہ بیٹا تو مانا گیا لیکن نہ تو وہ زمین کی سنت عادیہ کے مطابق پیدا ہونے والا بیٹا تھا نہ جنت کی سنت عادیہ کے مطابق لہٰذا وہ نہ جنتی مخلوق آدمی تھا نہ ارضی مخلوق آدمی۔ لہٰذا وہ اپنی صفات، قوت، طاقت، ساخت، مزاج ہر اعتبار سے غیر آدمی یا کم از کم نیم آدمی تھا اور اگر گہرائی سے غور کیا جائے تو دراصل قابیل ابلیس کے مکر (Machination) کے تحت اللہ کی سنتوں میں فساد ڈال کر پیدا کیا جانے والا پہلا آدم نما مخلوق تھا جو اپنی طینت یا سرشت میں ابلیس سے مشابہ تھا۔ اس میں آدمی کے صفات بھی تھے اس لیے کہ متلفی حمل اور حاملہ دونوں آدمی تھے، اس میں مَلَکی صفات بھی تھے اس لیے کہ یہ حمل الجنۃ میں قرار پایا تھا اور ناری صفات بھی تھے اس لیے کہ سب کچھ ابلیس کے (Machination) کے نتیجے میں ہوا تھا۔ (اس سے زیادہ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں)

چنانچہ قابیل کے پیدا ہونے سے قبل ہی الشیطان نے پوری حکمت عملی تیار کر لی تھی کہ اس بچہ کے تولد ہوتے ہی وہ کس طریقہ کار سے خیر کا خاتمہ کروادے گا۔

ابلیس کو پہلی ضرب اس وقت لگی جب وہ بچہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق خود اس کے ماں باپ نے اسے پہلی اولاد ماننے سے انکار کر دیا۔ اس تعلق سے دو باتیں کہی جاتی ہیں جو اس عاجز کے نزدیک سراسر افسانہ ہیں اور اس کی کوئی اصل نہیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ قابیل اور ہابیل جڑواں تھے۔ عام طور پر یہ بات یہودیت کہتی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اس وقت ولادت کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ جاری فرمایا تھا کہ آدم وحوا کے ہر بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی تھی۔ ہم اس وقت جس عہد کی بات کر رہے ہیں اس وقت یہ سنت جاری نہیں ہوئی تھی۔ اس سنت کا اجراء بعد میں ہوا۔

حضرت آدم اور حضرت حوا نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ابلیس کے سوچے سمجھے منصوبے اور حکمت عملی کو اس مرحلے میں اس طرح خاک میں ملادیا کہ انہوں نے قابیل کو اپنی جائز

اولاد نہیں مانا بلکہ ایک ایسی ولادت مانا جوان کی غلطیوں کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

ابلیس کا منشا یہ تھا کہ وہ قابیل جیسے آسان شکار (Soft Target) کے ذریعہ اور خود آدم و حوا کی ایک آدمی نما اولاد کے ذریعہ پوری نسل انسانی میں فساد برپا کرادے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی قوت سازش کرے اور کسی بادشاہ کے ولی عہد پر خاموشی سے کام کرے اور اس کے پیش نظر یہ ہو کہ لازماً یہ ولی عہد کل بادشاہ ہو جائے گا تو خود اس وقت کے جائز بادشاہ کے ذریعہ فی الواقع ہم مقتدر ہو جائیں گے۔ لیکن وہ بادشاہ ولی عہد بنانا تو دور کی بات اسے اولاد تو مانے مگر ناجائز۔ اور اس کا اعلان بھی کر دے۔ اور اس طرح سازش کرنے والوں کے سارے منصوبے کو خاک میں ملادے۔ ابلیس کی پوری نسل آدم کے تعلق سے اتنی جامع حکمت عملی پہلی بار سامنے آئی تھی۔ جسے حضرت آدم اور حوا نے ناکام بنادیا اور اس طرح تیسرے مرحلے کے پہلے دور کا پہلا معرکہ ابلیس کی ناکامی پر منتج ہوا۔

## دوسرا حصہ : ھابیل : 12000 قبل مسیح

دوسرے حصے کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر جاری نئی سنت کے مطابق حضرت آدم، حضرت حوا کو پہلی اولاد سے نوازا۔ اور آغاز میں ہی انہیں بتادیا کہ یہی تمہاری پہلی جائز اور میری صرف سے صالح اولاد ہے۔ یہاں صالح کی ایک اور دقیق معنویت جان لینی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر کسی انسان میں مخزون صالحیت کے عناصر اس کے نطفے کے ذریعہ اس کی اولاد میں منتقل ہو ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت آدم اور حضرت حوا نے مقاربت کی تو وہ عناصر قابیل میں منتقل نہیں ہوئے۔ اس تعلق سے اللہ تعالیٰ کی دوسری سنت یہ ہے کہ اگر صالحیت کا ایک سلسلہ کسی سبب سے مفسدہ میں پڑ جائے یا ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے ماقبل کے انتخابی نقطے سے کسی دوسرے سلسلے کے اندر پائے جانے والے صالحیت کے عنصر کو متحرک (Reactivate) کر دیتا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

چنانچہ ابلیس نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک صالح اولاد دے دی ہے اور اس میں الجنۃ میں وہاں کی سنت کے مطابق تناسل کو زمینی تناسلی نظام میں جاری فرمادیا ہے تو یہ اس کی زمین پر دوسری بڑی شکست تھی۔

اب اس نے ایک نئی حکمت عملی وضع کی۔ اس نے قیاس کیا کہ جب ہابیل آدم و حوا کی پہلی جائز اولاد مانا جا رہا ہے۔ تو یقیناً آدم کی نسل اسی سے آگے جائے گی جس میں لازماً پیدا ہونے والے وہ سارے انبیاء اور صلحاء ہوں گے۔ تو اب جب کہ وہ عنصر ہابیل میں منتقل ہو چکا ہے اگر اس کا ہی خاتمہ کر دیا جائے تو یہ سارا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ اور زمین پر صرف وہ اولاد باقی رہ جائے گی جسے ابھی جائز نہیں مانا جا رہا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہابیل کی موجودگی میں اس غیر صالح اولاد قابیل کو وراثت کے لیے قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا اس نے ہابیل کو قابیل کے ذریعہ ہی قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ بہت پیچیدہ، دور رس نتائج کا حامل اور اس روئے زمین کی بقیہ تاریخ معرکۂ خیر و شر پر روشنی ڈالنے والا ہے لیکن ہم طوالت کی مجبوریوں سے اس مرحلے میں اس پر تفصیلی بحث کرنے سے قاصر ہیں۔

واضح ہو کہ ہابیل کی ولادت زمینی سنت کے مطابق پہلی ولادت تھی اس لیے ہابیل پہلی زمینی جائز اولاد تھے لیکن اس وقت تک زمین پر صرف زمینی سنت جاری ہوئی تھی اور ابھی تک مکمل انسانی سنت کا اجراء نہیں ہوا تھا۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ اس لیے حضرت ہابیل جنتی سنت کے بعد جاری ہونے والی زمینی سنت کی پہلی اور جائز سعید اولاد تھے۔ لیکن یہ دور خود ایک عبوری دور تھا جو بالآخر انسانی سنت میں بدل گیا۔ زمینی سنت کا زمانہ اس طرح ولادت اولاد کا زمانہ نہ تھا جیسا کہ آج ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینی سنت جنتی سنت سے قریب تر بلکہ اس کی مبدل (Converted) شکل تھی جس میں صرف ایک اولاد ہوتی اور طویل ترین عمر پاتی۔

ممکن ہے اس قتل کے پیچھے ابلیس کی ایک اور چال ہو۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی تدبیر کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چند کہ آدم و حوا کو الجنۃ سے باہر کر دیا ہے اور اب ان پر زمینی سنت جاری فرما دی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آدم و حوا کے توبہ سے بے حد خوش اور مطمئن ہے اور ان دونوں پر ایک ایسا انعام کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعہ آدم و حوا نہ صرف یہ کہ اپنی حالت بحال کر لیں یعنی الجنۃ کی حالت پر لوٹ جائیں بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ چور دروازہ بھی بند ہو جائے جس کے ذریعہ ابلیس نے آدم و حوا کو الجنۃ میں گمراہ کروایا تھا۔ واضح ہو کہ دوسرے مرحلے میں ابلیس کی حکمت عملی کی بنیاد تھی:

آدم و حوا کی ساخت کی خاص ہیئت ـــــ اور اس کا بنیادی سبب تھا مرحلۂ اوّل کے ایک

آدم یا آدم قدیم کا جو ایک میں دو (Two -in-one) تھا ایک جمع ایک (one+one) ہو جانا۔

لہٰذا اگر اس زمین پر انہیں نہ صرف تبدیل (Convert) کر دیا جائے جواب ان کی ضرورت ہے بلکہ اس تبدیلی کے عمل کو رجعت (Reversion) میں بدل دیا جائے ـــــ یعنی دوبارہ آدم و حوا کو جنت کی حالت میں لانے کے بجائے الجنۃ کی پہلی حالت میں جہاں صرف آدم تھا لا دیا جائے۔ یعنی اس ایک جمع ایک کو revert کر کے آدم و حوا کو ایک کر دیا جائے۔ اس لیے کہ Two -in-one آدم پر ابلیس کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے ابلیس نے ہابیل کی پیدائش اور طویل عرصے تک کسی اور اولاد کے نہ ہونے سے اللہ کے ارادوں کے تعلق سے یہی مطلب لیا ہو۔ اور اس نے نتیجہ نکالا ہو کہ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہابیل ایک جمع ایک (One Plus One) سے ایک میں دو (Two-in-one) ہو چکا ہے اور کسی صورت سے اس کا خاتمہ کر دیا جائے تو ھابیل کا خاتمہ قصۂ آدم کا خاتمہ بن جائے گا۔ ایسا سمجھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ابلیس نے دیکھا کہ آدم کو الجنۃ سے لا کر باضابطہ طور پر زمین کے نظام کے مطابق آباد کرنے کے بجائے عبوری نظام میں رکھا گیا ہے۔ جیسے نقل مکانی کر کے آنے والے پناہ گزینوں کو اس زمین کے دیگر باشندوں سے الگ۔ کیمپوں میں رکھا جاتا ہے اس لیے کہ خطرہ ختم ہونے کے بعد انہیں پھر اپنے ملکوں میں بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ ابلیس روئے زمین اور زمین کی سنتوں سے واقف تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس وقت آدم و حوا کی اس اولاد ہابیل میں جاری سنت اس سے مختلف تھی۔ لہٰذا ابلیس کو اور بھی یقین ہو گیا کہ ضرور اللہ Reversion کا ارادہ رکھتا ہے۔

قابیل و ہابیل کی لڑائی اور اس کے لیے بہن پر جھگڑا یہ سب افسانے ہیں۔ یہ معرکۂ حق و باطل تھا بلکہ وہ عظیم معرکۂ خیر و شر جہاں خلافت کی کائناتی لڑائی (Cosmic War) چل رہی تھی اور زمین و آسمان تہہ و بالا ہو رہے تھے۔

چنانچہ یہ لڑائی اس بات پر تھی کہ ہابیل نسل آدم اور خلافت آدم اور اس سے آگے جا کر خلافت اللہ کا مستحق ہے یا قابیل۔ اور حضرت آدم و حوا نے اللہ کی مرضیات کے مطابق ہابیل کا انتخاب کر کے اور قابیل کے دعوے کو از سر نو رد کر کے دراصل اللہ کے اس حکم کو قائم فرما دیا تھا کہ آدم خلیفۃ اللہ ہے اور ہابیل ان کا وارث۔ قرآن نے اس پورے واقعے کو اس طرح پیش فرمایا ہے:

"اذ قربا قرباناً فتقبل من احدهما ولم يتقبل من الآخر قال لاقتلنك قال انما يتقبل الله من المتقين۔" (المائدہ : ۲۷)

ترجمہ: اور جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نامقبول ہوئی دوسرے سے کہا میں تجھ کو قتل کردوں گا وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے۔

یہاں مذکور تین آیتیں اتنی گہرائی اور معنویت سے لبریز ہیں کہ اگر ان کی یہ عاجز تفصیل بیان کرے تو اس میں بیان کردہ تمام پہلوؤں کا سرسری احاطہ کرنے میں بھی سینکڑوں صفحات صرف ہو جائیں۔ تاہم اس معرکے کی کچھ گہری باتیں ان شاءاللہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے موقع پر آئیں گی۔

یہ معرکہ دو افراد یعنی ہابیل و قابیل کے درمیان نہ تھا۔ نہ ہی یہ معرکہ صرف دو لوگوں کے درمیان تھا۔ یہ ایک کائناتی معرکہ (Cosmic Struggle) تھا جس میں خیر کی ساری فوج ـــــ بشمول ملائکہ حضرت حوا اور حضرت ہابیل ـــــ حضرت آدم کی قیادت میں فوج قاہرہ سے ٹکرائی تھی جس کی قیادت ابلیس کر رہا تھا اور جس میں کائنات کے شیاطین مک، شیاطین جن اور قابیل شامل تھے۔

خیر و شر کا یہ معرکہ خیر کے لیے بڑی تباہی کا باعث ہوا اور اس کا نتیجہ المناک ہوا اور حق کا قافلہ ایک عدیم المثال اور خوفناک بحران کا شکار ہو گیا۔ وہ بحران تھا قابیل کے ذریعہ زمین پر پہلی زمینی آدمی اولاد ہابیل کی شہادت۔ حق کی راہ میں روئے ارض پر یہ پہلا جہاد تھا اور یہ پہلی شہادت تھی۔ اور حضرت ہابیل کی شہادت کے بعد قافلۂ حق ایک بحران کا شکار ہو گیا۔ روئے ارض پر نسل آدم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس طرح معرکۂ خیر و شر کے مرحلۂ سوم کے پہلے دور کے دوسرے حصے کا اختتام حق کے لیے ایک بحرانی کیفیت سے دوچار ہونے کے ساتھ ہوا۔

## دوسرا دور : حضرت شیث علیہ السلام : 11500 قبل مسیح

ابھی ہم نے دیکھا کہ مرحلۂ سوم کے پہلے دور کا دوسرا حصہ حق کے لیے سنگین بحران پر ختم ہوا۔ غالباً یہ وہی صورت حال تھی جب اللہ تعالیٰ نے اہل حق کی مدد فرمائی۔ اور اس نصرت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حق اور الآدم کے دونوں نمائندے یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا بحمد اللہ زندہ اور سلامت تھے۔ اور صورت حال یہ تھی کہ حق کے خلاف الشیطان کو ایک بہترین آلۂ کار ایسا مل گیا تھا جو اگرچہ کہ نیم آدمی، نیم ملک اور نیم جن تھا لیکن جس کی پیدائش میں سوئے اتفاق خود آدم و حوا کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ یہ بحران متعدد الوجوہ ہو کر پیچیدہ تر ہو گیا تھا۔

ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت میں تبدیلی فرمادی۔ سنت کی یہ تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کسی درجے میں ابلیس کا یہ اندازہ درست تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت ہابیل کی شکل میں حضرت آدم اور حضرت حوا کو دوبارہ جمع کر کے الجنۃ میں آدم قدیم کی حالت میں لا رہا تھا یا لانے والا ہے۔ یعنی حضرت آدم اور حوا کے اس بیٹے ھابیل میں وہ صفت عظمیٰ موجود ہوں گے کہ وہ آدم قدیم کی حیثیت کو بحال کر دے۔ ممکن ہے ابتداء پیدائش سے ہی حضرت ہابیل میں ان صفات عظمیٰ کے جوہر نظر آنے لگے ہوں۔ لہٰذا ہابیل کو شہید کر کے ابلیس نے آدم کی الجنۃ میں بحالی کی راہ ایک طویل مدت تک کے لیے بند کر دی۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو فیصلے فرمائے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ہابیل کا بدل پیدا کرنا۔

(۲) اس عبوری زمینی سنت کے بجائے مکمل زمینی سنت کا اجراء کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوا کو ایک اور اولاد دی۔ جن کا نام حضرت شیث تھا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ حضرت شیث کے نام کے تعلق سے علماء یہود اور علماء نصاریٰ میں کئی اقوال رائج ہیں۔

جدید علماء نصاریٰ کا کہنا ہے کہ حضرت شیث کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط جسم اور جنگجو پیدا فرمایا اس لیے ان کا نام شیث رکھا گیا جو "شاوونی" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں جنگجو۔

علماء یہود کا خیال ہے کہ چونکہ حضرت شیث حضرت ہابیل کی موت کے بعد پیدا کیے گئے اس

لیے وہ دراصل اللہ کی طرف سے ان کے 'مثل' تھے۔ جو لفظ "شیث" ہی سے مشتق ہے۔ اس عاجز کی رائے یہاں علماء یہود سے ملتی جلتی ہے۔ بلاشبہ حضرت شیث حضرت ہابیل کے مثنی تھے۔ اور اس کا تعلق دراصل اللہ کی اس سنت سے ہے جس کا ذکر قرآن اور احادیث میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔

(۱) اس سنت کا سب سے واضح ذکر سورۃ الانسان آیت:۲۸ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

**نحن خلقناهم وشددنا اسرهم واذا شئنا بدلنا امثالهم تبديلا۔**

(الانسان ۲۸)

ترجمہ: ہم نے ان کو بنایا اور باندھے ان کے جوڑ بند اور جب ہم چاہیں بدل لائیں ان جیسے لوگ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا دوسرا واضح تذکرہ سورۃ الکہف میں ملتا ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

**واما الغلام فكان ابواه مومنين فخشينا ان يرهقهما طغيانا وكفرا فاردنا ان يبدلهما ربهما خيراً منه زكوٰة واقرب رحما۔**

(الکہف : ۸۰۔۸۱)

ترجمہ: اور جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز کر دے زبردستی اور کفر کر کے۔ پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے ان کو ان کا رب بہتر اس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حضرت حوا کو حضرت شیث جیسا بدل فراہم کر دیا۔ لیکن اس عاجز کے نزدیک شیث کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو ابھی بیان کردہ دوسرے مفہوم میں اضافہ ہوگا۔ یعنی شیث، کے ایک معنی ـــــ دو ـــــ بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی حضرت شیث حضرات آدم و حوا کی دوسری اور حضرت ہابیل کے بعد پہلی اولاد ہیں۔ یہی بات علماء نصاریٰ کے دو گروہوں کے مابین بھی ایک اہم وجہ اختلاف ہے۔ یعنی یہوائی شجرۃ (Yahwist Genealogy) کے مطابق حضرت شیث (پیدائش:4:25) کے مطابق حضرت آدم و حضرت حوا کی تیسری اولاد ہیں جو حضرت ہابیل کی موت کے بعد قابیل کے مقابل میں پیدا کی گئی۔ دوسری طرف عبادی شجرہ (Priestly Genealogy) کے مطابق (پیدائش 5:3) حضرت شیث حضرت آدم و حوا کی پہلی اولاد ہیں۔

یہ تینوں باتیں ایک ہی نتیجہ بر آمد کرتی ہیں:

(۱) حضرت شیث حضرت ہابل کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے۔

(۲) وہ حضرت آدم اور حضرت ہابل کے مثل تھے۔

(۳) وہ ترتیب کے اعتبار سے تیسری، جائز کے اعتبار سے دوسری، اور زندہ رہنے والی اور حضرت آدم کی قیادت کرنے والی پہلی اولاد تھی۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس سنت کا اجراء دراصل حضرت آدم اور حضرت حوا کو اس بحرانی کیفیت سے نکالنے کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے ایک رحم تھا جو آدم و حوا کی بقا کے لیے ناگزیر ہو چکا تھا چنانچہ جہاں ایک طرف رحم کا معاملہ کیا گیا تو دوسری جانب اس زائد رحم کے بجائے آزمائش کی صورت کی سنگینی میں اضافہ کر دیا گیا۔ یعنی ایک رعایت (Grace) تو دی گئی مگر اس کے بجائے درجے میں مزید کمی کر دی گئی۔ اور وہ کمی یہ کر دی گئی کہ جنتی سنت کے بعد عبوری زمینی سنت اور اب اس کے بعد مستقل إلى يوم الوقت المعلوم تک رہنے کے لیے باضابطہ زمینی سنت کا اجراء کر دیا گیا۔ چنانچہ اس رحم سے حضرت آدم و حوا حق کی جدوجہد اور بحالی کی کوشش جاری رکھنے میں کامیاب تو ہوئے مگر اب بحالی کا سفر مزید طویل اور سخت ہو گیا۔ اب مستقل زمینی سنت، کے اجراء اور عبوری زمینی سنت کے خاتمے سے جنت کی فوری واپسی اور بحالی کی صورت مؤخر ہو گئی اور اب گویا یہ طے پا گیا کہ نسل آدم کو قیامت تک اس زمین پر ہی زندگی بسر کرتے ہوئے اس کی کوشش کرنا ہو گی۔

## تیسرا دور : حضرت انس علیہ السلام: 11000 قبل مسیح

توراۃ کی سورۃ براشیت کے باب 4 سطر 26 اور باب 5 سطر 6 کے مطابق حضرت شیث کی پہلی اولاد حضرت انس تھے جسے توراۃ میں اِنش کہا گیا ہے۔ چونکہ حضرت شیث کے بعد حضرت آدم اور حوا کی کئی اولادیں ہوئیں جن میں ازدواجی رشتوں کا آغاز ہوا اور یہی وہ دور تھا جب ایک بطن کے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں دوسرے بطن کے لڑکے لڑکیوں سے ہونا شروع ہوئیں۔ لیکن ابھی بھی روئے زمین پر نسل آدم عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ یعنی شیث اور شیث کی طرح حضرت آدم و حوا کی دیگر اولاد دراصل ان ماں باپ کی اولاد تھے جو خود یا تو جنتی تھے یا جنت میں

بسائے جانے سے، پہلے کی تخلیق۔اس طرح یہ لوگ اگرچہ آدمی تھے مگر زمینی ہونے کے اعتبار سے آدھے تھے اور ابھی تک پوری طرح زمینی نہیں ہوئے تھے۔

حضرت اِنس اس اعتبار سے پہلے انسان ہوئے جن کے والد اور والدہ دونوں زمین کی پیداوار تھے۔اور یہیں سے اس انسان کا آغاز ہوا جو اس وقت زمین پر آباد ہے۔

بہت ممکن ہے سورۂ الدھر ـــــ کی جسے سورۂ انسان بھی کہا جاتا ہے ـــــ ابتدائی آیتیں اسی دور کے آغاز کی طرف اشارہ کر رہی ہوں یعنی:

(۱) وہ دور جب نسل آدم و حوا پوری طرح زمینی انسان بن گئی۔

(۲) وہ دور جب اس نسل آدم و حوا میں نطفۂ امشاج سے تخلیق کا باضابطہ آغاز ہونا شروع ہو گیا۔ ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ حضرت آدم و حوا میں یہ نظام دوسری حالت میں جاری ہو۔

(۳) وہ دور جب نسل آدم و حوا میں باضابطہ رسالت و نبوت کا آغاز ہوا۔ ممکن ہے کہ حضرت آدم کی وفات کے بعد حضرت شیث پہلے مبعوث نبی ہوں یا پھر حضرت انس ہی پر پہلی بعثت ہوئی ہو۔

(۴) وہ دور جب نسل آدم و حوا میں باضابطہ توحید، رسالت، قیامت، بعث بعد الموت، یوم الحساب، اور آخرت کا باضابطہ عقیدہ سمجھایا گیا ہو۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

> "کیا انسان پر ایک وقت زمانے میں ایسا بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا اور ہم اسے پلٹتے رہے پھر کر دیا ہم نے اس کو سننے والا، دیکھنے والا۔ ہم نے اس کو بھلائی راہ یا حق مانتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ ہم نے تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے زنجیروں اور طوق اور آگ دہکتی۔ البتہ نیک لوگ پئیں گے پیالہ جس کی ملونی ہے کافور ایک چشمہ ہے جس سے پئیں گے بندے اللہ کے۔ اور جہاں چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لیں گے یہ لوگ ہوں گے جو نذر پوری کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہو گی۔"
> (الدھر ۱۔۷)

توراۃ میں مذکور عمروں کا اگر ذکر کیا جائے تو حضرت آدم تا حضرت انس اپنی اپنی عمر کے اعتبار سے اس طرح ہوں گے:

| | |
|---|---|
| (۱) حضرت آدم | 930 سال |
| (۲) حضرت شیث | 912 سال |
| (۳) حضرت انس | 905 سال |

ایسا لگتا ہے کہ معرکہ خیر و شر کے تیسرے مرحلے کا تیسرا دور انقلاب آفریں ہوا۔ اب اس نے روئے زمین پر معرکہ خیر و شر کی باضابطہ صف آرائی کر دی جو ہمہ جہت اور رفتہ رفتہ متعدد الابعاد (Multi-dimensional) ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع الاطراف ہو جانے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اصلی ابلیس تھا جس کی جانب سے نئے اور متعدد الابعاد حکمت عملی کا جو ہمہ دم، وسیع الاطراف ہوتی جا رہی تھی آغاز ہو رہا تھا۔ جس نے ایک طرف انسان پر ہمہ جہت ابلیسی حملے کی شکل اختیار کر لی تھی لہٰذا انتیجتاً دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء اور رسولوں کی بعثت کا سلسلہ شروع ہو گیا تو تیسری طرف روئے ارض پر ہر جگہ اور ہمہ دم معرکہ خیر و شر کے شعلے بھڑکنا شروع ہو گئے۔

# مرحلہ چہارم : ابلیس کا مافوق البشری دیو ہیکل حیوانی قوتوں کے ذریعہ حملہ اور ارضی جنگ
## حضرت ادریس علیہ السلام : 8000 قبل مسیح

روئے زمین پر معرکۂ خیر و شر کا مرحلۂ چہارم بے حد انقلابی، ہولناک اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ یہ مرحلہ کب شروع ہوا اس تعلق سے کئی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) مرحلۂ چہارم کا آغاز حضرت انس کے انتقال کے بعد یا ان کی زندگی کے آخری حصے میں ہو گیا۔

(۲) اگر یہ مرحلہ اس وقت نہیں شروع ہوا تو کم از کم حضرت انس کے انتقال کے ڈیڑھ ہزار سالوں کے بعد تو لازمی طور پر شروع ہو گیا۔

اس مرحلے کی خاص بات یہ ہے کہ غالباً حضرت انس کی پیدائش اور زمین پر مکمل انسانی نظام کے اجراء سے الشیطان نے کئی نتائج اخذ کیے جو اپنی جگہ سبب بنے اس کی حکمت عملی کی تبدیلی اور معرکۂ خیر و شر کے ایک نئے رخ کے اختیار کرنے کے۔ ان اسباب کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) حضرت انس کی پیدائش، زمین پر مکمل انسان کی تخلیق، دین اللہ کا باضابطہ نظم، اس کے تشریعی پہلوؤں کا آغاز، رسالت کا آغاز اور انسانی معاشرے میں عبادات اور معاملات کی باضابطہ تشکیل نے حضرت ادریس کی قیادت میں پوری نسل انسانی کو قابیل کی نسل کے علاوہ باضابطہ طور پر ایک نظم اور نظام کا حصہ بنادیا۔ جس نے ابلیس کے لیے انسانوں کو گمراہ کرنے کا کام مشکل بنادیا۔ اسی سبب نے ابلیس کو مجبور کیا کہ وہ انسان پر اپنی فتح کے لیے اپنے طریقہ کار اور دائرۂ کار میں بنیادی تبدیلی کرے۔

(۲) زمین پر باضابطہ نظام کی تشکیل میں اسے امید کی ایک نئی کرن نظر آئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس نے کم از کم اس میں کامیابی ضرور حاصل کرلی ہے کہ انسان زمین پر ہی قیامت تک رہے گا۔ وہ خطرہ جو حضرت ہابیل کی پیدائش اور ان میں ایک۔ میں۔ دو کے اجراء سے

پیدا ہوا تھا اور آدم کے دوبارہ الجنۃ کی واپسی عنقریب نظر آنے لگی تھی اس کا خطرہ اب ہمیشہ کے لیے یا کم از کم قیامت تک کے لیے ٹل گیا۔ لہٰذا اب یہ نسبتاً آسان ہو گیا کہ انسان کے خلاف ایسی حکمت عملی کا آغاز ہو جو اسے روئے ارض پر ہی طبعی اور روحانی طور پر ختم کر کے معرکۂ خیر و شر سے ہمیشہ کے لیے اسے باہر (Knock out) کر دے۔

لیکن یہ کام اب آسان نہ تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت جو انبیاء بھیجے اور انہیں جو شریعت دی۔ اس کا الشیطان نے بغور مطالعہ کیا اور انسان کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی کا اندازہ قائم کیا۔ چنانچہ اس پر تدبر اور تفحص کے بعد اس نے ایک ایسی ہولناک حکمت عملی تیار کر لی جس کا مقصد تھا انسان کا کلی خاتمہ۔ اس حکمت عملی کے دو جزء تھے:

(۱) فساد عقیدہ اور

(۲) فساد طبع

چونکہ یہ مرحلہ بے حد انقلابی، ہولناک اور دور رس نتائج کا حامل تھا اس لیے اس کی اور بعد کے ادوار میں پیش آنے والے واقعات کی پوری تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی امور کے تعلق سے کچھ توضیحات سامنے آجائیں۔

## توضیحات

### (۱) حضرت ادریس علیہ السلام :

قرآن میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر بڑے اولی العزم انبیاء کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ آپ کون تھے؟ اس عاجز کی تحقیق کے مطابق ادریس کسی اولوالعزم نبی کا نام نہیں بلکہ لقب تھا۔ جو اس قدر متداول ہو گیا کہ وہ نام کا بدل بن گیا۔ چنانچہ اس تعلق سے کہ 'ادریس' جن اولی العزم نبی کا نام یا لقب تھا وہ کون تھے کئی باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) آپ حضرت شیث کی وہی اولاد تھے جنہیں مرحلۂ سوم کے تیسرے حصے میں حضرت اِنس کہا گیا ہے۔ یعنی آپ حضرت انس بن شیث بن آدم تھے۔ یہ وہی انس ہیں جنہیں توراۃ اِنُوش (Enosh) کہتی ہے۔ اور قرآن میں انہیں کا نام سورۂ ص آیت:۴۸ میں الیسع آیا ہے۔ یہ الیسع وہ نہیں جن کا ذکر الانعام آیت ۸۶ میں آیا ہے۔

(۲) آپ حضرت شیث کے بیٹے انس نہ تھے بلکہ ان کے پڑپوتے کے پوتے تھے۔ یعنی آپ حضرت انس بن یرد بن مہالالیل بن کینان بن انس بن شیث بن آدم تھے۔ یہ وہی انس ہیں جنہیں توراۃ حنوخ (Enoch) کہتی ہے اور جیسا کہ ماقبل عرض کیا گیا کہ انہیں کا نام قرآن نے الیسع اور لقب ادریس رکھا ہے۔

قرآن نے ایک ہی بات بیان کرنے کے لیے ایک جگہ انہیں الیسع اور دوسری جگہ ادریس کہا ہے:

(۱) واسمٰعیل وادریس وذالکفل کل من الصابرین۔ (الانبیاء : ۸۵)

ترجمہ: اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل سبھی صابروں میں سے تھے۔

(۲) واذکر اسمٰعیل والیسع وذالکفل وکل من الاخیار۔ (ص:۴۸)

ترجمہ: اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل اور تمام ان لوگوں کا جو اخیار میں سے تھے۔

اس عاجز کا رجحان اسی جانب ہے کہ حضرت ادریس ہی حضرت الیسع (سورہ ص:۴۸) تھے اور وہ دراصل حضرت انس بن یرد بن مہالالیل بن کینان بن انس بن شیث بن آدم ہی تھے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت الیسع کو قرآن نے ادریس کیوں کہا؟

زمین پر معرکۂ خیر و شر میں ابلیس نے جب نئے طریقہ کار، حکمت عملی اور ہتھیاروں کا استعمال کرنا شروع کر دیا (جس کا کسی قدر تفصیلی ذکر توضیحات کے بعد آرہا ہے) تو اللہ تعالیٰ نے اہل حق کی نصرت فرمائی۔ اور ایک نئی قسم کی نصرت کا دروازہ وا کر دیا۔ ممکن ہے اس کے لیے حضرت انس بن شیث یا حضرت یرد یا حضرت مہالالیل یا حضرت کینان نے کوئی خصوصی مدد مانگی ہو۔ اور وہ قبول ہو گئی۔ یہ نصرت وہ ہے جسے قرآن کے 'کفل' کہا ہے۔ (ان شاء اللہ اس کی تشریح توضیحات کے ذیل میں آرہی ہے۔) اور اسی 'کفل' کی نصرت کا ظہور تھا کہ حضرت الیسع ادریس بنا دیئے گئے۔

چنانچہ نصرت کفل کا نتیجہ تھا کہ حضرت الیسع کی آدمیت یا انسیت پر ملکوتیت کا غلبہ ہو گیا اور آپ انس ہوتے ہوئے ملائکہ بنا دیئے گئے۔ چونکہ آپ کا ملائکہ بنا دیا جانا معرکۂ خیر و شر کی ایک خاص مصلحت اور مجبوری کے سبب تھا اس لیے آپ اہل ارض کو چھوڑ کر السماء میں چلے گئے اور اس

صورت میں اہل ارض کے مخصوص اہل حق سے آپ کا رابطہ بحال رہا۔

اس صورت میں ادریس کے لقب دیئے جانے کے دو وجوہات ہو سکتے ہیں:

(۱) لفظ ادریس دراصل درس سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب ہے پرندوں کی طرح اڑنا اور منڈلانا جو ملائکۃ کی ایک صفت ہے جیسے حافین حول العرش۔ چنانچہ اسی نصرت کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ نے ملائکۃ بنادیا اور آپ ملائکۃ کی طرح ارض و سماء میں اڑا کرتے تھے۔

(۲) لفظ ادریس جیسا کہ عرض کیا گیا کہ درس سے مشتق ہے اور اس کا دوسرا مطلب ہے پوچھنا، تحقیق کرنا، جاننا اور پوچھنے، تحقیق اور تفحص کرنے کے ذریعہ حقیقت حال جاننا۔ چنانچہ جس مصلحت کے تحت حضرت الیسع کو ملائکۃ میں شامل کر لیا گیا تھا اس کے پس منظر میں دو ضرورتیں ہو سکتی تھیں۔ ملک اور ملک ملائکۃ کو اللہ کی نافرمانی اور ابلیس کے اتباع سے روکنا اور بنی آدم میں کوشاں اہل حق کی خصوصی نصرت کرنا اور ان نصرتوں میں ایک نصرت تھی ارض پر ہونے والے واقعات جن کے متعلق فیصلوں کی اطلاع اہل سماء کو پہلے ہو جاتی ہے ارضی اہل حق کے پوچھنے پر یا از خود انہیں بتا دینا۔

اس عاجز کی رائے میں یہ دونوں ہی مطالب بیک وقت حضرت الیسع پر پورے پورے چسپاں ہوتے ہیں اس لیے ادریس کا مفہوم ہوا ـــــ الیسع الادریس۔ چنانچہ حضرت الیسع جواب ملائکۃ کی طرح رہتے تھے اور لوگوں کو خیر و شر کے تعلق سے واقع ہونے والی باتوں سے ان کے وقوع پذیر ہونے سے، قبل پوچھنے پر یا از خود آگاہ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ یوں تو دونوں جگہ جہاں قرآن میں ادریس اور الیسع آیا ہے اللہ تعالیٰ نے نصرت کفل کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً :

(۱) واسمٰعیل وادریس وذالکفل (انبیاء : ۸۵)

ترجمہ: اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل

(۲) واذکر اسمٰعیل والیسع وذاالکفل (ص:۴۸)

ترجمہ: اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا

لیکن جہاں صرف لفظ ادریس آیا ہے وہاں ایک اور بات کا ذکر کیا گیا ہے:

واذکرفی الکتاب ادریس انه کان صدیقاً نبیا ورفعناه مکانا علیا۔ (مریم :۵۷)

ترجمہ: اور ذکر کرو ادریس کی کتاب کے بارے میں بے شک وہ صدیق نبی تھا

اور ہم نے اس کو بلند کر دیا مکان کے اعتبار سے اور اونچائی کے اعتبار سے۔

یہاں رفعت، مکان اور علو قطعاً قطعاً معنوی نہیں بلکہ حسی ہیں بلکہ طبعی ہیں اور جسمانی ہیں۔ اور اس میں ذرہ برابر بھی استبعاد نہیں۔

## (۲) فساد عظیم :

ابھی ذکر کیا گیا کہ اپنی نئی حکمت عملی کے تحت ابلیس نے روئے ارض پر ایک فساد عظیم برپا کر دیا۔

معرکۂ خیر و شر کے چوتھے مرحلے میں شروع کیا گیا ابلیس کا فساد دو نکتوں پر قائم تھا۔ پہلا نکتہ تھا فساد عقیدہ اور دوسرا نکتہ تھا فساد طبع۔

### فساد عقیدہ :

یہ وہ پہلا موقع ہے جب ابلیس نے آدم کے خلاف حکمت عملی میں تبدیلی یہ پیدا کر دی کہ اب جب کہ ابناء آدم کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی اس نے عقیدہ کا فساد پیدا کیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب الشیطان نے انسانیت کو شرک سے آگاہ کیا۔ اب تک ابلیس کے طریقہ کار سے نہ تو الجنۃ میں اور نہ ہی الارض پر شرک کا کوئی شائبہ پایا جاتا تھا۔ لیکن اب اس نے شرک کی ترویج کی۔ غالباً اس کے دو اسباب ہوں گے۔ زمین پر شریعت کی توضیح سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی تاکید بندوں کو اپنی ذات کے گرد مرتکز اور اپنے سے وابستہ رکھنا ہے۔ لہٰذا اس نے اللہ مخالف مرکز کی تشکیل کی اور توحید کا ایک مرئی مخالف مرکز ترتیب دیا جو شرک تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک ابتداءً شرک فی الصفات سے ہوتے ہوئے شرک فی الذات تک وسیع ہوا۔ بت خواہ وہ پتھر کے گول ٹکڑے ہوں یا درخت اس شرک کی ابتداء ہیں جو بعد میں باضابطہ بت تراشی اور بت پرستی میں بدل گئے۔

یہ وہی فساد ہے جو مرحلۂ چہارم کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلا ہوا ملتا ہے۔ اور اسی کریہہ ترین دور کا خاتمہ (ڈراپ سین) حضرت نوح کی حجت پوری ہونے کے ساتھ ہوا جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**قال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم یزده ماله وولده الا**

**خسارا ومکروا مکرا کبارا وقالوا لا تذرن الھتکم ولا تذرن ودا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق ونسرا۔** (نوح:۲۱۔۲۳)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کہنا مانا اور ماننا ایسوں کا جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔ اور دا ؤ کیا بڑا دا ؤ اور بولے ہر گز مت چھوڑو اپنے آلہیوں کو اور نہ چھوڑو دود کو اور سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو۔

لیکن اس کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

چنانچہ اس مرحلۂ چہارم میں ابلیس نے پوری روئے زمین میں آدم کی اولاد جہاں جہاں پھیل گئی تھی وہاں پہنچ کر وہ اور اس کے آلہ کاروں نے شرک کی ترویج کی اور پوری روئے زمین کو شرک سے بھر دیا۔ یہ وہ فساد عقیدہ تھا جو اس مرحلہ میں ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ ابلیس نے وضع کیا اور اس کو بھرپور توسیع دی۔

## فساد طبع :

دوسرا فساد پہلے فساد سے کسی صورت کم بڑا اور وحشت ناک نہ تھا۔ اور یہ فساد تھا نسل آدم کی حقیقت اور اس کی ساخت کو تباہ و برباد کر دینے کا۔ چونکہ اب ابلیس کو اطمینان تھا کہ زمین پر انسان کو قیامت تک رہنا ہے اس لیے اس نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کے مقاصد درج ذیل تھے۔

(۱) آدم کی نسل کو زمین پر فنا کر دینا۔

(۲) آدم کی نسل کو طبعی طور پر فاسد کر کے اسے معرکۂ خیر و شر میں خیر کے نمائندہ کی حیثیت سے ختم کر دینا۔

(۳) آدم کی نسل کو طبعی طور پر فاسد کر کے اس کو معرکۂ خیر و شر میں ابلیس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے، جو دراصل نسل انسانی کی ہی خلافت کے خلاف ہے انسان کو آلہ کار کے بطور استعمال کرنا۔

(۴) زمین پر ایک ایسی مفلوج کرنے والی بیماری کو نسل آدم میں پھیلا دینا جس سے خود بخود اس کے اندر خیر کے تعلق سے صلاحیت اور آمادگی ختم ہو جائے۔

چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لیے ابلیس نے نسل انسانی میں دو کام رائج کیے۔

(۱) زنابین المخلوقات

(۲) زنابین الانسان

ان دونوں میں پہلا بے حد وحشت ناک تھا۔ اس کے لیے ابلیس نے شاید روئے زمین پر آدم وحوا کی آمد کے بعد پہلی بار تمام ملک شیاطین اور جن شیاطین کو انسانوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ آدم کے خلاف ابلیس کی کائناتی لڑائی کی یہ پہلی کائناتی توسیع تھی۔ جب اس نے اپنی اور آدم کے درمیان لڑائی کو دو سطحوں تک وسیع کر دیا:

(۱) اس توسیع کا پہلا حصہ تھا معرکہ آرا فریقین میں سے ابلیس کی فوج میں اضافہ اور آدم کے خلاف پہلی بار اتنے بڑے پیمانے پر ملک اور جنوں کا استعمال۔

(۲) اس توسیع کا دوسرا حصہ تھا معرکہ آرائی کے میدان کی توسیع چنانچہ اب یہ لڑائی فرش زمین، بحر زمین اور فضاء زمین سے آگے بڑھ کر سماء ارض اور اس سے بھی آگے چلی گئی۔

ان دو توسیعات کا ایک تیسرا نتیجہ بھی بر آمد ہوا اور وہ تھا اللہ اور نسل آدم کے درمیان واقع نوافذ اور معالعہ کے ذرائع پر شیطان کا قبضہ یا ان میں رکاوٹ پیدا کرنا۔

## (الف) زنابین المخلوقات :

زنابین المخلوقات دراصل ابلیس کا وہ حملہ تھا جو معصوم انسانیت پر ابلیس کی فوجوں نے کر دیا جس میں ملک شیاطین اور جن شیاطین ابلیس کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ وہ بطور خاص آدمی خواتین پر حملہ آور ہوئے اور ان سے زبردستی یا انہیں قابو میں کر کے یا ان سے روابط بڑھا کر ان کے ساتھ طبعی ازدواجی تعلقات پیدا کیے اور اس اختلاط اور زنا کا نتیجہ ہوا زمین پر بین المخلوقاتی نیم انسانی، نیم ملکی، یا نیم جناتی خلاف طبعی حرام نسل کی پیدائش کا آغاز۔ اور کچھ اپنی طبعی تقاضوں کے تحت اور کچھ ابلیس کے اشارے پر اس نسل کا بعد میں پوری روئے زمین پر فساد برپا کرنا۔

ابلیس کے پیدا کردہ فساد کی یہ اب تک کی سب سے خطرناک شکل تھی جو روئے ارض پر نمودار ہوئی۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ اس عہد میں ابلیس نے نسل آدم کو تباہ کرنے کا ایک نہایت بڑا (جس کی تفصیل بیان کرنا یہاں بہت دشوار ہے) منصوبہ بنایا جو ایک ایسی خطرناک سازش تھی جو

اپنی شدت اور وسعت میں ہمہ جہت ہی نہیں ہمہ گیر تھی جس کی تلخیص ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) ابلیس نے نسل انسانی کے مابین تباہ کاریوں کے لیے بین المخلوقات Genetic Cross-breedling کا سلسلہ شروع کیا۔

(۲) اس Criss-Cross Genetic Cross-breeding کا ایک پہلو مختلف مخلوقات کے Developed breed پیدا کرنا تھا۔

(۳) اسی طرح اس Genetic Cross breeding کا ایک مقصد انسانی breed یعنی آدم کے نطفۂ وجڑ سے فنا کر دینا تھا۔ تاکہ آدمی کی شکل تو برقرار رہے لیکن نطفۂ آدم کا روئے ارض سے خاتمہ ہو جائے۔ یعنی نام نہاد غیر انسانی انسان (So-called Unhuman human) بنانا اس کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا۔

لیکن اس عظیم سازش میں اس وقت ابلیس سے مربوط بنی آدم کی تعداد برائے نام تھی یعنی بنی آدم بنیادی طور پر گروہ حق سے منسلک تھے اور ابلیس کی فوج دوسری طرف اصلاً چند انسانوں اور بیشتر ملک شیاطین اور جن شیاطین پر مبنی تھی۔ اس لیے اس وقت ملک شیاطین اور جن شیاطین ہی ابلیس کی حمایت میں اس بڑے پیمانے پر عامل اور حملہ آور ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ابلیس نے ان ملک اور جن شیاطین کے ذریعہ بنی آدم پر حملہ کر دیا اور نسلی اور طبعی طور پر اسے تباہ کر دینے کی کوشش کی۔

اور اسی حملے کا ایک نتیجہ روئے زمین پر جباروں، نفلوں اور الہیوں کی پیدائش ہے۔ جن کا ذکر الگ الگ کیا جائے گا۔

اس تعلق سے دو خیال پائے جاتے ہیں۔ پہلا خیال یہ ہے کہ ابلیس کی سازش کے پہلے مرحلے میں جباروں کی پیدائش ہوئی دوسرے مرحلے میں نفلوں کی اور تیسرے مرحلے میں الہوں کی۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ بات مرحلے وار بھی ہو سکتی ہے اور بیک وقت مختلف راہوں پر کی گئی کوشش کا نتیجہ بھی۔ اس عاجز کا احساس ہے کہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ یعنی روئے ارض پر ابلیس کی اس سازش کے نتیجے میں بیک وقت جباروں، نفلوں اور الھوں کی پیدائش کا آغاز ہوا اور پھر ان کے فسادات کا۔

## جبار :

جبار وہ دیو ہیکل مخلوق ہیں جو آدمی عورتوں پر ملک شیاطین اور جن شیاطین کے ذریعہ کیے گئے حملے کے نتیجے میں ان عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس تعلق سے تین باتیں ممکن ہیں:

(۱) یہ جبار شیاطین ملک اور شیاطین جن کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔

(۲) یہ جبار دراصل شیاطین جن اور شیاطین قابیل (نسل قابیل جس کا تفصیلی ذکر ان شاءاللہ بعد میں آئے گا جو نیم آدمی، نیم ملک اور نیم جن تھے) کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔

(۳) یہ جبار ایسے متعدد السطوح اور متسلسل (Multilayer Chain Cross breeding) اختلاط کا نتیجہ تھے جن کا مقصد شیاطین ملک، شیاطین جن اور شیاطین انس میں Genetic تبدیلی کر کے ایک عظیم الجثہ اور عظیم القوۃ نسل تیار کرنا تھا۔

چنانچہ اس اعتبار سے پیدا ہونے والے لوگ جبار کہلائے جو طویل القامت، دیو ہیکل اور غیر معمولی، قوتوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پوری طرح افزودہ جبار کی اونچائی ایک لاکھ پینتیس ہزار انچ = گیارہ ہزار دو سو پچاس فٹ = تین ہزار سات سو پچاس گز تک ہوتی تھی۔ چونکہ یہ عام طور پر صرف صورت انسانی رکھتے تھے ورنہ ان کی بقیہ ہر چیز جنوں یا ملک سے مشابہ تھی اس لیے یہ جبار بالعموم ایسے بد خلق ہوتے تھے جن سے وحشی بھی شرمائیں۔

قرآن میں لفظ جبار کئی مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے۔ مفسرین اور علماء لغت نے قرآن میں بیان ہونے والے لفظ جبار کو ایک ہی لفظ سمجھا۔ لہٰذا اکثر نے تاویل کی راہ اختیار کی جو قطعاً درست نہیں۔ الجبار اور جبار نہ ایک لفظ ہیں نہ ہی کسی ایک مادے سے مشتق۔ اللہ تعالیٰ کا نام الجبار کسی اور مادے سے مشتق ہے اور جبار کسی اور مادے سے مثلاً المائدہ آیت: ۲۲ میں لفظ جبار چنانچہ قرآن میں متعدد جگہوں پر ان جباروں کے صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

(۱) **وبرا بوالديه ولم يكن جبلرا عصيا.** (مریم :۱۴)

ترجمہ: اور نیکی کرنے والا اپنے ماں باپ سے اور نہ تھا جبار نافرمان۔

(۲) **وبرا بوالدتى ولم يجعلنى جبارا شقيا.** (مریم :۳۲)

ترجمہ: اور نیکی کرنے والا اپنی ماں سے اور نہیں بنایا مجھ کو جبار غیر صالح۔

(۳) **ان تريد الا ان تكون جبارا فى الارض.** (القصص:۱۹)

ترجمہ: تیرے ارادے یہی ہیں کہ تو زمین میں جبار ہو جائے۔

یہ فسادی، بدخلق اور شقی ہوا کرتے تھے اور انسانوں کے دشمن تھے۔

قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نوح کا طوفان من جملہ جن خوفناک مصیبتوں کے ازالے کے لیے آیا تھا ان میں یہ جبار بھی ایک تھے۔ اس لیے حضرت نوح کے بعد ان کی صرف تمثیل بیان ہوتی ہے مثلاً:

(۱) **وعصوا رسله واتبعوا امر كل جبار عنيد.** (ہود:۵۹)

ترجمہ: اور نافرمانی کی اپنے رسولوں کی اور چلے حکم پر تمام جبار دشمنوں کے

(۲) **واستفتحوا وخاب كل جبار عنيد.** (ابراہیم :۱۵)

ترجمہ: اور (سرکش) لگے فیصلہ مانگنے سو نامراد ہوئے تمام جبار دشمن۔

ممکن ہے حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان میں چند جباروں کو چھوڑ کر بقیہ پوری جبار نسل کا اللہ تعالیٰ نے خاتمہ کر دیا ہو۔ اور چونکہ حضرت ہود علیہ السلام نوح علیہ السلام کے بعد مبعوث فرمائے گئے اس لیے اس وقت بھی دو چار جبار روئے ارض پر پائے جاتے ہوں گے جن کا ذکر اس طرح قرآن میں کیا گیا۔ ایسا اس لیے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے بہت بعد بھی یعنی حضرت نوح کے طوفان کے تقریباً ۴ ہزار سالوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں بھی کم از کم ایک جبار ضرور یا ایک جبار قوم کے پائے جانے کی بات منقول ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

**قالوا يا موسىٰ ان فيها قوما جبارين.** (المائدہ: ۲۲)

ترجمہ: ان لوگوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس جگہ جبار لوگ رہتے ہیں۔

اسی لیے ایسا لگتا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہ کہنا کہ:

**واذا بطشتم بطشتم جبارين.** (الشعراء : ۱۳۰)

ترجمہ: اور جب تم دبوچتے ہو تو دبوچتے ہو ایسا جیسے جبار۔

تمثیل سے زیادہ حقیقت لگتا ہے۔

## نَفِل :

ابلیس کے انساد کی دوسری ہیبت ناک کڑی روئے ارض پر نفلوں کی پیدائش ہے۔ قرآن اور دیگر صحائف کے مطالعے کے بعد اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ یہ نفل دراصل مَلَك شیاطین اور

آدمی عورتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔ جو قد و قامت میں انسانوں سے بہت بڑے اور قوی ہیکل مگر جباروں سے چھوٹے تھے۔ چونکہ ان میں جنوں کی آمیزش نہیں تھی اس لیے ان کی شکل بیشتر انسانی کمتر ملکی اور صلاحیت و قوت بیشتر ملکی اور کمتر انسانی تھی۔ قرآن نے صراحتاً ان کا صرف ایک بار ذکر کیا ہے اور وہ بھی ایک غیر معمولی صورت حال میں یعنی غزوۂ بدر الکبریٰ کے موقع پر (جس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ عنقریب آئے گی) قرآن نے فرمایا:

**یسئلونك عن الانفال قل الانفال لله والرسول۔** (الانفال :۱)

ترجمہ: (اے رسول) آپ سے (یہ یہودی) لوگ (بصورت طعنہ) سوال کرتے ہیں انفال کے بارے میں! (ہاں) آپ کہہ دیجئے کہ انفال اللہ اور رسول کے لیے (کام کرنے پر مجبور) ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ طوفان نوح جن مصیبتوں کے ازالے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اس نے ان تغلوں کا پوری روئے زمین سے صفایا کر دیا۔ اور اب شاید ان میں کوئی موجود نہیں۔ جہاں تک سورۂ انفال کی اس آیت میں انفال کا تذکرہ ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ایک بہت بڑے طعنے کا جواب دیا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

## اِلیو :

ابلیس کے فساد کی تیسری ذیت ناک کڑی اِلیو ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ الیو ملک شیاطین اور انسانی مردوں کے اختلاط کا نتیجہ تھیں۔ انہیں اِلیو، اِلیجو، الِهَ آلِهَ بھی کہتے ہیں۔ یہ قد و قامت میں خوبصورت، متناسب اور خوش شکل مردوں یا عورتوں سے مشابہ تھیں لیکن صفات میں ملکوں سے زیادہ مشابہت تھی۔

چنانچہ قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

**افاصفکم ربکم بالبنین واتخذوا من الملئکة اناثا انکم لتقولوا قولاً عظیما ولقد صرفنا فی هذا القرآن لیذکروا وما یزیدهم الا نفورا۔ قل لو کان معه الهة کما یقولون اذا لا بتغوا إلی ذی العرش سبیلا۔**
(اسریٰ :۴۰۔۴۲)

ترجمہ: کیا تم کو چن کر دیئے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لیئے کر لیا ملائکہ بیٹیاں۔ تم کہتے ہو بھاری بات اور پھیر پھیر کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں تاکہ وہ

سوچیں اور ان کو زیادہ ہوتا ہے بد کنا۔ اے رسول! کہہ دیجئے اگر ہوتے اس کے ساتھ
آلھہ جیسا کہ دعویٰ کرتے ہیں تو نکالتے صاحب عرش کی طرف (اڑ کر جانے کی) راہ۔

ابلیس نے اپنی ناکامی کے بعد جو باتیں اپنے متبعین میں پھیلا رکھی تھیں اس آیت میں اسی پر ایک طنز سے بھرا ہوا تبصرہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ابلیس کی سازش کی یہ قسم بھی طوفان نوح میں کلیتاً ختم کر دی گئی۔

اس قسم کے فساد کے ذیل میں دو اور قسموں کی مخلوق کا ذکر آتا ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ دونوں قسمیں اصلی نوعی قسمیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی رضا نے بنایا یا وہ نوع ہیں جو ابلیس کے مفسدانہ عمل کے سبب اللہ کی مشیت کے تحت بن گئیں۔ ان میں پہلی قسم ہے:

## نفر:

یہ نفر وہ مخلوق ہے جس کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

(۱) **واذ صرفنا الیك نفراً من الجن یستمعون القرآن فلما حضروہ قالوا انصتوا فلما قضی ولوالی قومھم منذرین.** (الاحقاف:۲۹)

ترجمہ: اور جس وقت پھیر دیئے ہم نے اے رسول آپ کی جانب جن میں سے نفروں کو تو وہ لگے قرآن کو دھیان سے سننے۔ اور جب سب اکٹھے ہو گئے (قرآن سننے کی جگہ) تو بولے دھیان سے سنو (اور سمجھنے کی کوشش کرو)۔ پھر جب (قرآن کا ان کو سنایا جانا) ختم ہو گیا تو وہ لوٹے اپنی قوم کی طرف اور ان کو ڈرایا۔

(۲) **قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآناً عجبا.** (الجن:۱)

ترجمہ: (اے رسول آپ) کہہ دیجئے مجھ کو بتایا گیا کہ سن کر گئے ہیں کتنے ہی نفر جنوں میں سے پھر انہوں نے جا کر (اپنے لوگوں سے) کہا ہم نے سنا ایک قرآن عجیب۔

اس ۶ جز کا رجحان سورۂ الجن آیت:۸ کی وجہ سے یہ ہے کہ یہ نفر ابلیس کے اسی عمل سے پیدا ہونے والی نسلوں میں سے ایک نسل سے تھے۔

## عفریت:

یہ وہ قسم ہے جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**قال عفريت من الجن انا آتيك به قبل ان تقوم من مقامك وانى عليه لقوى امين ۔ (النمل :۳۹)**

ترجمہ: بولا عفریت جن میں سے، میں لائے دیتا ہوں وہ تجھ کو پہلے اس سے کہ تو اٹھے اپنی جگہ سے۔ اور اصلاً تو میں ہی طاقت والا ہوں۔

عفریت کے تعلق سے دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ عفریت ایک مستقل نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ عین ممکن ہے کہ یہ اس فسادی نسل کا ایک فرد ہو جسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تابع فرمان بنادیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے اسے دین اللہ اختیار کرنے اور حق کے ساتھ ہونے کی توفیق ملی ہو۔

## (ب) زنا بين الإنسان :

فساد طبع کے ذیل میں ابلیس کے عظیم ترین فساد میں سے ایک بنیادی فساد یہ بھی ہے۔ زنا بین الانسان ایک اجمالی عنوان ہے۔ یہ ایک بڑے سازشی نظام کا نام ہے جس کے اندر سینکڑوں اقسام کے ذیلی نظام جاری کیے گئے ہیں اور جن کا احاطہ کرنا سر دست ناممکن ہے۔ ابلیس کا فساد پیدا کرنے کا یہ وہ نظام ہے جس کے ذریعہ انسانی جسم میں شقاوت داخل کی جاتی ہے۔ تاکہ بحیثیت مجموعی نطفۂ آدم کی سعادت ختم ہو جائے۔ چنانچہ سارے جہاں کے لوگوں کے نطفے میں سعادت کا خاتمہ ابلیس کے نقطۂ نظر میں دراصل آدم و حوا کا خاتمہ ہے جو بالآخر منتج ہوگا آدم کی ناکامی اور ابلیس کی کامیابی پر۔

اس کے صرف چند خاص بڑے اقسام کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(ا) نطفے کے ذریعہ انسانی سعادت کا ختم کیا جانا:

اس کی بنیادی صورتیں ہیں:

(۱) صالح مرد کا نطفہ غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۲) غیر صالح مرد کا نطفہ صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۳) غیر صالح مرد کا نطفہ غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۴) صالح مرد کا نطفہ صالحہ عورت کے رحم میں ممنوع طریقے سے جانا۔

(۵) شیطان انس (غیر قابلی) کا نطفہ صالحہ یا غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔

(۶) صالح یا غیر صالح مرد کا نطفہ شیطانۃ انس (غیر قابیلی) کے رحم میں جانا۔
(۷) شیطان انس (قابیلی) کا نطفہ صالحہ یا غیر صالحہ عورت کے رحم میں جانا۔
(۸) صالح یا غیر صالح مرد کا نطفہ شیطانۃ انس (قابیلی) کے رحم میں جانا۔

یہ ایک بہت تفصیلی بحث کا موضوع ہے جس کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں لیکن اس کے بعض فروع آئندہ متعدد مواقع پر زیر بحث آئیں گے ان شاء اللہ۔ اس تعلق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ میں المبحث الرابع دیکھی جا سکتی ہے۔

اس فساد کی کمترین شکل یہ ہے کہ کوئی شخص جو صالح یا صالحہ ہی کیوں نہ ہو ذرا غفلت میں پڑ جائے تو شیطان اس پر حملہ آور ہو کر اس کے اندر شقاوت کے فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بہت محتاط آدمی کی ذرا سی غفلت یا کسی مخصوص حالت میں اتفاقاً پڑ جانے سے اسے کسی بھی بیماری کا Infection ہو جاتا ہے۔ اور بعض Infection تو نہایت خطرناک ہوتے ہیں جو نہایت معمولی غفلت سے بھی ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کوئی صالح یا صالحہ اگر شیطان کے تعلق سے ذرا بھی غافل ہو جائے تو اسے شیطان فوراً ضرب لگا دیتا ہے۔ یہ ضرب طویل المدت ضرب کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً کوئی ایسی شقاوت بھی پیدا ہو سکتی ہے جو نسلاً بعد نسل کسی کی سعادت کو متاثر کر دے۔

خیر و شر کی اس کائناتی جنگ کے عظیم قائدین اہل حق یعنی حضرات انبیاء کرام نے یوں تو تمام ہی انسانوں میں سعادت کی ترقی اور شقاوت کے خاتمے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے بطور خاص اس بات پر نظر رکھی ہے اور اس کی پوری پوری حفاظت کی ہے کہ ابلیس اپنی کائناتی سازش کے تحت ان سلسلوں کو متاثر نہ کر سکے جو خیر و شر کی اس جنگ میں مستقبل میں اللہ کی فوج کی قیادت کرنے والے ہیں۔

اس عاجز کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ نصیحت جس کا ذکر مروج الذہب جلد اوّل میں المسعودی نے کیا ہے اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کنعان سے حجاز سفر کرتے ہیں تاکہ حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خیر و عافیت معلوم کریں۔ آپ جب مکہ پہنچتے ہیں تو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل بکریاں لے کر صحرا میں گئے ہوتے ہیں چنانچہ صرف حضرت اسمٰعیل کی زوجہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ آپ انہیں

یہ پیغام دے کر لوٹ آتے ہیں کہ جب اسمٰعیل آئیں تو کہنا کہ ایک ایسا شخص آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ گھر کا دروازہ بدل دو۔ حضرت اسمٰعیل اس پیغام کو سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور انہوں نے اس زوجہ کو فوراً طلاق دے دی۔ چند سالوں کے بعد حضرت ابراہیم اپنے وصال سے تھوڑا قبل پھر حضرت اسمٰعیل سے ملنے مکہ پہنچے۔ اتفاقاً اس بار بھی حضرت اسمٰعیل موجود نہ تھے لیکن ان کی دوسری زوجہ نے بضد ہو کر انہیں اترنے اور تھوڑی دیر ٹھہرنے پر راضی کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب حضرت روانہ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اسمٰعیل آئے تو ان سے کہنا کہ ایک شخص آیا تھا اس نے کہا ہے کہ دروازے کی حفاظت کرو۔ حضرت اسمٰعیل آئے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ حضرت ابراہیم ہی ہو سکتے ہیں اور ان کی تاکید ہے کہ یہ زوجہ بڑی بابرکت ہیں ان کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ یہ حفاظت خود اللہ رب العزت کی طرف سے ان تمام نفوس قدسیہ کی ہمیشہ ہوئی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کو اس معرکے میں کام لینا ہے اور شیطان نے ہمیشہ ایسے نفوس کی سعادت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ آنحضور ﷺ کے والد عبداللہ اور ان کے دادا عبدالمطلب اور ان کے والد ہاشم سب کو تباہ کرنے کی ایسی ہی کوششیں متعدد بار ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے سب کی حفاظت فرمائی۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے:

ثم لم یزل ینتقل من طاهر الی ان ولدته آمنة من عبد الله بن عبد المطلب (رواه الامام ابن الجوزی فی کتاب الوفاء بحواله مرقاة)

اس طرح یہ عاجز ان واقعات کو بھی اسی کائناتی معرکہ کے تعلق سے انتہائی احتیاط کی کارروائی سمجھتا ہے جن میں آنحضور ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر دو حکم لگائے تھے اور حضرت علی نے انہیں احسن طریقے سے پورا فرمایا:

(۱) آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی حیات میں دوسری شادی سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو روک دیا۔

(۲) جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے جو ابوجہل ـــــ عمرو بن ہشام کی بیٹی تھیں شادی کرنا چاہی تو آپ نے اسے بھی روک دیا۔ یہ باب نہایت پیچیدہ ہے۔

یہ عاجز اس واقعہ کو بھی اسی سلسلے کی کڑی سمجھتا ہے جس میں آنحضور ﷺ نے حضرت

رقیہ اور پھر حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وفات پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تعلق سے فرمایا تھا:

**لوکانت لی بنت اخری لزوجتھا ایاہ۔** (بحوالہ مرقاۃ)

ترجمہ: اگر میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں یقیناً اسے بھی اس شخص سے بیاہ دیتا۔

## نصرت الکتل :

حضرات آدم وحوا کے زمین پر تشریف لانے کے بعد یہاں جو معرکۂ خیر وشر کا دور دوبارہ شروع ہوا اس میں ایسے بھی مواقع آئے جب اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق سنت تکوین سے متصادم ہوگئی۔ ایسے لمحات نہ صرف نسل آدم کے لیے بلکہ پوری قوت خیر کے لیے سنگین ترین بحرانی (Critical) لمحات ہوگئے۔ یہ سارے بحرانی لمحات وہ مواقع تھے جب ابلیس نے اپنی طاقت اور مکر کا ایسا استعمال کیا اور اسکی ایسی تدبیریں ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق کی صورت ایسی ہوگئی کہ اگر اس کو جاری رہ جانے کا موقع ملے تو خود اللہ تعالیٰ کی رضا مجروح ہو جائے۔ یہ ابلیس کی وہ عظیم اور عجیب وغریب تدبیر تھی جس میں وہ کئی بار اس طرح کامیاب ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا خود اللہ کی رضا سے ٹکراؤ ہوگیا۔ یہی وہ مواقع ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ سنت جاری فرمائی جس کے تحت ایسے مواقع پر سنت تخلیق پر سنت تکوین کا اجراء ہوگیا۔ تاریخ انسانی میں ایسے مواقع کئی بار آئے مگر اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ یہاں وہ خصوصی قسم زیر بحث ہے جس کا تعلق اس شئے سے ہے جسے عالم اشیاء میں نفس، عالم عصر میں روح اور عالم بریۃ میں نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے مواقع جب ابلیس نے کوئی ایسی صورت بنادی کہ ایک ایسا شخص جس کی حیات کا باقی رہنا اللہ کی رضا ہو لیکن اسے شیطان نے ایسی صورت میں ڈال دیا کہ اب اس پر اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق کا جوں ہی اجراء ہوتا وہ اس کی حیات کو ختم کر دیتا اور عالم امکان میں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہ گئی ہو۔ یہ بات واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی اس دنیا میں رائج سنت تخلیق عام حالات کیا خاص الخاص حالات میں بھی نہیں بدلتی۔ عوام میں جو یہ غلط فہمی رائج ہے کہ ہر شخص جس کو لوگ بزرگ سمجھتے ہیں —— اور ایسے لوگوں کی تعداد کسی ایک وقت میں ایک ملک میں ہزاروں سے متجاوز ہوتی ہے —— کی خواہش پر اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق بدل جاتی ہے —— محض ایک دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے۔ چنانچہ تاریخ انسانی میں ایسے مواقع صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جب اس

کائنات میں اس قسم کا غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت سنت الکفل کہلاتی ہے۔ چونکہ سنت الکفل ایک حاوی اور محیط اصطلاح ہے اس لیے اس حصے کا عنوان نصرت الکفل تجویز کیا گیا ہے۔ اس سنت کے تحت اللہ تعالیٰ نے تین سنتیں جاری فرمائیں۔ ان میں سے ہر ایک سنت کا درجہ غیر معمولی، خاص الخاص اور عدیم النظیر ہے۔ لیکن تینوں سنتوں کے درجات اپنے آپ میں الگ الگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تین سنتیں ہیں:

(۱) ذبح اللہ

(۲) ذوالکفل اور

(۳) ذوالقرنین

ان میں سب سے پہلی سنت یعنی سنت ذبیح اللہ سب سے اعلیٰ وارفع ہے اور شاید تاریخ انسانیت میں نہیں بلکہ تاریخ کائنات خلق میں اس کی صرف ایک ہی مثال ہے۔

دوسری اعلیٰ وارفع سنت لیکن پہلے سے کم درجے کی سنت ذوالقرنین معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت سنت ذبیح اللہ سے کم عدیم النظیر ہے یعنی تاریخ کائنات میں اس کی کم از کم دو مثالیں معلوم ہیں۔

تیسری اعلیٰ وارفع سنت جو دراصل نام اور اپنی صفات کے اعتبار سے سب میں مشترک ہوتے ہوئے اپنی جگہ ایک مستقل سنت ہے۔ وہ سنت ذوالکفل ہے۔ اس سنت کا اجراء تاریخ کائنات میں کم از کم تین بار ہوا۔

## (۱) ذبیح اللہ :

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت کائناتِ خلق کی سنتوں میں سب سے اعلیٰ وارفع سنت ہے۔ اس کا تفصیلی بیان تو ان شاء اللہ اپنے موقع سے ہوگا۔ یہاں اس کا شمار صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ بھی سنت بنیادی طور پر سنت ذوالکفل سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے افہام میں ان شاء اللہ آسانی ہوگی۔

## (۲) ذوالکفل :

جیسا کہ ابتداءً کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا تعلق اس شئے سے ہے جس کا نام عالم اشیاء

میں نفس، عالم نصر میں روح اور عالم بریۃ میں نفس مطمئنہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی عرض کی گئی کہ ابلیس نے اپنی طاقت اور مکر کا کئی بار ایسا استعمال کیا کہ روئے زمین پر اہل حق اور نظام ربانی بحرانی حالت کے شکار ہو گئے۔ چنانچہ اس تدبیر سے اہل حق کو اس حالت میں ڈال دیا گیا کہ یہ گروہ بجائے شیطان سے ٹکرانے کے خود اللہ تعالیٰ کی سنت تخلیق سے متصادم حالت میں آمنے سامنے آگیا۔ اس بحرانی کیفیت میں بے حد انتہائی صورت بحرانی وہ تھی جب حق کسی سبب سے صرف ایک شخص کی ذات کی حد تک سمٹ آیا ہو اور اس کا ختم ہو جانا فی الوقت پورے گروہ حق کا خاتمہ ہو اور ٹھیک اس گھڑی وہ شخص ایسی حالت میں ڈال دیا جائے کہ ایک طرف اللہ کی تخلیقی سنت کا اجراء ہونا لازمی ہو۔ دوسری طرف اس تخلیقی سنت کو نہ تو روکا جا سکتا ہو نہ ہی کسی دوسری تخلیقی سنت سے بدلا جا سکتا ہو۔ نہ اس سے فرار اختیار کیا جا سکتا ہو۔ اور ایسی حالت میں اس کا اندیشہ صد فی صد یقینی ہو جائے کہ اگر اس سنت کا اجراء ہوا تو وہ شخص جو اس وقت اپنے آپ میں حق کا واحد مظہر ہے ختم ہو جائے گا تو یہ وہ بحرانی حالت ہے جب اس سنت کا اجراء ہوتا ہے۔

اس سنت کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا کیا صورتیں ہیں؟

'کفل' کے معنی ہیں دوگنا۔ دوہرا، دوسرا، زیادہ طاقت ور۔ اور ان تمام معانی کا اس سنت پر انطباق ہوتا ہے۔

جب کسی شخص کا مرنا یقینی ہو جائے یعنی اس کے آس پاس جاری سنت تخلیق میں اس کا زندہ رہنا محال ہو اور اس شخص کا مرنا اللہ کی رضا کے خلاف ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی زندگی کو اس سنت کے تحت کبھی دوگنا کر دیتا ہے کبھی دوہرا کر دیتا ہے، کبھی زیادہ طاقت ور کر دیتا ہے اور کبھی دوسرا کر دیتا ہے۔

سنتوں کی تبدیلی پر غور کرنے سے پہلے اللہ کی سنتوں ـــــ کے تعلق سے اس کی اصولی سنت کا سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) فلن تجد لسنت الله تبديلا۔ (فاطر :۴۳)

ترجمہ: سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا۔

(۲) ولن تجد لسنت الله تحويلا۔ (فاطر : ۴۳)

ترجمہ: اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کو نہیں بدلتا۔ اور اگر کوئی چاہے کہ اللہ کے دستور کو بدل دے تو یہ ممکن نہیں۔ لہٰذا ایسے تمام مواقع کی حقیقت جہاں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت بدل دی کچھ اور ہی ہے۔

سخت سے سخت بحران کے واقع ہونے پر بھی اللہ تعالیٰ اپنی سنت کو نہیں بدلتا ـــــ اور اگر ایسا بار بار کرتا تو اللہ کے اتنے انبیاء ـــــ جن میں سے کسی ایک کا خون بھی پوری روئے زمین پر بھاری ہے ـــــ قتل نہ ہوتے ـــــ اور نہ کوئی دوسرا اللہ کی سنت کو بدل سکتا ہے خواہ وہ انبیاء ہوں یا ـــــ فرعون و ہامان و نمرود ـــــ بلکہ ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ دراصل اپنی ارتسالی سنت پر ارتجاعی سنت کو جاری فرما دیتا ہے۔ یعنی کل اس نے تکوین کی توسیع تخلیق سے کی آج وہ تخلیق کی ترجیع تکوین سے کرنے پر قادر ہے۔ لہٰذا ایسے تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ تخلیق کی ترجیع تکوین سے کر دیتا ہے۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں ڈالا تو جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 'قال یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم' اللہ نے کہا: اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی ہو جا کا مطلب یہ ہے کہ وہ آگ بجھ گئی اور ٹھنڈی ہو گئی اور اس نے ابراہیم کو نہیں جلایا اور آپ بچ گئے ـــــ وہ اس کا مطلب درست نہیں سمجھتے۔ اتنی بڑی دہکتی ہوئی آگ نہ بجھائی گئی نہ بجھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس طرح آگ میں ڈالا گیا تھا جیسے آج کسی آدمی کو کسی بڑے اسٹیل مل کے دیو ہیکل فرنس (Furnace) میں ڈال دیا جائے ـــــ لہٰذا جب حضرت ابراہیم کو ڈال دیا گیا تو یہ ہوا کہ آگ اسی طرح دہکتی رہی اور ڈالنے والے ایک ایک فرد کو اس کا یقین ہو گیا کہ حضرت ابراہیم کا نام و نشان مٹ چکا ہو گا اور وہ مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے اس مظہر حق کا بالآخر خاتمہ کر دیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ آگ کی سنت پلٹ گئی۔ یعنی وہ آگ جس کی سنت تخلیق تھی (۱) گرم ہونا اور (۲) طبعی اور کیمیاوی طور پر جلا کر اس شئے کی حقیقت کو یعنی کسی کی شکل، صورت حتیٰ کہ طبعی اور کیمیاوی خواص تک کو ختم کر دینا وہ سنت نہ صرف بدل گئی بلکہ الٹی (Reverse) ہو گئی۔ حکم کے بعد آگ کی سنت ٹھنڈک پہنچانا اور (۲) ختم ہونے والی چیز کو بچانا اور محفوظ ہی رکھنا نہیں بلکہ ارتقاء اور تکمیل کے اعلیٰ ترین مقام ـــــ مقام سلام پر پہنچانا ہو گئی۔

چنانچہ 'کفل' کی سنت کا اجراء دراصل یہ ہے کہ جب عالم اشیاء میں جاری سنت ـــــ نفس کو ختم کرنے کی حالت میں آجائے تو اس نفس پر دوسری سنت کا اجراء کر دیا جانا جو نفس کو اس تخلیقی

سنت کے دائرے سے اوپر کر دے۔ واضح ہو کہ نفس کے تعلق سے کم از کم دو سنتیں عموی طور پر رائج ہیں جن کی تشریح اس سے پہلے کی جا چکی ہے:

(۱) عالم عصر سے عالم اشیاء میں روح کی منتقلی یعنی روح کو نفس قرار پانے کے لیے تناسل خواہ اس کی کوئی شکل ہو ضروری قرار دی گئی ہے۔

(۲) عالم اشیاء سے عالم عصر کی واپسی یقینی ہے اور اس واپسی کا واحد راستہ موت ہے۔ چنانچہ اسی لیے کہا گیا کہ کل نفس ذائقۃ الموت۔ (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) ہر وہ شئے جو عالم عصر سے عالم اشیاء میں آئی ہے وہ واپس جائے گی اور جانے کا صرف ایک راستہ ہے یعنی موت۔

اب اگر ایسی صورت ہو جائے کہ ابلیس کی تدبیروں سے کسی ذات پر جس کی حیات کا باقی رہنا رضا الٰہی ہو۔۔۔ موت کا طاری ہونا یقینی ہو جائے اور اس سے بچنے کی صورت نہ رہ گئی ہو تو اس بحرانی حالت میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کار فرما ہو جاتی ہے جس کے تحت کئی باتیں واقع ہو جاتی ہیں:

(۱) یا تو اس شخص پر ایک ثانیہ کے لیے عالم اشیاء پر موت واقع ہو جاتی ہے لیکن دوسرے ثانیہ وہ عالم عصر میں پہنچ کر پھر عالم اشیاء میں واپس آ جاتا ہے اور اس حالت میں عالم اشیاء میں کام کرتے ہوئے عالم عصر میں ہوتا ہے۔

(۲) یا تو اس شخص پر عالم اشیاء پر موت واقع ہونے کی سنت اس طرح اٹھالی جاتی ہے کہ اسے عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے عالم عصر بلکہ عالم بریہ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے دراصل عالم بریہ میں ہوتا ہے۔

(۳) یا تو اس شخص پر عالم اشیاء میں موت واقع ہونے کی سنت اس طرح تبدیل کی جاتی ہے کہ اسے عالم اشیاء میں ہوتے ہوئے عالم عصر بلکہ عالم بریہ میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور اس کی عالم اشیاء میں واقع ہونے والی موت واقع تو ہو جاتی ہے مگر اس کا ظہور اصلی طور پر واقع ہونے کے کئی سالوں بلکہ ہزاروں سالوں کے بعد ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے نصرت کفل کے بعد کوئی ذات زیادہ طاقت ور دوگنی یا دوہری یا دوسری نفس کی حامل ہو جاتی ہے۔ نصرت کفل ایک حاوی نصرت ہے اس لیے عمومی طور پر ذبیح اللہ، ذوالکفل اور ذوالقرنین سبھی نصرت کفل سے فیض یاب ہیں۔ لیکن جب مخصوص اعتبار سے ذکر کیا جائے گا

تو اس کا اطلاق صرف ان اشخاص پر ہو گا جو ذوالکفل قرار دیے گئے۔

چنانچہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی میں صرف دو اشخاص ہی ایسے گزرے ہیں جنہیں ذوالکفل کہا گیا ہے۔ اور ان دونوں کے نام الیسع ہیں۔

(۱) پہلے الیسع حضرت ادریس ہیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ حضرت نوح کے اسلاف میں سے تھے۔

(۲) دوسرے الیسع حضرت الیاس، آل یاسین، آل یاسین ہیں جو حضرت یعقوب کے اخلاف میں سے تھے۔

چنانچہ قرآن نے نصرت کفل کی حاوی شکل اور بطور خاص نصرت کفل سے متصف خصوصی قسم کا حوالہ اس طرح دیا ہے:

(۱) واسمٰعیل وادریس وذو الکفل کل من الصابرین وادخلناھم فی رحمتنا انھم من الصالحین .(الانبیاء : ۸۵۔۸۶)

ترجمہ: اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل یہ سب صبر والوں میں سے ہیں۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا ہے اور یہ سب صالحین میں سے ہیں۔

(۲) واذکر اسمٰعیل والیسع وذا الکفل وکل من الاخیار۔ (ص:۴۸)

ترجمہ: اور ذکر کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کا اور وہ سب اخیار میں سے تھے۔

چنانچہ عمومی قسم میں حضرت اسمٰعیل بھی اس قسم میں داخل ہیں جبکہ خصوصی طور پر صرف حضرت الیسع سلف حضرت نوح اور حضرت الیسع خلف حضرت یعقوب اس میں داخل ہیں۔

اس طرح قرآن دراصل خصوصی طور پر دو ذوالکفل کا ذکر کرتا ہے (۱) ادریس ذو الکفل اور (۲) الیسع ذوالکفل۔

چونکہ یہاں اس کی تقریر پر کوئی بحث مقصود نہیں اس لیے اس نکتے سے بھی سر دست تعارض نہیں کیا جا رہا ہے کہ الانبیاء آیت:۸۵ میں ادریس اور ذوالکفل کے درمیان جو 'و' ہے اور ص آیت:۴۸ میں الیسع اور ذاالکفل کے درمیان جو 'و' ہے اس کا کیا مفہوم ہے۔ جس سے کسی کو شبہ ہو سکتا ہے کہ ذوالکفل کوئی مستقل شخص ہیں اور اس طرح ان آیتوں میں دراصل تین اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ (اس تعلق سے تقریری بحث ان شاء اللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی

صورت حال کے سلسلے میں کی جائے گی)

## (۳) ذوالقرنین :

ذوالقرنین بھی ذوالکفل کی طرح نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ اپنے عموم کے اعتبار سے یہ قسم بھی نصرت کفل میں ہی شمار ہو گی لیکن خصوصیت کے لحاظ سے یہ اس سے مختلف ہے۔ کفل کے اعتبار سے اشتراک ہوتے ہوئے بھی دو لحاظ سے اس میں فرق ہے:

(۱) حکمت عملی (Strategy)

(۲) ترسیل (Logistics)

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قرن کے تین معانی ہیں اور تینوں ہی یہاں منطبق ہوتے ہیں۔ قرن کے وہ تین معانی درج ذیل ہیں:

(۱) قرن : زمانہ، عرصہ، عمر، مدت کار، مدت عمل

(۲) قرن : ایسی چیز جو اصل میں ملی ہوئی اور ایک ہو اور جس کا ظہور دو الگ الگ حصوں میں یا شکلوں میں ہوا ہو مثلاً سینگ۔

(۳) قرن: طاقت، قوت، جبر، اسلحہ

اس طرح ذوالقرنین کے معانی ہیں:

(۱) دو زمانہ، دو عرصہ، دو عمر، دو مدت کار، دو مدت عمل والا۔

(۲) ایسے، دو ظہور والا جن کی حقیقت ایک ہو۔

(۳) دو طاقتوں، دو قوتوں، دو جبروں، دو اسلحوں کا مالک

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نزاکت کے اعتبار سے یہ وہی صورت حال ہے جو اس سے قبل ذو الکفل کے ذیل میں بیان کی گئی ہے۔ تاہم یہاں اس سے چند باتیں مختلف پائی جاتی ہیں۔ وہ مزید نزاکتیں جو یہاں پائی جاتی ہیں ان کا تعلق کچھ ابلیس کی حکمت عملی سے ہے اور کچھ اس کی ترسیل (Logistic Criticality) سے۔

قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی نازک صورت حال تقدیر انسانی میں کم از کم دو بار پیدا ہو سکتی ہے۔ جن میں ایک بار ہو چکی ہے اور ایک بار ہونے والی ہے۔ یہ اپنی نوعیت

کے اعتبار سے اتنی غیر معمولی صورتحال ہے جس کا اندازہ کرنا طاقت بشری سے عموماً باہر ہے۔ اس کے تین شعبے ہیں:

(۱) کسی مظہر حق ذات کے تعلق سے ایسی نازک صورت حال کا واقع ہونا جب اللہ کی سنت تخلیق کا اجراء اسے موت دینے کے درپے ہو اور اللہ کی رضا اس کی بقا چاہتی ہو۔

(۲) ابلیس اہل حق کے خلاف ایسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرے کہ زمین کی عمومی سنت بشری اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو۔

(۳) ابلیس اہل حق کے خلاف ایسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرے کہ طاقت بشری میں اس کے مقابلے کی استعداد پیدا کرنے کی صلاحیت معدوم ہو جائے اور کفایت کرنے والی اضافی صلاحیت کی درآمد واحد ممکنہ صورت کے اعتبار سے ناگزیر ہو جائے۔

یہ وہ نازک ترین حالت ہے جب اللہ تعالیٰ اس سرخی نزاکت کے مقابلے کے لیے اہل حق کی ذوالقرنین سے مدد فرماتا ہے۔ اس طرح بھیجے جانے والے ذوالقرنین تین صفات کے حامل ہوتے ہیں:

(۱) ان پر دو زمانے والا ہونے کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۲) ان کے دونوں ظہور کی اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔

(۳) ان کے پاس دو قوت یا دو قسم کے اسلحے ہوتے ہیں۔ ایک بشری اور ایک غیر بشری۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ایسی صورت حال اب تک صرف ایک بار پیدا ہوئی جب زمین پر اپنی تخلیق کے بعد شاید پہلی بار یاجوج وماجوج کے ظہور کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار زمین پر گروہ حق کی مدد ایک ذوالقرنین سے کی۔ اس عاجز کا اندازہ ہے کہ یہ زمانہ حضرت نوح سے قبل یا فوراً قبل کا زمانہ تھا یا خود حضرت نوح کے ساتھ ساتھ ہی یہ زمانہ آیا۔ ان شاء اللہ ان دونوں ذوالقرنین کا ذکر اپنے اپنے محل پر آئے گا۔

ان توضیحات کے بعد ہم پھر اس سلسلۂ بحث کو شروع کرتے ہیں ـــــ جو معرکۂ خیر و شر کے مرحلۂ چہارم سے متعلق تھا اور اس ذیل میں ہم حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر کر رہے تھے۔

حضرت المسیح علیہ السلام کا آسمان پر اٹھا لیا جانا اور ادریس بنا دیا جانا دراصل ایک نازک صورت حال سے مظہر حق کو باہر نکالنا تھا۔ اس نازک حالت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک

بچاؤ کی کارروائی (Rescue Operation) تھی۔اور غالباً اسی صورت حال سے مشابہت رکھتی ہے جس صورت حال میں حضرت عیسیٰ علی نبینا علیہ السلام ڈال دیئے گئے تھے۔اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی بچالیا تھا ــــ جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

(۱) **اذ قال الله یٰعیسیٰ انی متوفیك ورافعك الی ومطهرك من الذین كفروا. وجاعل الذین اتبعوك فوق الذین كفروا الی یوم القیٰمة.** (آل عمران:۵۵)

ترجمہ: جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ! یقین کرو میں تم کو اپنی قدرت کاملہ کا مورد اور اپنی جانب اٹھایا ہوا اور انکار کرنے والوں سے پاک کیا ہوا بنادوں گا۔اور تجھ کو ایسا بنادوں گا کہ جو تمہاری پیروی کرنے والے ہیں وہ بالآخر قیامت تک غالب آجائیں گے ان پر جو تمہارا انکار کرتے ہیں۔

(۲) **وقولهم انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول الله وما قتلوه ما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذین اختلفوا فیه لفی شك منه مالهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه یقینا. بل رفعه الله الیه وكان الله عزیزا حكیما.** (النساء :۱۵۷۔۱۵۸)

ترجمہ: اور جہاں تک ان کے دعویٰ کی بات ہے! بے شک ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کردیا' تو نہ وہ انہیں قتل کرپائے نہ انہیں صلیب دے پائے۔ بلکہ انہیں شبہ میں ڈالنے کی صورت بنادی گئی۔اور دوسری طرف وہ لوگ جو اس تعلق سے اختلاف میں پڑگئے تو انہیں بھی اس میں شک ہے۔کسی کے پاس علم نہیں صرف قیاس ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بالیقین انہیں قتل نہیں کرسکے۔بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب اٹھالیا اور اللہ ہمیشہ سے زبردست اور حکیم ہے۔

اس طرح ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ معرکۂ خیر وشر کا مرحلۂ چہارم بھی ایک بحران اور تباہی (Disaster & Crisis) پر منتج ہوا۔جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

**واذكر فی الكتاب ادریس انه كان صدیقا نبیا ورفعناه مكانا علیا.** (مریم : ۵۶۔۵۷)

ترجمہ: اور ذکر کرو ادریس کی مہم کے بارے میں بے شک وہ تھا اپنی حقیقت کے اعتبار سے صدیق اور نبی۔اور ہم نے اس کو اونچا کردیا مکان کے اعتبار سے اور علو کے اعتبار سے۔

# پہلا ذوالقرنین : 7600-6000 قبل مسیح

لیکن ایسا لگتا ہے کہ دو ہزار سالوں کے اندر اندر ہی اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر حضرت ادریس کو جنہیں پہلے مرحلے میں ذوالکفل بنایا گیا تھا۔ ذوالقرنین کے اعتبار سے دوبارہ مبعوث فرمادیا۔ یہ بعثت چند دنوں چند ہفتوں، چند مہینوں یا چند سالوں کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ چند سالوں کے لیے ہی ہوئی ہو گی۔ جیسا کہ اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ روئے ارض پر ذوالقرنین کی بعثت کب اور کیوں ہوتی ہے؟ وہ کیسی نازک صورت حال ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اہل حق کو کسی ذوالقرنین سے مدد دیتا ہے؟ یہ نزاکت تاریخ انسانی میں عدیم المثال ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے بیان فرمایا:

> یسئلونك عن ذی القرنین. قل ساتلوا علیکم منه ذکرا. انا مکنالهم فی الارض وآتیناه من کل شئی سببا. (الکہف : ۸۳۔۸۴)
>
> ترجمہ: اے رسول! وہ (یہودی) لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں (تاکہ آپ کا امتحان لیں اس لیے کہ ان یہودیوں کا خیال ہے کہ یہودی علماء کے علاوہ ذوالقرنین کے بارے میں روئے زمین پر کوئی نہیں جانتا اور اگر آپ اصلی نبی نہیں تو آپ کو ذوالقرنین کا علم نہ ہو گا آپ کہہ دیجئے! ٹہر و نور ابھی نہیں بلکہ ساری تفصیل بتا دیتا ہوں۔ بے شک ہم نے ذوالقرنین کو زمین پر تمکن بخشا اور ہر شئے کو قابو میں کر لینے کا اختیار دے دیا۔

اس مقام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا طوفان نوح کے بعد کسی ذوالقرنین کی بعثت نہیں ہو سکتی؟ بلاشبہ کئی ایسے امور ہیں جن کی بنیاد پر بعض اہل علم اس طرف بھی گئے ہیں۔

چنانچہ اہل علم کے مابین جن دو زمانوں میں کسی ذوالقرنین کی بعثت کا امکان پایا جاتا ہے وہ ہیں:

(۱) عہد حضرت ابراہیم علیہ السلام ـــــــ اور دوسرا

(۲) عہد حضرت یعقوب تا حضرت یحییٰ علیہما السلام۔

لیکن عاجز کی ترجیح یہی ہے کہ اگر کوئی زمانہ ذوالقرنین کی بعثت کا ہو سکتا ہے تو وہ حضرت نوح علیہ السلام سے بہت قبل یا معاً قبل یا زیادہ سے زیادہ ساتھ ساتھ کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ

عاجز حضرت ابراہیم کے عہد میں کسی ذوالقرنین کی بعثت کا امکان بھی مانتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض صحائف میں جس شخصیت حضرت ملک الصدق کا ذکر ملتا ہے جن کی حضرت ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی ہو سکتا ہے وہی ذوالقرنین اوّل ہوں۔ چونکہ یہ بحث طویل ہو جائے گی اس لیے عاجز ان دلائل کو پیش نہیں کرتا جو حضرت انس بن یرد المعروف به الیسع الادریس ذو الکفل کے ہی ذوالقرنین اوّل کے اعتبار سے ترجیح کا سبب ہیں۔

بہر حال حضرت ذوالقرنین اوّل مبعوث فرمائے گئے۔ کوئی ضروری نہیں ـــــ بلکہ اس کا امکان کم ہی ہے ـــــ کہ کوئی ذوالقرنین ایسے نبی ہوں جن کا بنیادی کام دعوت ہو ـــــ اس لیے کہ ایک ذوالقرنین، نبی اپنے آپ میں حجت، جارحہ اور فیصل ہوتا ہے بلکہ وہ حجت کے ساتھ ساتھ امر اللہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی میں دعوتی انبیاء کی طرح مصابرت کے بجائے قوت قاہرہ کا استعمال ہوتا ہے اور وہ قوت قاہرہ بشری کے ساتھ ساتھ مافوق البشری بھی ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ذوالقرنین ایک فیصلہ کن حاوی موثر فوق البشری قوت لے کر ہی آتا ہے اور جب ہی اسے ذوالقرنین سے موسوم کیا جاتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر حضرت آدم اور حضرت حوا کی تشریف آوری کے بعد خیر و شر کے جتنے معرکے ہو چکے تھے ـــــ یعنی معرکۂ سوم کے پہلے دور کا حصہ اوّل و حصہ دوم، دوسرا دور پھر معرکۂ چہارم کا پہلا دور ـــــ یہ سبھی معرکے کسی نہ کسی طور پر خیر کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت انس بن یرد المعروف به الیسع الادریس ذو الکفل کی رفعت بھی ایک کلی تباہی (Disaster) سے بچانے کی کارروائی تھی اسی طرح حضرت انس بن یرد کے بعد اہل حق پر کسی سخت آزمائش کا دور آیا ہوگا اس کا اندازہ کیا جانا مشکل نہیں۔

قرآن میں یہ پورا بیان بہت عجیب و غریب حقائق پر مبنی ہے۔

## (۱) پہلی بات: وقت اور زمانہ:

سب سے اہم اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ذوالقرنین کا پورا تذکرہ حضرت ہابیل کے معاً بعد کا تناظر پیش کرتا ہے جہاں شرک اور کفر کے بجائے ظلم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس میں یاد دہانی

کی بات یہ ہے کہ آدم وابلیس کا یہ معرکہ پہلے، دوسرے اور تیسرے مرحلے میں بنیادی طور پر معرکۂ خیر وشر تھا۔ اس کے بعد جیسے ہی رسالت کا آغاز ہوا اور عبادات و معاملات کے تعلق کے شرعۃ کی باضابطہ ابتداء ہوئی تو یہ معرکۂ خیر وشر اپنی اصل کے اعتبار سے تو ہمہ وقت معرکۂ خیر وشر ہی رہا لیکن اپنے ظواہر کے اعتبار سے معرکۂ حق وباطل ہو گیا۔ حضرت ہابیل کا عہد ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے معرکۂ خیر وشر کا ہی عہد تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد کے دو حصے ہیں۔ طوفان سے قبل اور طوفان کے بعد۔ طوفان سے قبل کے عہد کو دو طرح سے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

(۱) طوفان سے قبل کا عہد یا تو معرکۂ خیر وشر کا ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے درجۂ کمال کو پہنچنے کا عہد تھا۔

(۲) یا طوفان سے قبل کا عہد ہر چند کہ معرکۂ خیر وشر کے درجۂ کمال کو پہنچنے کا عہد تھا لیکن اسی وقت اس میں حق وباطل کے رجحان کی ابتداء بھی ہو رہی تھی۔ چنانچہ طوفان نے شر کے سارے ارتقاء کو فنا کر دیا لہٰذا اس کے بعد معرکۂ خیر وشر نے ظاہر کے اعتبار سے معرکۂ حق وباطل کی شکل اختیار کر لی۔

طوفان کے بعد کا عہد روئے زمین پر بنیادی طور پر معرکۂ حق وباطل کا عہد ہے۔ جس کی کلی تمدید نبی آخر الزماں ﷺ کے مشن کی تکمیل تک جاری رہتی۔ اس کے بعد پھر یہ معرکۂ حق وباطل از سر نو معرکۂ خیر وشر کی طرف بڑھ جاتا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد ہو جائے جو ایک بار پھر اور گویا آخری بار شر کو کلی طور پر ختم کر دینے کے لیے مقدر ہیں۔ ان شاء اللہ۔

سورۃ الکہف میں بھی حضرت ذوالقرنین کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عہد حضرت ہابیل اور حضرت نوح کے درمیان کا عہد ہے۔ جس میں منکرات کے ذکر کے لیے صرف دو الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے یعنی 'من ظلم (جنہوں نے ظلم کیا) اور 'مفسدون' (فساد کرنے والے)۔ بلاشبہ معروفات کے لیے 'من امن' اور 'عمل صالحا' کا استعمال کیا گیا ہے جو بتا رہے ہیں کہ رسالت وشرعۃ کا ہر چند کہ آغاز ہو چکا ہے اور اس بات کو سینکڑوں سال ہو چکے ہیں مگر تاریخی طور پر وہ ابھی بھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔

## دوسری بات : وسعت :

اس سورۃ کی دوسری بہت اہم بات ہے اس معرکے کے مرکزی میدان کشمکش کی تعیین اور اس میں الارض کا استعمال : یہ الارض اپنی وسعت اور معنویت کے لحاظ سے قرآن میں بیان ہونے والے درج ذیل تین الارض میں سے دوسرے اور تیسرے کے درمیان کا الارض معلوم ہوتا ہے۔ یعنی

(۱) ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین. (البقرہ : ۳۶)

ترجمہ: اور تمہارے لیے ارض میں ٹھکانا ہے اور متاع تھوڑی مدت تک کے لیے۔

(۲) فبعث الله غرابا یبحث فی الارض لیریهٗ کیف یواری سوٴة اخیه. (المائدہ:۳۱)

ترجمہ: چنانچہ اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اپنے بھائی کے جسم کو چھپادے۔

(۳) وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکٰفرین دیارا. (نوح : ۲۶)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب! زمین پر کسی کافر بستی کو نہ چھوڑ۔

چنانچہ سورۃ الکہف میں مذکور:

(۱) مکنٰه فی الارض (ہم نے اس کو تمکن دیا زمین میں)

(۲) آتینٰه من کل شئی سببا (ہم نے اسے ہر مہم کو چلانے، ہر چیز کو گھیرنے، قابو میں کرنے اور زیر کرنے کی طاقت دی)

(۳) بلغ مغرب الشمس. (پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ)

(۴) بلغ مطلع الشمس. (پہنچا سورج طلوع ہونے کی جگہ)

اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ حق کی جانب سے پہلی ارضی کارروائی تھی۔ یہاں ارض کی تطبیق یہ تو کی جاسکتی ہے کہ اس روئے زمین کی ارضیاتی سطح پر صرف اتنا حصہ ہی مقدر ہے جہاں تک اس زمانے میں انسانی آبادی تھی۔ چنانچہ اب وہ موجودہ طول البلد کی پیائش کے اعتبار سے جس مشرقی طول البلد سے، جس مغربی طول البلد تک پھیلا ہو۔

## (۳) تیسری بات : مقصد اور مہم :

تیسری بات پہلی دو باتوں سے اہم ہے۔ یعنی یہاں جس ذوالقرنین کا ذکر کیا جارہا ہے آخر اس کی بعثت کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

چنانچہ قرآن نے اس پر بڑے ڈرامائی انداز سے روشنی ڈالی ہے جو درج ذیل ہے:

(ا) مہم کی عظمت: جس مشن پر حضرت ذوالقرنین بھیجے گئے تھے وہ مہم کتنی بڑی اور مشکل تھی اور اس کے لیے کیا صلاحیت اور قوت درکار تھی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

(الف) پوری روئے زمین پر اقتدار کی طاقت : چنانچہ قرآن نے فرمایا :

انا مکنا له فی الارض. (بے شک ہم نے اسے عطا کی پوری روئے ارض پر تمکن)

(ب) وآتینٰه من کل شئی سببا. (اور بے شک ہم نے اس کو متعین کردہ مقاصد کی تکمیل کے لیے) ہر مہم کو شروع کرنے، ہر چیز کو گھیرنے اور گرفت میں لینے، ہر چیز پر قابو کرنے، اور ہر چیز کو زیر کرنے کی طاقت دی۔

(۲) مہم کی پہلی ضرورت : اس مہم کو پورا کرنے سے پہلے تین ضرورتوں کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے جن کا پورا کیا جانا ضروری تھا۔

(الف) پوری روئے ارض پر حق کا عمومی اقتدار بحال کرنا یا کم از کم حق کے گرے ہوئے علم کو ایستادہ کرنا۔

(ب) تمام ظالموں اور شر کے انسانی نمائندوں کی تلاش اور انہیں نشان زد کرنا۔

(ج) روئے ارض پر اس ہولناک مرکز شر کو تلاش کرنا جو فی زمانہ سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا اور اسے نشان زد کرنا۔

لیکن یہ تینوں ابتدائی مقاصد ایک ساتھ شروع کیے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے تنہا اس مہم کا آغاز کیا اس سے یہ اندازہ کرنا کتنا آسان ہے کہ ان کی بعثت کتنی نازک اور حق کے لیے کیسی ہولناک حالت کا نتیجہ تھی۔ ممکن ہے یہ وہ صورتحال ہو کہ چند نفر کے علاوہ اہل حق میں سے کوئی بچا نہ ہو یا جو گروہ بچا بھی ہو وہ شر سے اتنا خوفزدہ ہو کہ روئے ارض پر حق کی کارروائی کے

عملاً کلی طور پر معطل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے نزول سے قبل کی حالت تھی۔ چنانچہ حضرت ذوالقرنین نے اس مہم کا آغاز اس ہمہ جہت تلاش اور نشان زدگی سے کیا۔ اس پر قرآن نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

**فاتبع سببا** (چنانچہ ذوالقرنین نے) تلاش کی باضابطہ مہم شروع کی۔

یہاں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) حضرت ذوالقرنین کہاں مبعوث ہوئے؟ اور انہوں نے کہاں سے مہم شروع کی؟

(۲) آپ کا اصل مشن کیا تھا؟ یا بالفاظ دیگر روئے ارض پر شیطان کا وہ حملہ جس میں اس نے حق کو تقریباً مغلوب کر دیا تھا کیا تھا؟

چونکہ اس پوری بحث کو نہایت مختصر ہی درج کیا جا سکتا ہے اس لیے یہاں صرف ناگزیر امور ہی بیان کیے جائیں گے۔

عین ممکن ہے کہ حضرت انس بن برد کا آسمان پر اٹھا لیا جانا پہلے اسی خطرے کے سبب ہوا ہو گا یعنی روئے ارض پر یاجوج و ماجوج کا حملہ اور اس پر ان کی فساد انگیزی۔ ممکن ہے کہ حضرت انس بن برد کو خطرے کے ظاہر ہونے سے قبل ہی اٹھا لیا گیا ہو۔ اور ان کی دوبارہ بعثت اس وقت ہوئی ہو جبکہ یہ خطرہ پوری شدت سے تباہ کاریاں پھیلا رہا ہو۔ غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام اپنی رفعت کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد — جیسا — کہ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے —— ذوالقرنین بن کر روئے ارض پر تشریف لائے۔ ممکن ہے صرف تین سو سال کے اندر اندر۔ اس لیے کہ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے زمین پر متاہل ہو کر زندگی گزاری ہے اور ان کے اولاد بھی ہوئی۔ اور پھر غالباً ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت انسانوں میں بیشتر اہل حق تھے بہت تھوڑے انسان اہل شر تھے۔ چنانچہ ابلیس نے اصلی حملہ اہل شر انسانوں کے ذریعہ اہل حق پر نہیں کروایا تھا بلکہ یہ حملہ ایک غیر انسانی مخلوق یاجوج و ماجوج کے ذریعہ کروایا گیا تھا۔ اور اسی کو تلع قمع کرنے کے لیے حضرت ادریس کی ذوالقرنین کے اعتبار سے از سر نو بعثت ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ زمانہ حضرت نوح علیہ السلام سے کم از کم ۱۲۰۰ سال قبل کا ہو گا۔ جب ذوالقرنین اوّل کی بعثت ہوئی ہو گی۔

بعض شواہد سے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی بعثت ثانیہ یعنی حضرت ادریس کی ذوالقرنین اوّل

کے اعتبار سے بعثت $30^{o}$ طول البلد مشرق اور $50^{o}$ طول البلد مشرق کے درمیان ہوئی ہو گی۔

'مغرب الشمس'، 'مطلع الشمس' اور 'بین السدین' کی بحث بے حد پیچیدہ اور متعدد الوجوہ ہے اس لیے اسے آئندہ کے لیے چھوڑ دینا بہتر ہے۔

چنانچہ قرآن کے بیان سے لگتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین کی ابتدائی دو مہمیں ہر چند کہ اپنے مقاصد میں مجموعی طور پر کامیاب ہوئیں لیکن ان کی بعثت کا مقصد اصلی پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے تیسری مہم کا آغاز کیا اور جب آپ بین السدین پہنچے تو آپ نے اس قوم کی نشاندہی کر لی جو دراصل آپ کی بعثت کا سبب ہوئی تھی۔ یعنی یاجوج وماجوج۔ گزشتہ دو مہموں کا جہاں یہ فائدہ ہوا کہ مغرب و مشرق کے تمام مخالفین حق کی نشاندہی ہو گئی وہیں یہ بھی فائدہ ہوا کہ حضرت ذوالقرنین کی قیادت میں سارے اہل حق جمع ہو گئے۔ چنانچہ آیت: ۹۴ میں قالوا یا ذا القرنین میں قالوا سے مراد سارے جمع اہل حق اور تمام روئے زمین کے عامۃ الناس ہیں جو عمومی طور پر فساد سے پریشان ہو چکے تھے۔ اور اب حضرت ذوالقرنین کی موجودگی اور ان کی واضح استقامت کی وجہ سے جن کی جان میں جان آئی تھی۔

چنانچہ اس موقع پر حضرت ذوالقرنین نے اپنی اصل مہم کا آغاز فرمایا جن کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

(۱) یاجوج وماجوج جو باہر آ چکے تھے ان کا خاتمہ۔

(۲) زندہ یاجوج وماجوج کو گہری نیند سلا دینا۔

(۳) ان کے نکلنے کے راستے کو بند کر دینا۔

چنانچہ آپ کی اس پوری کارروائی کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

**آتونی زبر الحدید حتی اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتی اذا جعله نارا قال آتونی افرغ علیه قطرا۔** (الکہف : ۹۴)

ترجمہ: لے آؤ میرے پاس ڈھیر حدید کے۔ یہاں تک کہ جب دوسرے برابر ہو گئے تو ذوالقرنین نے کہا: پھونکو۔ یہاں تک کہ یہ آگ ہو جائے۔ پھر کہا کہ لے آؤ میرے پاس تاکہ ڈلوایا جائے اس پر بند کرنے کے لیے ڈھکن۔

اس کام کے ختم کر لینے اور اپنے مقصد بعثت کو پورا کر لینے کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور لوگوں سے فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ اتنا غیر معمولی تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں فی نفسہٖ ان فوق البشری قوتوں کا مالک ہوں جن کا ابھی مجھ سے صدور ہوا ہے۔ بلکہ یہ کام دراصل اللہ رب العزت نے کروایا ہے۔

اس کے بعد آپ نے قیامت تک کے حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

**فما اسطاعوا ان یظهروه وما استطاعوا له نقبا.** (الکہف:۹۷)

ترجمہ: پس نہ ان کے پاس اس کی طاقت ہے کہ وہ اس کو چڑھ کر پار کریں اور نہ وہ اس میں شگاف ڈال سکیں گے۔

حضرت ذوالقرنین کی زبان سے نکلے یہ الفاظ اور قرآن میں درج یہ کلام اللہ قرآن کے ان عجائبات میں سے ہے جن کی گہرائیوں میں انسان کھو جاتا ہے۔ نو الفاظ کی یہ آیت اپنے اندر حکمتوں کی ایک ایسی دنیا رکھتی ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔

حضرت ذوالقرنین نے مزید فرمایا:

**فاذا جاء وعد ربی جعله دکاء وکان وعد ربی حقا.** (الکہف:۹۸)

ترجمہ: پھر جب آئے گی میرے رب کی میعاد تو وہ اس بند کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ اور میرے رب کی میعاد یقینی ہے۔

اس طرح حضرت ذوالقرنین اول نے اپنی بعثت کے مقاصد پورے فرمائے۔ اور زمین پر اہل حق کو تمکن عطا کیا۔ زمین پر پہلی بار حق کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس طرح معرکۂ خیر و شر کا مرحلۂ چہارم اختتام پذیر ہوا۔

## ایک اشکال :

یہاں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مدد سے بنی آدم کو کیوں نوازا؟ واقعہ کی تفصیل سے ایسا لگتا ہے کہ انسان مغلوب ہو رہا تھا اور ابلیس غالب لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد نے صورتحال بدل دی اور گویا یہ ابلیس کے ساتھ زیادتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابلیس کے ساتھ زیادتی اللہ تعالیٰ نے نہیں کی نہ ہی اللہ تعالیٰ نے خلاف ضابطہ انسان کی مدد کی۔ بلکہ اصلی سوال یہ ہے کہ ابلیس کو إلی الیوم الوقت المعلوم تک آزادی (Free hand) دینے کا مطلب کیا ہے اور

اس نے اس کی کیسی کیسی خلاف ورزی کی ہے؟ اس صورت حال کو ایک مثال سے سمجھیں :

فرض کیا جائے کہ فرد الف یا ٹیم الف کو کامیاب قرار دے دیا گیا اس پر فرد ب یا ٹیم ب نے اعتراض کیا کہ یہ فیصلہ درست نہیں اور یہ کہ اگر دوبارہ کھیلنے کا موقع دیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ پہلا فیصلہ غلط تھا۔ اب اس معترض ٹیم کو پوری اجازت دی گئی کہ وہ اس دعوئی کو ثابت کرے۔ اس آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھیل کے میدان میں اپنی ٹیم کے ساتھ کھیل کر ثابت کرے۔ اب اگر وہ ٹیم کھیل کے میدان کے باہر سے یا کھلاڑیوں کے علاوہ غنڈے بلا کر مخالف ٹیم کو پٹوائے تو یہ اس آزادی کی خلاف ورزی ہے۔

ٹھیک اسی طرح ابلیس نے اس آزادی کے حدود کو بالائے طاق رکھ کر ہمیشہ خلاف ورزی کی۔ لہٰذا اللہ نے ایک خاص سنت کا اجراء فرمایا یعنی اس خلاف ورزی پر ابلیس سے کوئی تعارض نہ کیا جائے اور صرف خلاف ورزی کی حد تک توازن برقرار رکھنے کے لیے بنی نوع انسان میں مومنین کی مدد کی جائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی یہ مدد فی الواقع ابلیس پر زیادتی نہیں۔ اصل زیادتی اور خلاف ورزی کا مرتکب تو خود ابلیس ہے جس نے ہمیشہ ہی اپنے حدود پامال کیے۔

# مرحلۂ پنجم : ابلیس کا مافوق البشری سماوی قوتوں کے ذریعہ حملہ اور پہلی کائناتی جنگ عظیم : 6000 قبل مسیح

معرکۂ خیر و شر میں مرحلۂ چہارم ابلیس کی ناکامی پر ختم ہوا۔ ہر چند کہ ذوالقرنین کی آمد اہل حق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی مدد ضرور تھی اور فتح بھی لیکن اسے کھلی فتح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کا نقصان ابلیس کو صرف یہ ہوا کہ اس نے اچانک اہل حق پر حملے کے لیے جس حیوانی قوت کو زمین سے نکال کر اوپر چڑھایا تھا انہیں جزوی طور پر ختم کر دیا گیا اور جو باقی بچ گئے تھے انہیں زیر زمین مفلوج اور معطل کر دیا گیا۔ اور اب قیامت سے قریب ہی ان کے پھر باہر آنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ حضرت ذوالقرنین نے بتایا تھا اور اب جس کی تصدیق قرآن کر رہا ہے۔

اس سے اہل حق اور بطور خاص حضرت انس بن برد یعنی اب حضرت ذوالقرنین علیہ السلام اور دیگر اہل حق کو سکون میسر آگیا اور پوری روئے زمین پر حق کا غلبہ ہو گیا۔ اور ابلیس اور اس کے شر کے دروازے بند ہو گئے۔

دراصل ابلیس نے اس مرحلے میں مکر اور کید کا سہارا لیا تھا اور اسے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ جب وہ اس طرح دیو ہیکل حیوانی قوتوں کو انسانوں پر چڑھا لائے گا اور جب انسان اس کے ہاتھوں پوری طرح سے مغلوب اور بے بس ہو جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ذوالقرنین بنا کر مدد کے لیے بھیج دے گا۔ چنانچہ حضرت ذوالقرنین اوّل کی اچانک آمد نے ابلیس کی فتح کو پوری طرح شکست میں بدل کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عظیم کوشش ـــــ جسے اس نے تقریباً تین سو سالوں سے جاری رکھی تھی اور جس کے نتیجے میں ایک عظیم الشان حیوانی دیو ہیکل فوج تیار ہو سکی تھی۔ اور جس کے ذریعہ اس نے اہل حق کو چیونٹیوں کی طرح روند ڈالنے اور گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالنے کا آغاز کر دیا تھا۔ اور قریب تھا کہ اسے کلی اور مکمل فتح نصیب ہوتی ـــــ خاک میں مل گئی بلکہ اس پوری فوج کو دوبارہ منظم کرنے سے وہ ہزاروں سالوں تک کے لیے محروم کر دیا گیا۔ اس پوری حیوانی فوج کو حضرت ذوالقرنین نے نہ صرف Disband کر دیا بلکہ اس کی افزائش کو بھی معطل کر دیا۔

اس بے بسی نے ابلیس کو نہ صرف یہ کہ غضب ناک کر دیا بلکہ اس کو نئی، مزید وحشت ناک اور ہمہ گیر طریقۂ جنگ وضع کرنے کی طرف مہمیز کیا۔ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی اس نے اپنی بے مثال تدبیروں سے دنیاء ملائکہ میں زلزلہ برپا کر دیا اور ایک ایسی کامیابی حاصل کر لی جس کا بظاہر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی کوششوں سے ملائکہ کے ایک گروہ کو گمراہ کرنے اور اپنے ساتھ ملانے اور انہیں آدم کے خلاف اپنی جنگ میں آلہ کار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دو سو سے زائد ملائکہ تھے جن میں انیس (۱۹) اعلیٰ درجے کے ملائکہ تھے۔

ابلیس نے ان ملائکہ کے اندر فساد جنس پیدا کیا اور انہیں زمین پر لے آیا۔ ابلیس کی کوششوں سے، ان ملائکہ نے انسانی عورتوں سے صحبت کی اور بے قابو ہو گئے۔ ایسا کرنا ابلیس کی ایک طویل اور اس کی عقل کے اعتبار سے ناقابل شکست حکمت عملی تھی۔ وہ حضرت ذوالقرنین کی بعثت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی جانے والی نصرت سے اب واقف ہو چکا تھا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ صرف اس لیے اس دیو ہیکل حیوانی فوج کے حملے میں ناکام ہو گیا کہ اس نے اس طرف دھیان نہیں دیا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کے ساتھ حضرت ادریس ذوالکفل کو ذوالقرنین بنا کر بھیج سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے اب یہ حکمت عملی اپنائی کہ اگر ایسی کوئی دوسری مدد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ہوئی بھی تو وہ اسے ناکام بنا دے گا۔ دوسری بات یہ کہ اب اس نے اس دیو ہیکل حیوانی فوج ـــــ جو اب اس کے لیے معطل تھی ـــــ کی جگہ اس سے کروڑوں گنی زیادہ طاقت ور زیادہ وسیع الاطراف زیادہ ہمہ گیر اور ارضی کے بجائے کائناتی فوج (Cosmic Army) بنالی تھی اور اسے پوری امید تھی کہ اس کی یہ حکمت عملی ناکام نہیں ہو گی اور اس بار وہ پوری روئے زمین سے آدم نام کی نسل کے نام و نشان کو مٹا دے گا۔

# قوم نوح (ماقبل طوفان) : 6000 قبل مسیح

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قوم جسے قرآن کی آیت میں 'قوم نوح' کہا گیا ہے کون سی قوم تھی؟ قرآن نے بیان فرمایا:

"ولقد ارسلنا نوحاً الی قومه" (الاعراف :۵۹)، (ھود :۲۵)
(المومنون:۲۳) (العنکبوت:۱۴) (نوح:۱) وغیرہ۔

ترجمہ: اور تحقیق کہ ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف

یہاں یہ بات واضح ہو کہ اس وقت روئے زمین کی آبادی خواہ کتنی ہی پھیلی ہوئی ہو وہ آج کے مقابلے میں چھوٹی تھی اور غالباً پوری روئے زمین کے موجودہ ہر خطے میں پھیلی ہوئی نہ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موجودہ روئے زمین کے خشکی کے سارے حصے آج کے مثل نہ ہوں۔ جہاں آج برف ہے ممکن ہے کل وہاں نہ ہو، جہاں آج سمندر ہے ممکن ہے وہاں سمندر نہ ہوں۔ جہاں آج پہاڑ ہیں وہاں اتنے اونچے پہاڑ نہ ہی ہوں یا سرے سے پہاڑ نہ ہوں۔ جہاں آج خشکی ہے کل وہاں سمندر ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت انسانی آبادی پھیلنے کے باوجود مربوط اور ملی ہوئی تھی۔ اس لیے یہاں قومه سے مراد پوری نسل انسانی ہے جو اس وقت باہم مربوط اور موجود تھی۔

قومه کے اس وسیع مفہوم کے باوجود اس سوال پر غور کرنا ضروری ہے کہ طوفان سے قبل وہ کون سی انسانی آبادی تھی جسے یہاں قومه سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے تاریخی طور پر کون سے نام کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں کئی باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

(۱) جب تہذیب یا نظام کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ مرکزی لوگ اور ان کی حکومت ہوتی ہے جو دراصل اس تہذیب کے ستون ہوتے ہیں اور اس وقت موجود تمام قومیں اور اگر ممالک ہوں، تو ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ اس نظام کے تحت زندہ رہتے ہے۔ مثلاً: آج پوری دنیا میں جو تہذیب غالب ہے وہ مغربی تہذیب ہے خواہ وہ یوروپ میں پائی جاتی ہو یا ایشیا اور افریقہ میں۔ اس لیے آج دنیا کی تہذیب مغربی ہے، آج دنیا میں مغربی تہذیب ہے۔

(۲) حضرت نوح کے طوفان کا زمانہ آج سے چار ہزار سال قبل پائی جانے والی سمیری

تہذیب (Sumerian Civilization) سے قبل کا زمانہ ہے۔

(۳) اس عاجز کی تحقیق کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام جس انسانی تہذیب کی طرف بھیجے گئے تھے وہ وہی تہذیب ہے جس کا ذکر افلاطون (Plato) نے اپنی کتابوں 'Timaeus' اور 'Critias' میں کیا ہے۔ افلاطون کے مطابق اس تہذیب کا ذکر جسے اس نے اطلانٹس (Atlantis) کہا ہے ـــ کری ٹائیس (Critias) کے دادا نے ایتھنس (Athens) کے بزرگ سولن (640-558 BC-Solon) سے سنا جسے مصر کے علماء نے سائس (Sais) کے مقدس مرکز میں سولن کو بتایا تھا۔

(۴) اس تہذیب کی معلومات کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً اس کے اصلی مقام، زمانہ، ترقی کے احوال اور تباہی کی صورت سے متعلق تفصیلات کی صورت میں غلط فہمیاں۔

(اس تعلق سے تفصیلی تقریر ان شاءاللہ عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال میں آئے گی)

## فساد عظیم :

اس عہد میں ابلیس نے اپنی نئی حکمت عملی کے تحت اس روئے زمین پر بالعموم اور نسل انسانی کے درمیان بالخصوص ایسا فساد عظیم برپا کیا جس کا تصور کرنا محال ہے۔ یہی وہ فساد عظیم تھا جس کا کسی قدر اجمالی تذکرہ توضیحات کے ذیل میں صفحات ۲۹۳ تا ۳۰۴ میں آچکا ہے۔

قرآن نے اسی فساد کا ذکر کرتے ہوئے انہیں جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ اس کی وسعت، ہولناکی اور سنگینی کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

**قال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم یزده مالهٗ وولده الا خسارا. ومکروا مکرا کبارا.** (نوح:۲۱-۲۲)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کہنا نہ مانا اور مانا ایسے کا جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔ اور داؤ کیا ہے بڑا داؤ۔

اس 'مکر کبار' کی وسعت، ہولناکی اور سنگینی کیسی تھی اس کا اندازہ توضیحات میں درج عنوانات کے تحت دیکھے جانے سے ہو جائے گا۔

ابلیس کے اس مکر کبار کے اجزاء، اور مقصد و ہدف کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ایسا اندازہ ہوتا

ہے کہ یہ ایک سہ منزلہ کارروائی تھی جس کا مقصد روئے زمین سے نفس خیر کا ہی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کا کلی خاتمہ تھا، تاکہ ابلیس کو اس مخلوق انسان سے ہی نجات مل جائے۔ اس کی تین سطحیں درج ذیل تھیں:

(۱) مرحلہ اوّل ـــــ زمین میں فساد پیدا کرنا اور اس فساد کو زندگی کے ہر شعبے تک وسیع کر دینا۔

(۲) مرحلہ دوم ـــــ زمین پر بے تحاشا، بے مہار اور بے مقصد خوں ریزی کرانا۔

(۳) مرحلہ سوم ـــــ پوری نسل انسانی کو ہی ختم کر دینا۔

## (۱) مرحلہ اوّل

زمین پر فساد پیدا کرنا اور اس فساد کو زندگی کے ہر شعبے تک وسیع کر دینا ـــــ ایک ہولناک شیطانی منصوبہ تھا۔ اس کے ذریعہ طرح طرح کے فساد پیدا کیے گئے جن کے دو بنیادی شعبے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

### (۱) فساد نسل :

یہ وہ افسد الفساد ہے جس کا ذکر سب سے پہلے کیا جانا چاہئے۔ اس کے تحت ابلیس نے ملک اور جنوں کی آدمی عورتوں سے صحبت کروائی اور اس طرح جباروں، نفلوں، الیوں، نفروں اور عفریتوں کی لاتعداد قسمیں انسانی معاشرے میں پیدا کروادیں۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اسکی پوری تفصیل بتائی جائے تاہم اگر تقریب فہم کے لیے آج کی ایک مثال دی جائے تو وہ لوگ جو اس وقت مغربی سائنسی تجربہ گاہوں میں ہو رہے ہولناک تجربوں سے واقف ہیں وہ اسے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہ مثال یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ روئے زمین پر ایک جینیاتی، حیاتیاتی اور جرثوماتی جنگ عظیم چھڑ جائے اور زمین، آسمان اور سمندروں سے جینیاتی، حیاتیاتی اور جرثوماتی اسلحوں سے حملے ہونے لگیں تو چند سالوں کے بعد نسل انسانی کے وجود اور اس میں پیدا ہمہ گیر فسادات کی کیا صورت ہو گی؟

میرا اندازہ ہے کہ جو لوگ ان سائنسی تجربہ گاہوں میں ہونے والے کاموں کا براہ راست علم رکھتے ہیں وہ اس مثال کی توضیح کرنا تو دور کی بات تصور کرتے ہی کانپ جائیں گے۔

چنانچہ ابلیس نے ان ملکوں اور جنوں کی فوج کے ساتھ پہلے مرحلے میں روئے زمین پر یہی

کیا۔اس کے، چند ہی دنوں کے بعد روئے زمین پر انسانی معاشروں کے اندر بچوں اور نوجوانوں اور لڑکے اور لڑکیوں کے اعتبار سے (Inhuman)، (Unhuman)،(A-human) نسلوں کی ایک معتد بہ تعداد پیدا ہو گئی۔چنانچہ اس مرحلے کی تکمیل ہوتے ہی ابلیس نے پہلے مرحلے کا دوسرا حصہ شروع کیا جس کا مقصد تھا اس فساد کو ایک تسلسلی رد عمل (Chain-reaction) کی شکل دے دینا اور اس طرح اس کو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلا دینا۔

## (۲) فساد علم :

یہ وہ دوسرا افسد الفساد ہے جس کا ذکر فساد نسل کے بعد ہونا چاہئے۔ علم کا منبع اللہ رب العزت ہے۔۔اس نے لوگوں کو علم دیا۔وہ سارے علوم جن سے انسانوں کو آگاہ کیا گیا محمود تھے۔اگر اس میں کسی مضرت کا امکان تھا تو وہ صرف اس حد تک کہ کوئی ان محمود علوم کا استعمال نا محمود کاموں میں نہ کر لے۔اس تعلق سے دوسری بات یہ تھی کہ انسانوں کو جو بھی علوم دیئے گئے وہ اس کی 'تکلیف' کے عین مطابق تھے۔اسے اللہ رب العزت نے ایسا کوئی علم نہیں دیا جو مالا یطاق ہو۔

اس نظام میں پہلا فساد اس وقت پیدا ہوا جب ابلیس معتوب اور راندۂ درگاہ ہوا۔اس لیے کہ جو علوم اس کے پاس تھے اس کے بے جا استعمال کا خطرہ پیدا ہو گیا۔اور اللہ تعالیٰ الی الیوم الوقت المعلوم تک اسے اس کے علم سے محروم نہیں کرتا۔اگر آدم کے خلاف ابلیس کی پوری کارروائی اور حکمت جنگ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابلیس کے اقدامات نہایت دقیق غور و فکر اور سوجھ بوجھ کا نتیجہ رہے ہیں۔اس نے پہلی کارروائی کی بنیاد آدم کی ساخت کو بنایا اور اب الجنۃ کے بعد بھی اس کی کوششوں کا بنیادی پتھر انسان کی ساخت اور جنس ہی ہے۔

اس کی حکمت عملی کا دوسرا پتھر آدم کی وہ فضیلت ہے جس سے اس نے ملائکۃ کے سامنے اپنی فوقیت ثابت کی تھی۔واضح ہو کہ ملائکۃ کا علم انفرادی نکتے پر ممکن ہے انسان سے بڑھا ہوا ہو لیکن ان کے علم کی نوعیت One-Time-One-Way-One -Mission-One Aspect- Input & Regulated knowledge ہوتا ہے۔ جبکہ آدم کے پاس Multi-Timous-Multiway - multi - Misson-All Aspect -Input-output-Free-knowledge ہوتا ہے۔

ابلیس نے بہت دقت نظر کے ساتھ دوسرے فساد کی بنا رکھی۔ اس نے دوسرا فساد اس طرح پیدا کیا کہ ان آلۂ کار ملائکہ کے پاس انفرادی طور پر جو علوم ان کے تفویض کردہ کاموں کے تعلق سے تھے انہیں پہلے مرحلے میں انسانی خواتین اور دیگر مرد آلۂ کار کو زاد (Input) کے اعتبار سے منتقل کر دیا۔ دوسرے مرحلے میں انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں توسیع دے دی۔ چونکہ یہ وہ علوم تھے جن کا تعلق ان ملائکہ کی مفوضہ ذمہ داریوں سے تھا جو بحیثیت آدمی علوم مالا یطاق تھے۔ اس لیے جب یہ مالا یطاق علوم انسانوں کو ملے تو اب اس ہمہ جہت دماغ میں وہ ایسے فسادات پیدا کرنے کا باعث ہوئے جن کا تصور ملائکہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

## (۳) ذیلی فسادات:

اس طرح پیدا ہونے والے یہ دو بنیادی قسم کے فساد ہیں جن کے ذریعہ ابلیس نے انسانی معاشرے میں فسادات کا ایک ہمہ گیر جال پھیلا دیا۔ چنانچہ اس ہمہ گیر جال کے بنیادی پہلو درج ذیل ہیں:

(۱) فساد تولید غیر انسانی ـــــ اس کا تعلق ملک اور جنوں اور انسانوں سے تھا جس کا نتیجہ انواع و اقسام کی نیم انسانی مخلوقات کی پیدائش تھی۔

(۲) فساد تولید انسانی ـــــ اس کا تعلق آدمی مرد و عورت کے مابین خلاف اخلاق رشتوں سے پیدا ہونے والا فساد ہے جس کا بنیادی عنصر زنا تھا۔

(۳) فساد علوم انسانی ـــــ اس فساد نے تقریباً تمام علوم میں فساد کے دروازے کھول دیئے۔

(۴) فساد عملیت ـــــ یہ فساد کسی بھی کام کرنے کی عملیت (Method) میں در آنے والا فساد ہے۔

(۵) فساد عقیدہ ـــــ یہ فساد شرک اور کفر سے متعلق ہے۔ اس فساد کے ذریعہ پوری دنیا شرک سے بھر دی گئی۔

(۶) فساد عبادت ـــــ عقیدہ سے آگے جا کر عبادت کرنے کے طریقوں سے متعلق یہ فساد ہے جو دراصل دین کے مقابلے میں مذہب (Religion) کی بنیاد ہے جس کی اصل وہم (Superstition) ہے۔

(۷) فساد طریقۂ حیات ـــــ یہ فسادات کا وہ ہمہ گیر سلسلہ ہے جس میں زندگی

گزارنے کے طریقوں، ثقافت اور تمدن سے متعلق فسادات ہیں۔

(۸) فساد کا شتکاری حیوان بانی و شکار ـــــ یہ وہ فسادات ہیں جن کا تعلق زمین سے کاشت کرنے کے تعلق سے ہے۔ یا ان ذرائع سے جہاں سے انسان کو غذا حاصل ہوتی ہے۔

(۹) فساد کاروبار و تجارت ـــــ یہ وہ فسادات ہیں جن کا تعلق ہر طرح کے تبادلۂ مال سے ہے۔

(۱۰) فساد مال ـــــ یہ وہ فسادات ہیں جو مال سے متعلق ہیں۔

(۱۱) فساد خاتمۂ نسل آدم ـــــ یہ فساد کی وہ قسم ہے جس کا لازمی نتیجہ رفتہ رفتہ زمین پر نسل آدم کا خاتمہ تھا۔

## مرحلۂ دوم

ابلیس کے پیدا کردہ فساد کے نتیجے میں نسل آدم جباروں، نفلوں، الیووں، نفروں اور عفریتوں سے بھر گئی۔ اس کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے میں فساد پیدا ہو گیا۔ اس میں مومنین کا ذکر کیا پوری نسل انسانی تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی۔ ان خلاف انسان، نیم انسان، عدم انسان ذی روحوں نے جن کی مرغوب چیز خونریزی تھی ـــــ باہمی خونریزی کا ہولناک سلسلہ شروع کر دیا۔

ایک صحیفۂ عتیق کی ایک عبارت اس ہولناک صورت حال کا غیر معمولی نقشہ کھینچتی ہے جس کا ذکر نہایت بلیغ طریقے سے قرآن نے کیا ہے:

ومکروا مکراً کبارا۔

اس صحیفۂ عتیقہ کے الفاظ ہیں:

> "میکال اور ..... جبرئیل نے نیچے زمین کی طرف دیکھا اور پایا کہ پوری زمین انسانی خون سے رنگین ہو گئی ہے اور ہر طرف فساد ہی فساد ہے تو انہوں نے آپس میں کہا:
> زمین تو انسانوں سے خالی ہوئی جاتی ہے اور انسانوں کی کراہ عرش کے دروازے تک سنائی دے رہی ہے اور اے مقرب ملائکہ انسانی خون تم کو پکار رہے ہیں کہ تم ان کی فریاد اللہ رب العزت تک پہنچاؤ۔"

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اس وقت روئے زمین پر صرف چند ہزار انسان ہی بستے ہوں گے۔ آج پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیوں میں سے ایک غلطی فہمی یہ بھی ہے کہ انسانی آبادی

مسلسل بڑھ رہی ہے اور آج ۶ ارب ہو گئی ہے اور ہزاروں سال قبل نہایت کم ہو گی۔ انسانی آبادی ہی نہیں یہ تہذیبیں بھی کئی بار روئے ارض پر بڑھیں اور کم ہوئیں۔ حتی کہ آج کی اس مغربی تہذیب کے علمبردار جو یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی موجودہ مغربی تہذیب کی طرح کوئی تہذیب روئے ارض پر کبھی برپا نہیں ہوئی اور ان سے زیادہ تو وہ مشرقی فاتر العقل نام نہاد عقلمند جوان اہل مغرب سے زیادہ مغربی تہذیب کے نشے میں بدمست ہوئے جاتے ہیں اور اس مغربی تہذیب کی عظمت کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں ـــــ وہ انسانی تاریخ سے چنداں واقفیت نہیں رکھتے۔

چنانچہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روئے ارض پر ابلیس نے کیسی خوں ریزی کروائی ہو گی کہ زمین خون سے بھر گئی۔ اور نسل آدم کے فنا ہو جانے کا خوف پیدا ہو گیا۔

مرحلۂ سوم :

ابلیس کی پوری کارروائی اپنے اندر بڑی ہمہ گیری اور نظم رکھتی تھی۔ چنانچہ پوری روئے زمین کی صورت حال کتنی فساد آلودہ اور ہولناک ہو چکی تھی اس کا اندازہ حضرت نوح علیہ السلام کی پوری حیات میں حق کی علمبرداری کے تعلق سے ان کی کوششوں کا جائزہ بخوبی پیش کرتا ہے اگر دیکھا جائے تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعاء بڑی معنی خیز ہے:

بد کردار سے بد کردار، ظالم سے ظالم اور گمراہ سے گمراہ قوم (واضح ہو کہ یہاں قوم سے مراد پوری نسل انسانی ہے) کا نبی کسی رحم دل ماں سے لاکھوں گنا زیادہ اپنی قوم کے بیٹوں کے لیے رحم دل ہوتا ہے اور یہاں تو پوری انسانیت کا معاملہ تھا۔ لیکن جب ایک نبی نے اور وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی نے یہ کہا ہو گا:

**وقال نوح رب لا تذر على الارض من الكٰفرين ديارا انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا إلا فاجرا كفارا.** (نوح :۲۶۔۲۷)

ترجمہ: اور کہا نوح نے اے رب! نہ چھوڑ یو زمین پر کفر کرنے والوں کا ایک گھر بسنے والا۔ بے شک اگر تو چھوڑ دے گا ان کو بہکائیں گے تیرے بندوں کو جو جنیں گے سو بد کردار کافر۔

یہاں "انك ان تذرهم ليضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا" بہت معنی خیز ہے۔ حضرت نوحؑ کیسے جان سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ بچ گئے تو صرف لوگوں کو گمراہ کریں گے اور ان

سے صرف فاجر اور کفار ہی پیدا ہوں گے۔ دراصل ابلیس نے اس ہمہ گیر فساد کے ذریعہ پوری نسل انسانی کو تقریباً کلی طور پر (Almost Entirely) فاسد (Contaminated) کر دیا تھا۔ یا تو زمین ان جباروں، نفلوں، الیوں، نفروں اور عفریتوں سے بھر گئی تھی یا جو دونوں جانب سے انسان تھے وہ بیشتر بے اصل، ولد الزنا اور غیر صالح تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری روئے ارض پر صرف چند نفوس قدسیہ باقی بچ گئے تھے۔ اس سے فساد کی ہمہ گیری اور ہر طرف پھیلے کشت و خون اور شرک و بدعملی و بداخلاقی اور بے حیائی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

چنانچہ پوری نسل انسانی کو بچانے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا پوری روئے زمین سے فساد کا خاتمہ۔۔ کسی نبی کی طرف سے عذاب عام کی دعاء اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی قبولیت معمولی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت عامہ سے الگ بات ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے جتنے غیر معمولی شرائط ہوں گے وہ سب پورے ہو گئے ہوں گے تب کہیں جا کر یہ دعاء قابل جواز بنی ہو گی اور قبول ہوئی ہو گی۔ چنانچہ قرآن نے اس ساری صورت حال کا نہایت وضاحت سے نقشہ کھینچا ہے:

> ہم نے نوح کو اس کی قوم (عالم انسانیت) کی طرف بھیجا کہ (اے نوح) اپنی قوم کو خبردار کر دے اس سے قبل کہ ان پر دردناک عذاب آ جائے۔ اس نے کہا "اے میری قوم! میں تمہارے لیے کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور یہ جو تمہیں ڈھیل دی جا رہی ہے یہ ایک مقرر مدت تک کے لیے ہے (چنانچہ) حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ کا مقرر کردہ وقت آ جائے گا تو ٹالا نہیں جا سکتا۔ کاش تمہیں اس کا علم ہوتا۔
>
> اس نے عرض کیا "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار کو اور بڑھایا، اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور اپنی عظمت و طاقت کے بڑے بڑے دعوے کیے۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی پھر میں نے علانیہ بھی ان کی تبلیغ کی پھر میں نے (ان کے فساد اور آنے والے عذاب کی حقیقت کو) عام لوگوں کے لیے علانیہ طور پر اور (خاص) لوگوں کے لیے ایک ایک کے پاس جا کر بیان کیا۔ سب سے کہا اپنے رب سے معافی مانگ لو بے شک (معافی مانگ لینے والوں کو) وہ ہمیشہ معاف کرتا رہا ہے۔"

ظاہر ہے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ حضرت نوح کی بات نہ مانی ہو گی بلکہ انہیں جھٹلایا اور ان کا جینا دوبھر کر دیا ہو گا۔ یہاں قرآن نے ایک نہایت لطیف بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مرحلۂ چہارم کے بعد ابلیس کے منصوبے کے دو بنیادی ستون تھے:

(۱) انفجار فساد نسل (Explosion of Genetic Perversion)

(۲) انفجار فساد علم (Explosion of Knowledge or Science Perversion)

چونکہ ان دونوں فسادات کی حالت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی بن گئی تھی اور ان فسادات کی بنیاد پر پورے کے پورے نظام حیات مرتب ہو گئے تھے۔ حکومتیں، ادارے، علمی مراکز، مجالس، معاشرتی آداب و قوانین سب کے سب انہیں فسادات کی بنیاد پر استوار ہو چکے تھے اور ان فسادات نے Civilization کا روپ لے لیا تھا لہٰذا جب حضرت نوح نے انتباہ کیا تو لوگوں کا عام تاثر یہی تھا کہ یہ فرسودہ باتیں ہیں اور کسی سنکی کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور یہ کہ انہیں بکنے دو۔ زندگی کی انفرادی ترقی اور اجتماعی ارتقاء کے لیے یہ امور جنہیں یہ شخص فسادات کہہ رہا ہے ایک حقیقت ہیں۔ انہیں بھلا کوئی کیسے چھوڑ دے۔ اور یہ کہ آج ساری ترقی انہیں لوازم کی جزء لاینفک ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"قال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم یزده ماله وولده الا خسارا۔" (نوح:۲۱)

ترجمہ: کہا نوح نے اے رب میرے! انہوں نے میرا کہنا نہ مانا اور مانا ایسے کا جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کی دعاء قبول فرمائی۔ اور اس 'مکر کبار' اور 'فساد عظیم' کے خاتمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ قرآن، احادیث اور دیگر صحائف سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارروائی دو۔ مرحلہ جاتی تھی۔ پہلے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ملائکہ کو بھیجا تاکہ وہ ان ملک ملائکۃ اور جن ملائکۃ کو جو ان فسادات کے مراکز تھے پکڑا جائے اور ان کو مقید کر دیا جائے۔

چنانچہ ان ملائکۃ ملک و جن کو حضرت جبرئیل اور میکال اور دیگر ملائکۃ نے گرفتار کر لیا اور اسی زمین یا اس کے اطراف میں انہیں مقید کر دیا۔

احادیث مبارکہ میں جن شیاطین کے بارے میں کہا گیا ہے اور انہیں دو مخصوص ناموں

سے درج کیا گیا ہے غالباً وہ یہی ملائکۃ ملک و جن ہیں۔ یہ دو نام ہیں:

(۱) الشياطين الملجمة عن الناس.

(۲) الشياطين المجلبة على الناس.

یہ وہی شیاطین ہیں جنہیں دجال اکبر کی آمد کے وقت آزاد کر دیا جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ملائکۃ نے ان تمام باغی ملائکۃ کو گرفتار کر کے مقید کر دیا۔ اور اس طرح زمین فساد کے ان آئمہ سے محفوظ ہو گئی۔

اس کارروائی کے بعد خاتمے کی دوسری کارروائی کا آغاز ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا:

**واصنع الفلك باعيننا ووحينا ولا تخاطبنى فى الذين ظلموا انهم مغرقون.** (ھود:۳۷)

ترجمہ: اور بنا کشتی روبرو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بے شک غرق ہوں گے۔

بلا شبہ "باعیننا ووحینا" میں معانی کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جس کا برائے نام ذکر بھی اس بحث کو مزید طول دے دے گا اس لیے اس سے صرف نظر کرنا ہی مناسب ہے۔ لیکن اس آیت میں ایک ایسی بات مضمر ہے جس کا تعلق اس کتاب کے مقصد تصنیف سے راست ہے، اس لیے ان شاءاللہ کتاب کے آخر میں ہم اس سے کچھ بحث کریں گے۔

چنانچہ عذاب آگیا اور جب پانی زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے لگا تو حضرت نوح تقریباً سو سے کم مومنین اور جانوروں کے جوڑوں کو لے کر کشتی پر سوار ہو گئے۔ قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

**حتى اذا جاء امرنا وفار التنور قلنا احمل فيها من كل زوجين اثنين واهلك الامن سبق عليه القول ومن آمن وما آمن معه الا قليل.** (ھود:۴۰)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا زمین نے کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم کا جوڑا دو عدد اور اپنے لوگوں کو مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے۔

اور جب سیلاب ختم ہوا اور اہل کشتی زمین پر اترے تو روئے زمین سے اس کشتی میں سوار لوگوں اور جانوروں کے سوا ہر مفسد اور فاسد کا خاتمہ ہو گیا تھا سوائے ان کے جن کو خود اللہ نے کسی مصلحت کے تحت مرنے سے بچالیا ہو۔

حضرت نوح کی دعا محض مفسدوں کے خاتمے کی تھی۔ انہوں نے سیلاب کی دعا نہیں کی ہو گی۔ عذاب، کے تعلق سے سنت اللہ بہت غور طلب ہے۔ اس سنت کی حقیقت پر تھوڑی بحث ان شاء اللہ اس جگہ ہو گی جب ہم حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ذریعہ یاجوج وماجوج کے خاتمے کے بعد آنے والے سیلاب پر بحث کریں گے۔

اس عذاب کے ذریعہ پوری روئے زمین پر پھیلے ہوئے فساد اور اس کے جینیاتی (Genetic) مفاسد سے جو واضح ہے کہ جانداروں اور انسانوں میں پوری طرح پھیل چکے تھے ـــــ زمین کو پاک کر دیا گیا۔ یہ فساد کتنا ہمہ گیر تھا کہ گویا اس کشتی میں محفوظ لوگوں اور جانداروں کے سوا ہر ذی روح فاسد ہو چکی تھی۔ اس سے اس کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرحلۂ چہارم کے بعد پیدا ہونے والا فساد کتنا مہیب تھا جس کو قرآن نے مکر کبار کہا ہے۔

گزشتہ صرف تین سو سالوں کے اندر (1687-2000A.D) جو فساد روئے زمین پر پیدا ہوا ہے اور جس نے آج پورے Biotic اور abiotic موجودات کو فاسد بنادیا ہے اس کا علم رکھنے والے حضرات اس فساد کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ابلیس نے پورے کرۂ ارض پر مافوق البشری سماوی قوتوں کے ذریعہ جو کائناتی جنگ عظیم چھیڑ رکھی تھی اور جس نے پورے کرہ کو فساد سے بھر کر وہاں کے ہر نظام کو تہہ وبالا کر دیا تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے کلی خاتمہ کر دیا۔ اس طرح مرحلۂ پنجم کا پہلا حصہ اختتام کو پہنچا جو ابلیس کے لیے بہت بڑی شکست تھی۔

یہ وہ دوسری عظیم فتح تھی جو آدم کی اولاد کو ملی اور دوسری بڑی شکست تھی جس سے ابلیس دوچار ہوا اور ہر دو جانب اس کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ جن کا مختصر جائزہ لینا برمحل معلوم ہوتا ہے۔

## ابلیس اور ابلیسی منصوبے پر اثرات:

ابلیس اور ابلیسی منصوبے پر اس شکست کے اثرات بڑے گہرے پڑے۔ چوتھے مرحلے میں

جو بنیادی اور دور رس اثر ـــــ ابلیس کے منصوبے پر پڑا وہ یہ تھا کہ ابلیس زیر زمین حیوانی قوتوں سے کائنات کے دور آخر یعنی الساعۃ کے مرحلے کی شروعات تک محروم کر دیا گیا اور اس کی یہ فوج معطل ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے ملائکۃ کو گمراہ اور انسانوں کے خلاف متحرک (Mobilise) کیا۔ چنانچہ مرحلۂ پنجم کا بنیادی پہلو ابلیس کو ملائکۃ کی ممکنہ قوت سے محروم کرنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کارروائی کا بنیادی مقصد ـــــ

(۱) باغی ملائکۃ سے ابلیس کو محروم کرنا اور ملائکۃ میں اس کے متحرک ہونے کا سدباب کرنا اور

(۲) ملائکۃ کے ذریعہ روئے زمین پر پیدا کردہ جینیاتی (Genetic) فساد کو ختم کرنا تھا۔

چنانچہ اس کارروائی کے ذریعہ ابلیس کو ملائکہ پر تصرف سے کم از کم الساعۃ سے قبل تک کے لیے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح ابلیس کے دو بازو اگر پوری طرح منقطع نہیں ہوئے تو کم از کم معطل ضرور ہو گئے۔ اور اسکی کارکردگی اور قوت کار میں واضح طور پر کمی آئی۔

## آدم اور منصوبۂ آدم پر اثرات :

مرحلۂ پنجم میں وقوع میں آنے والا یہ واقعہ آدم پر بھی غیر معمولی اثرات کا حامل ہوا۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) اہل کشتی کے سوا ساری روئے زمین انسانوں اور بری جانداروں سے خالی ہو چکی تھی۔ اب حضرت نوح اور باقیماندہ لوگوں کو ایک طرح سے روئے زمین پر از سر نو زندگی شروع کرنی تھی۔

(۲) بلاشبہ جو لوگ بچ گئے تھے وہ ان تمام مفاسد سے جو مرحلۂ چہارم کے بعد پیدا ہوئے تھے محفوظ تھے۔ لہٰذا روئے ارض پر ایک صالح جنیاتی عہد کا آغاز ہوا۔

(۳) مرحلۂ پنجم کے اس واقعہ تک کے تجربے نے اہل حق کو کچھ دور رس فیصلے کرنے کی طرف متوجہ کیا بلاشبہ یہ فیصلے اتنے اہم تھے کہ انہوں نے معرکۂ خیر و شر کو نیا بعد (Dimension) دے دیا۔ چنانچہ ان فیصلوں کا کیا جانا عمودی ارتقاء کے ساتھ ساتھ کمیاتی عروج (Vertical development with quantum Jump) بھی تھا۔

اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے چند حقائق کا جاننا ضروری ہے:

اب تک معرکۂ خیر و شر کا تجربہ یہ رہا تھا کہ آدم مرحلۂ اوّل سے مرحلۂ پنجم تک معمول محض کی طرح تھا۔ یعنی جنگ کی صورت یہ رہی تھی کہ ابلیس حملہ آور ہوتا تھا، حملے کے تعلق سے وہ کسی حدود کا پابند نہ تھا۔ وہ جیسے چاہتا، جب چاہتا اور جس ہتھیار سے چاہتا حملہ آور ہوتا اور دوسری طرف آدم کی حالت یہ تھی وہ صرف اپنا دفاع کرتا تھا۔ ظاہر ہے دفاع خود اپنی جگہ شکست ہے۔ طویل عرصے تک دفاع کرنے والا پیچھے ہٹتے ہٹتے بالآخر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر دیکھا جائے تو پہلے مرحلے میں وہ جن چیزوں سے لڑ رہا تھا اور جس موقف کو رد کر رہا تھا آخر میں اسی چیز کے لیے لڑنا اور اسی موقف کا دفاع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دفاع کرنے والے فریق کا یہی مقدر ہے۔ طویل عرصے تک دفع کرنا پہلے ہی مرحلے میں سمجھوتہ کر لینے سے زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ چنانچہ آدم کو اب تک کی جنگ میں اسی صورت حال کا سامنا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ آدم مستقل دفاع کرنے کے باوجود تدریجاً ہار تا جا رہا ہے۔

دوسری طرف اس دفاع نے آدم کی ساری صلاحیتوں کو دفاع کے محاذ پر جھونک دیا تھا اور طویل عرصے تک دفاع جھنجھلاہٹ پیدا کرتا ہے اور دفاع کرنے والوں میں کمزور اعصاب کے لوگوں میں دشمن کے لیے جذبات میں سرد مہری حتی کہ میلان تک پیدا کر دیتا ہے اور بعض لوگ دشمن سے ولایت قائم کرنے کو بھی برا سمجھنا تو دور کی بات ہے اسے ناگزیر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی صورت حال بنی آدم میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے افراد ابلیس کی طرف میلان رکھنے لگے تھے چنانچہ اس صورت حال نے بنی آدم کو مزید کمزور کر دیا۔ لیکن اس کا سب سے برا نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ دفاع ہی اصل حیات بن کر رہ گیا اور وہ بھی 'معمول محض' بن کر اور آدم کا وہ منصوبہ جو اس کا حقیقی منصوبہ ہو سکتا تھا یعنی اپنی سابقہ حیثیت کی بحالی (Restoration of Al-Jannah Status) اور خلافت کبریٰ کا حصول (Acquisition of Khilafat -e- Kubra) کلی طور پر طاق نسیان میں چلے گئے۔

# قوم نوح : مابعد طوفان : 5500 قبل مسیح

طوفان نوح میں بعض روایتوں کے مطابق چالیس شبانہ روز پانی زمین سے ابلتا اور آسمان سے برستا رہا اور ساری زمین پر تباہی ہی تباہی کا سماں تھا۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی تقریباً دس مہینوں تک پانی پر چلتی رہی گویا پوری روئے زمین تقریباً دس مہینوں تک ڈوبی رہی اور کشتی اس پر تیرتی رہی اور بالآخر ایک اونچی جگہ کسی پہاڑ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ قرآن نے اس پہاڑ کو جودی کہا ہے۔ 'جو یا جوئی' دراصل کسی بھی اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اونچی جگہ کوئی پہاڑ ہی ہو گی۔ اس کی تعیین نہیں کہ وہ اونچی جگہ کہاں واقع تھی۔ تاہم اس تعلق سے دو روایات پائی جاتی ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ جگہ آرمینیا میں کوہ ارارات (Ararat Mountains) کی کوئی چوٹی تھی یا وہ جگہ Urartu تھی۔ روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے حضرت نوح جنوب کی طرف بڑھے جو نسبتاً نشیبی علاقہ ہے اور اس طرح انسانی آبادی دجلہ و فرات کے ساتھ پھیلتے پھیلتے جنوبی عراق تک پہنچ گئی۔ اور چند سو سالوں کے بعد ایک نئی تہذیب کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے جو تقریباً ایک سے ڈیڑھ ہزار سال کے اندر اندر طوفان نوح میں تباہ ہو جانے والی تہذیب کی وارث بن کر ابھری۔ یہی وہ تہذیب ہے جس کے ابتدائی پانچ سو سال سے لے کر سات سو سال کو سمیری Sumerian اور بقیہ ہزار سال کو سمیری۔ عقادی (Sumero- Akkadian) تہذیب کہتے ہیں۔

طوفان نوح کے معاً بعد برپا ہونے والی تہذیب دراصل یہی سمیری (Sumerian) تہذیب ہے۔ جس کی وارث عقادی تہذیب ہوئی اور اس لیے اس تہذیب کو قرآن نے 'خلفاء من بعد قوم نوح' کے نام سے پکارا ہے۔

چونکہ مابعد طوفان نوح کا زمانہ عبوری ہے اس لیے یہاں صرف اس تبدیلی اور اس کے مضمرات کا ذکر زیادہ ضروری اور مفید ہو گا۔ حضرت نوح کے انتقال کے بعد عروج پذیر ہونے والی تہذیب کا ذکر مرحلۂ ششم کے ذیل میں ان شاء اللہ ہو گا۔

معرکۂ خیر و شر کی تاریخ میں حضرت نوح علی نبینا الصلوٰۃ والسلام اس اعتبار سے ایک

انقلاب لے کر آئے۔ وہ اس جنگ میں ایک موڑ (Turning Point) ثابت ہوئے۔ اگر ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت نوح دوبارہ مبعوث فرمائے گئے۔

ان کی پہلی بعثت کا مقصد اب تک کی مدت میں چلے آرہے معرکۂ خیر و شر کو جس میں خیر تقریباً مکمل تباہی کے دہانے پر آگیا تھا ثبت انجام تک پہنچانا اور اہل خیر کو مکمل تباہی سے بچالینا تھا۔

ان کی دوسری بعثت کا مقصد معرکۂ خیر و شر کے اگلے مرحلے میں اہل خیر کی از سر نو افزائش اور صف بندی، خیر کے پورے فلسفۂ جنگ کو از سر نو مرتب کرنا جس میں بنیادی مقصد صرف ابلیس سے دفاع کرنا ہی نہ ہو بلکہ رضائے حق کی تکمیل یعنی خلافت کبریٰ کے حصول کے لیے آدم کی حیثیت کی بحالی بھی ہو۔ ظاہر ہے یہی اللہ کی رضا تھی۔

قرآن کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سیلاب کو اور اس کے بعد کشتی میں بچالیے گئے اہل حق کے زمین پر اترنے کو الجنۃ سے آدم کا زمین پر اترنا قرار دیا۔ واقعہ اس سے مختلف بھی نہ تھا، زمین ہر طرح سے اسی طرح پاک کردی گئی تھی جیسی حضرت آدم کے زمین پر اترنے کے وقت تھی۔ چنانچہ قرآن نے کہا:

**قيل يٰنوح اهبط بسلٰم منا وبركٰت عليك وعلى امم ممن معك.**

(ھود : ۴۸)

ترجمہ: حکم ہوا اے نوح! اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔

چنانچہ حضرت نوح نے بعد سیلاب اسی نصب العین کے ساتھ کام کا آغاز کیا۔ اب معرکۂ خیر و شر میں خیر کا پورا فلسفۂ عمل کا خلاصہ درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) دفاع براہ اقدام : ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تک اس ابلیس کے تعلق سے بنیادی منہج

**يٰبنى آدم لا يفتننكم الشيطان كما اخرج ابويكم من الجنة .**

(الاعراف: ۲۷)

ترجمہ: اے اولاد آدم کی! نہ فتنہ میں مبتلا کرے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال باہر کیا تمہارے ماں باپ کو جنت سے۔

تھا۔ لیکن حضرت نوح نئی آبادکاری کے بعد اس میں اساسی تبدیلی کی طرف گامزن

ہوئے۔ اور اس فکر میں ایک اور بعد (Dimension) کا اضافہ ہو گیا۔ اور وہ بعد تھا الشیطان کو دشمن بنانے کا جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا ہے:

**ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا۔** (فاطر :٦)

ترجمہ: تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی بنالو اس کو دشمن۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ فیصلہ صرف اصولی حد تک تھا۔ عملی اقدامات کے لیے اس وقت اہل حق روئے زمین پر اس قوت کے مالک نہیں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصولی منہج جو مقرر کیا گیا بعد کے دنوں میں ترقی پذیر ہوا اور آنحضور ﷺ کی ذات اقدس پر درجہ کمال کو پہنچ گیا۔ اسی لیے قرآن نے اس پورے منہج کو اس طرح نوح سے شروع کر کے آنحضور ﷺ پر ختم کیا ہے کہ اس کا پورا نقشہ ارتقاء سامنے آجاتا ہے:

**"شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔**

(الشوریٰ :١٣)

ترجمہ: راہ ڈال دی تمہارے لیے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔

واضح ہو کہ اس آیت میں پہلے 'وصی بہ' اور 'اوحینا' پھر 'وصینا بہ' اور ان کے بعد، 'و' کے ذریعہ موسیٰ اور عیسیٰ کا عطف یہ محض الفاظ کی سجاوٹ نہیں بلکہ معانی کی ایک دنیا ہے جن میں خیر و شر کے اس جانگداز لڑائی میں گروہ خیر میں آنے والے ان عدیم النظیر مراحل کی نشاندہی کی جاتی ہے جو فیصلہ کن ہوئے۔ ہم اختصار کو مد نظر رکھنے کے سبب اس مرحلے میں ان پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں ممکن ہے ان میں کچھ باتیں اپنے اپنے محل پر زیر بحث آجائیں۔

(۲) بحالیٔ آدم کے اقدامات : لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی سب بڑی انقلابی کوشش دراصل بحالیٔ حیثیت آدم کے تعلق سے تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک کے تجربوں نے یہی ثابت کیا کہ بحالیٔ حیثیت آدم کے بغیر انسان کے لیے خلافت کبریٰ کا حصول تو بڑی بات ہے ابلیس کے مکر و کید سے، دفاع کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد حضرت نوحؑ کی سربراہی میں گروہ حق کی اوّلین ترجیح قرار پائی بحالیٔ حیثیت آدم۔

"اگر دقت نظر سے غور کیا جائے تو حضرت نوح سے حضرت ابراہیم تک بطور خاص اور حضرت عیسیٰ تک بطور عام گروہ حق کی بنیادی ترجیح بحالیٔ حیثیت آدم ہی رہی۔

اس طرح اس مرحلۂ پنجم کا اختتام حق کی فتح کے ساتھ ساتھ اہل حق کے طریقۂ جنگ میں عمودی اور انقلابی تبدیلی کے اجراء سے ہوا۔

# مرحلۂ ششم : ابلیس کے تہذیبی حملے کا دور : 4000 قبل مسیح

مرحلۂ ششم کا آغاز کئی اعتبار سے غیر معمولی اور نادر تھا۔ اگر مرحلۂ پنجم کا نام:

(۱) کائناتی شیطانی قوتوں کے ذریعہ روئے زمین پر آدمیت کے مکمل خاتمے کے لیے کائناتی جنگ کا عہد (Age of Cosmic War with Cosmic Satanic Forces for Total Annihilation of Mankind of Earth)

(۲) یا کل روئے زمین پر مکمل تباہی کا عہد۔ (Age of Total Earthly Landscape Annihilation) رکھا جائے۔

تو مرحلۂ ششم کا نام اس اعتبار سے:

(۱) تہذیبوں کے مکمل یا جزوی تباہی کا عہد (Age of Total and Partial Civilisation Annihilation) ہونا چاہئے۔ اگر اس مرحلۂ ششم کو اس طرح موسوم کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر معرکۂ خیر و شر کی صورت حال نچلے درجے (Scale down) پر کیسے آگئی۔

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے دونوں متصادم قوتوں کی صورت حال کا اندازہ کرنا ضروری ہے۔ جس نے اس جنگ کے درجے میں تبدیلی اور تصادم کی سطح کو کم کرنے میں براہ راست اثر ڈالا۔

## (۱) آدمی پہلو :

ہر چند کہ مرحلۂ پنجم میں آدمی کو کھلی کامیابی ملی تھی اور ابلیس کی سماوی فوج درہم برہم ہو گئی لیکن یہ مرحلہ آدم کے لیے بھی کم سنگین ثابت نہیں ہوا۔ پوری روئے زمین سے بلاشبہ فساد کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن خود بنی آدم کا بھی ان نفوس کو چھوڑ کر جو اس کشتی میں محفوظ رہ گئے تھے کلی صفایا ہو گیا تھا۔ اور گویا پوری روئے زمین پر انسانی معاشرت کی تشکیل کی شروعات از سر نو کرنی تھی

جسے (From the Scratch) کہتے ہیں۔

چنانچہ اپنی تمام نئی حکمت عملی کے ساتھ حضرت نوح نے طوفان کے بعد زندگی کے سفر کا آغاز از سر نو کیا۔ اور ہر چند کہ حضرت نوح طوفان کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو سال تک حیات رہے اور نو سو پچاس سال کی عمر میں انتقال فرمایا لیکن ان کی توجہ بنیادی طور پر درج ذیل امور پر مرتکز رہی:

(۱) زمین پر صالح نسل کی افزائش، آبادکاری اور اس کی تربیت۔

(۲) آدم کی سابقہ حیثیت کی بحالی کی کوشش۔

(۳) ابلیس کے مکر و کید سے دفاع۔

چنانچہ یہ وہ اسباب تھے جنہوں نے اس نئی صورت حال میں آدمی پہلو کو مشغول رکھا۔

**(۲) ابلیسی پہلو** : ابلیس مرحلۂ پنجم میں دو بار شکست سے ہمکنار ہوا تھا۔ اور اس بار اس کا دوسرا بازو معطل کر دیا گیا یعنی اس کی صدیوں کی محنتوں سے تیار کردہ ملائکۃ کی سماوی فوج کا گرفتار کر لیا جانا۔ اور اس تعلق سے ایسے انتظامات کار و بہ عمل آنا کہ آئندہ سماوی مدد سے ابلیس کا تقریباً محروم کر دیا جانا۔ زیر زمین حیوانی فوج اور سماوی ملکوتی فوج کے معطل کر دیئے جانے نے ابلیس کو بے حد کمزور کر دیا۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ پہلا راستہ مخلوقات جن کو جو آدم کی تخلیق سے پہلے آنے والے عذاب میں بچ گئے تھے اور اب ان ہزاروں سالوں میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی متحرک کرنا۔ اور دوسرے اس نئی آبادکاری کے بعد بڑھنے والی آدمی آبادی میں انسانوں جو ابلیس کے دام شر میں آگئے اور۔ یقیناً ان کی تعداد جنوں کے مقابلے میں گرچہ کم تھی متحرک کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح کے بعد آنحضور ﷺ کی بعثت تک معرکۂ خیر و شر میں شر کے دو پہلو ابھرے ہوئے ملتے ہیں:

(۱) جنوں کا اولیائی کردار

(۲) انسانوں کا ثانوی کردار

یہ ہیں وہ حالات جن میں مرحلۂ ششم کا آغاز ہوا اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ معرکۂ خیر و شر میں لڑائی کی سطح، قوت اور وسعت میں انحطاط (Scale down) آیا ہے جبکہ ایسا صرف ظاہر کے

اعتبار سے ہے۔ ورنہ اپنے اندرون میں یہ جنگ زیادہ، ہمہ گیر اور پیچیدہ ہو کر موت و حیات کی جنگ میں بدل گئی تھی۔

اس مرحلے میں ابلیس نے تمام بچے کھچے علوم، ہتھیاروں اور تجربوں کو جمع کیا اور ان دو طبقوں سے از سر نو اپنی فوج تیار کرنے کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اب اس نے دوہری حکمت عملی (Double Strategy) اختیار کی یعنی اپنی دونوں فوجوں کو خلط ملط کرنے کے بجائے بالکل الگ دو فوجوں کی شکل میں بلکہ دو نظاموں کی شکل میں انہیں ترتیب دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف Command Control کی سطح پر دونوں میں اس نے Coordination کا نظام قائم کر دیا۔ اس مرحلے کی دوسری سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اپنے تمام منصوبوں کے اعتبار سے انتہائی اختاکارانہ راستہ اختیار کیا۔ اس طرح چند ہی صدیوں کے اندر اندر معرکۂ خیر و شر بھی اپنے تصادم کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

چنانچہ مرحلہ ششم کو ہم چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو یکے بعد دیگرے تین تہذیبوں پر مشتمل ہیں۔ یہ تہذیبیں اس وقت کی انسانی دنیا میں نظام (Order) لے کر قائم ہوئیں اور جملہ انسانی آبادی پر ان کا نظام رائج ہوا پھر معرکۂ خیر و شر کے نتیجے میں یہ تہذیبیں شر کا ساتھ دینے کے سبب اپنے منطقی انجام کو پہنچیں۔ یہ تینوں عہد دراصل معرکۂ خیر و شر کے اس عہد کی نمائندگی کرتے ہیں جب پوری کی پوری تہذیب یعنی نظام (Order) فنا کر دیئے گئے چنانچہ مجموعی طور پر اس پورے عہد کو تہذیبوں کے کلی خاتمے کا عہد (Age of Total Civilization Ann hilation) کہا جا سکتا ہے۔

# پہلا تہذیبی معرکہ : عاد : 3500 قبل مسیح

## حضرت ھود علیہ السلام

مرحلۂ ششم میں معرکۂ خیر و شر ابلیس کی نئی حکمت عملیوں کی ساتھ شروع ہوا۔ چونکہ اب ابلیس کی حیوانی اور سماوی فوج معطل ہو کر رہ گئی تھی اس لیے اس نے اپنی حکمت عملی کو جنوں اور انسانوں کی بنیادوں پر از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کی اور اس طرح روئے زمین پر تہذیبوں کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل اس کی اس نئی حکمت عملی کا حصہ تھا جہاں اس نے آدم کو شکست دینے کے لیے ایسی حکمت عملی کی توسیع کرنا ضروری سمجھا جو زیادہ سے زیادہ ارضی اور انسانی (Earth-based & Human -based) ہو۔ چنانچہ اس کی کوشش کا ایک لازمی حصہ ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل بن گیا جو خدا کا دشمن، آدم کے بنیادی موقف اور خلافت کبریٰ سے ناآشنا بلکہ اس کا منکر اور ابلیس کا ہمنوا ہو۔ لہٰذا اس کے لیے اب اس نے ایسے معاشروں کی تشکیل پر زور دیا جن میں انہیں بنیادوں پر سارا نظام حیات تشکیل دیا جاتا ہو۔ جن کی تلخیص ذیل میں اس طرح درج کی جاسکتی ہے:

| | |
|---|---|
| (۱) خلافت کبریٰ مخالف | عقاید پر مشتمل معاشرہ |
| (۲) خلافت کبریٰ مخالف | عبادات پر مشتمل معاشرہ |
| (۳) خلافت کبریٰ مخالف | علوم پر مشتمل معاشرہ |
| (۴) خلافت کبریٰ مخالف | تولید پر مشتمل معاشرہ |
| (۵) خلافت کبریٰ مخالف | معاشرت یعنی طرز رہائش پر مشتمل معاشرہ |
| (۶) خلافت کبریٰ مخالف | ثقافت پر مشتمل معاشرہ |
| (۷) خلافت کبریٰ مخالف | علمی تخلیقات پر مشتمل معاشرہ |
| (۸) خلافت کبریٰ مخالف | کاروبار حیات پر مشتمل معاشرہ |
| (۹) خلافت کبریٰ مخالف | مال واکتساب مال پر مشتمل معاشرہ |
| (۱۰) خلافت کبریٰ مخالف | آداب پر مشتمل معاشرہ |

(۱۱) خلافت کبریٰ مخالف تصور آخرت پر مشتمل معاشرہ

چنانچہ طوفان نوح کے ذریعہ کی گئی صفائی اور تطہیر کے بعد جہاں ایک طرف حضرت نوح کے ذریعہ طاہر و مطہر انسانی معاشرے کی تشکیل کی عملی کوشش کی گئی اور پھر ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہزاروں کی تعداد میں ایسے انبیاء بھیجے جنہوں نے ہر انسانی آبادی میں جاکر انہیں خطوط پر صالح افراد اور صالح معاشروں کی تشکیل کی کوشش کی۔ وہیں ابلیس نے اس کے بالکل مخالف سمت میں نجس اور نجاس معاشرت کی تعمیر کی کوشش کی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام انسانی معاشروں میں انبیاء عموماً ہادی اور بشیر بنا کر بھیجے گئے اور جیسا کہ یہ بات عرض کی گئی کہ ایسے ہادی اور بشیر انبیاء کی تعداد ہزاروں میں ہے جو ہر جگہ اور ہر قوم میں تشریف لائے۔ قرآن نے ایسے ہی انبیاء کے متعلق فرمایا ہے:

(۱) **لکل قوم هاد.** (الرعد:۷)

ترجمہ: (دنیا کی) ہر قوم کے لیے ہادی بھیجے گئے۔

(۲) **ومارسلنا من رسول الا بلسان قومه لیبین لهم.** (ابراہیم :۴)

ترجمہ: اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر زبان بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ ان پر واضح کردے۔

لیکن تاریخ انسانی سے معلوم ہوتا ہے اور جس پر سب سے بڑی شہادت قرآن کی ہے کہ ابلیس نے اپنے مکر اور کید کا استعمال کر کے اہل حق کی زندگی روئے زمین پر اجیرن کردی۔ اور ان انسانی معاشروں کو فساد سے بھر دیا۔ اور روئے ارض پر ایسے معاشرے اور ان کا قائم کردہ نظام (Order) غالب آگیا جو آدمی کے بنیادی نصب العین کا مخالف تھا۔

یہی وہ گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے ایسے انبیاء بھیجے جو نذیر تھے۔ یہ وہ انبیاء ہوتے تھے جو کسی نظام کو جو فساد کی راہ پر چل پڑتا تھا متنبہ کرتے اور واپس خیر کی طرف بلانے کی کوشش کرتے۔ بے شمار انسانی معاشروں نے حق پر چل کر اور خلافت کبریٰ کے حصول کو اپنا مقصد حیات قرار دے کر زندگی بسر کی اور آدمیت کے اس عظیم مقصد سے وابستہ رہتے ہوئے اور انسانیت کی اس عظیم مہم میں پیش قدمی کرتے ہوئے نئے سنگ میل قائم کیے۔ لیکن وہیں چند معاشرے ایسے بھی ہوئے جنہیں ابلیس اچک لینے میں کامیاب ہوا اور ابلیس نے ان کی تشکیل فساد پیدا کرنے، فساد کو

پھیلانے اور پوری انسانیت کو تباہ کر دینے کے لیے کی۔ ظاہر ہے کہ ایسی تشکیل کی کوشش ابلیس کے خاص منصوبے کا حصہ تھی۔ لہٰذا اس نے اس طرح کی تشکیل میں اپنی حکمت کا، اپنے علوم کا جو اس نے حاصل کیے تھے اور تجربات کا جو اس معرکے میں اسے میسر آئے تھے بھرپور استعمال کیا۔ چنانچہ یہی دیکھا گیا کہ جب کوئی قوم ابلیس کے شکنجہ میں پوری طرح آگئی یا اس میں ابلیس نے وہ خصوصیتیں دیکھیں جو اس کے مشن کے اعتبار سے بڑی خوش آئند اور امید افزاء تھیں تو اس نے انہیں علو (Supermacy) کی راہ پر ڈالا۔ یہاں غور کرنے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام قومیں جو علو کی راہ پر گئی وہ دراصل وہ قومیں تھیں جو فساد کی طرف مائل ہو کر ابلیس کا آلہ کار بن گئیں۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو قوم قوم نوح کی وارث بن کر ابھری اور علو کی راہ پر گئی وہ قوم عاد تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوم عاد کون سی قوم تھی کب اٹھی اور اس کا عالمی نظام کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا؟ اور اس نے ابلیس سے وابستہ ہو کر روئے ارض پر کیا فساد برپا کیا؟

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قرآن نے جس قوم کو قوم عاد یعنی حضرت ھود علیہ السلام کی قوم کہا ہے وہ دراصل وہی قوم ہے جسے تاریخ میں عقاد (Akkad) قوم کہتے ہیں اور جس کی تہذیب کو (Sumero - Akkadian Civilization) یا مختصراً سمیری تہذیب Sumerian Civilization کہتے ہیں۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق اس قوم کا نام عاد دراصل عا+ا+د ہے۔ جو بنیادی طور پر Cunieform رسم الخط میں دو دو حرفوں کا مجموعہ ہے جسے بعض لوگوں نے Ak+Kad اور بعض نے Ag-ade پڑھا اور بعض لوگوں نے Ag-ade میں g کا وہ تلفظ کیا جو عموماً انگریزی کے علاوہ تمام یوروپی زبانوں میں رائج J کا تلفظ ہے یعنی ی اس طرح اس کا تلفظ Ay-ade ہوگا جو دراصل عاد یا عاد کا ہی دوسرا تلفظ ہے۔[۱۳]

قوم عاد ایسا لگتا ہے کہ بابل کے شمالی ضلع کے دارالسلطنت عاد کے نام سے مشہور ہوئی۔ واضح ہو کہ یہ قوم ایک سپرپاور تھی اور اس کا اقتدار مغرب میں مصر تک، شمال میں آرمینیا اور ایشیائے کوچک تک جنوب میں یمن تک اور مشرق میں دریائے سندھ تک تھا۔ اس عاجز کو پورا یقین ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب دراصل عاد کی تہذیب یا اس کی توسیع تھی۔

قرآن کی تصریح کے مطابق یہ قوم قوم نوح کے بعد برپا ہوئی۔ قرآن کا بیان ہے:

**اوعجبتم ان جاء کم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم**
**واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح وزاد کم فی الخلق بصطة.**
(الاعراف : ٦٩)

ترجمہ: کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک شخص کی زبانی جو تم ہی میں سے تھے تاکہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو جبکہ تم کو متقدر کر دیا پیچھے قوم نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ۔

یہاں تین باتیں قابل ذکر ہیں:

(۱) یہ پورا بیان اور اس کا اظہار متنبہ کرنے کے لیے ہے۔

(۲) اس میں قوم عاد کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ قوم نوح کی وارث ہے۔

(۳) اس میں اس قوم کو یہ بھی یاد دلایا گیا ہے کہ اسے اسی طرح اقتدار طاقت، اور ترقی ملی ہے جیسی قوم نوح کو ملی تھی۔

اس سے، جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس جگہ قوم نوح سے مراد طوفان نوح کے بعد ارتقاء پانے والی قوم قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ قوم نوح ہے جس میں حضرت نوح نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے اور یہ وہ قوم تھی جو بے پناہ طاقت و قوت اور علمی و فنی ترقی کی حامل تھی۔ اور بعد کی تاریخ نے گواہی دی ہے کہ یہ قوم اپنی اسی روش پر چلتی ہوئی بالآخر عذاب کا شکار ہو گئی۔

چنانچہ ہر اعتبار سے یہ کیمری عقادی قوم جسے قرآن نے قوم عاد کہا ہے قوم نوح یعنی وہ قوم جن کے الگ الگ ناموں میں سے ایک نام Atlantis بھی ہے کی ہم رتبگی حاصل کرنے لگی تھی۔ اور اسکی روش موجودہ اصطلاح میں Super Power بننے اور بنے رہنے اور اسی کے تعلق سے پوری روئے زمین پر خدا بن کر قہر ڈھانے کی ہو گئی تھی۔ اور یہی وہ وقت ہے جب حضرت ہود علیہ السلام اسے متنبہ کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔

یوں تو ابلیس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں فساد کا انفجار (Explosion of Perversion) کر دے لیکن اس میں بھی مختلف قومیں اپنی مخصوص کمزوریوں کے سبب، بطور خاص بعض فسادات میں خود اپنے اندر کے دیگر فسادات کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ابلیس نے قوم عاد میں عام فسادات

کے علاوہ وہ کون سا مخصوص فساد پیدا کیا جو اس قوم کی خصوصیت تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس کا ذکر کرتے ہوئے چند خاص باتوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔

(۱) **قال قد وقع علیکم من ربکم رجس۔** (الاعراف : ۷۱)

ترجمہ: کہا تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے گندگی کا عذاب۔

(۲) **وغضب** (الاعراف : ۷۱)

ترجمہ: اور غضب

(۳) **اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما نزل اللہ بھا من سلطان۔** (الاعراف : ۷۱)

ترجمہ: کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے قائدین نے نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند۔

(۴) **مالکم من الہ غیرہ۔ ان انتم الا مفترون۔** (ہود :۵۰)

ترجمہ: کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اس کے۔ تم سب جھوٹ کہتے ہو۔

(۵) **ما من دابۃ الا ھو آخذ بناصیتھا۔** (ہود: ۵۶)

ترجمہ: زمین پر رہنے والا ایسا کوئی نہیں جس کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔

(۶) **اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون۔** (الشعراء :۱۲۸)

ترجمہ: کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر یادگار فضول کاموں کے لیے۔

(۷) **وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون۔** (الشعراء : ۱۲۱)

ترجمہ: اور بناتے ہو بڑے کارخانے شاید تم امر ہو جاؤ۔

(۸) **واذا بطشتم بطشتم جبارین۔** (الشعراء :۱۳۰)

ترجمہ: اور جب (کمزوروں پر) پنجہ مارتے ہو تو پنجہ مارتے ہو جباروں کی طرح۔

(۹) **ان ھذا الا خلق الاوّلین۔** (الشعراء:۱۲۷)

ترجمہ: (اور ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں) یہی (شایان شان عمل یعنی) حصہ ہے ان کا جو سب سے آگے ہیں (یعنی سب سے بڑی طاقت کے مالک ہیں۔

ان تمام آیات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) وہ قوم سیاسی اور عسکری قوت کے اعتبار سے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اور سیاسی اور

عسکری سپر پاور تھی۔

(۲) علمی اور فنی یعنی سائنسی اور تکنیکی اعتبار سے وہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

(۳) وہ ایک صنعتی تہذیب تھی۔ یعنی Heavy Industries اور High tech نظام پر قائم تہذیب تھی۔

(۴) اس قوم کی حکومتوں، اہل کاروں اور لوگوں کی ذہنیت یہ ہو گئی تھی کہ ہر وہ کام جو وہ کریں جائز اور ٹھیک ہے اور ہر وہ کام جو ان کی مرضی کے خلاف یا ان کے حق میں نہ ہو وہ اپنی جگہ کتنا ہی درست جائز اور نیک کام کیوں نہ ہو غلط کام، جرم بلکہ دہشت گردی ہے۔ ہر وہ فیصلہ جو وہ اپنے مفاد میں کریں درست اور ہر وہ فیصلہ جس سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے ناجائز۔ جو ان کی مرضی کے خلاف کام کرے اس کے ساتھ رحم کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے۔ ایسی تمام اقوام پر وہ اپنے دیو ہیکل لاؤ لشکر لے کر پل پڑتے تھے۔

یہ تھی وہ صورت حال اور روش جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی نذیر کے اعتبار سے حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ آپ نے انہیں سمجھایا اور ان پر حجت پوری کر دی۔ لیکن وہ جس نشے میں چور تھے ان کی سمجھ میں صرف ایک بات آتی تھی کہ روئے زمین پر ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ کون ہے جو ان کی راہ میں پر مارنے کی بھی جرأت کرے؟

ظاہر ہے اس روش نے اس پورے علاقے کو بلکہ پوری روئے زمین پر جس پر یہ نظام (Order) نافذ تھا فساد سے بھر دیا ہو گا۔ ہر طرف ظلم ہی ظلم ہو گا۔ ابھی تو صرف اس فساد کا بطور خاص ذکر کیا گیا جو ان میں نمایاں تھا۔ ورنہ جہاں تک کل فساد کی بات ہے تو وہ ہمہ گیر تھا۔ چنانچہ نشے میں چور ایسے معاشرے کا وہی انجام ہوتا ہے جو اس کی تباہی سے پہلے سامنے آتا ہے لیکن وہ اسے دیکھ کر بھی نہیں چونکتا۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف حضرت ہود نے اشارہ کیا تھا۔ یعنی رجس اور غضب۔ موجودہ زمانے میں اگر اس کی مثال پیش کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح

(۱) پچھلی صدیوں میں ساری دنیا میں پلیگ اور طاعون کی وبا کا پھوٹ پڑنا ہوا۔

(۲) بیسویں صدی کے اوائل میں ملیریا، ٹی بی اور سرطان کا زور ہوا۔

(۳) بیسویں صدی کے اواخر میں پوری روئے زمین میں biotic اور abiotic فساد (Disorder) کی شروعات ہوئی اور Green house effect وغیرہ کے نتائج برآمد ہوئے۔

(۴) بیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں Aids کا پھوٹ پڑنا ہوا۔

(۵) بیسویں صدی کے ۹۰ کی دہائی میں تمام Anti-biotic ادویہ سے جراثیم کے Immune ہونے اور جسم کے React نہ کرنے کی شروعات ہوئی اور اب پھر ٹی بی، ملیریا، چیچک اور تمام وہ بیماریاں جو کل تقریباً ختم ہو گئی تھیں زیادہ قوی ہو کر عود کر آئی ہیں۔

پورے، کرۂ ارض میں عدم توازن برپا ہو گیا ہے اور موسم بدل گئے ہیں۔ جغرافیائی بے اعتدالیاں شروع ہو گئی ہیں اور جس کے سبب طرح طرح کی جغرافیائی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً: توسیع صحرا، (Expansion of Desert) ، سیم اور تھور کا بڑھ جانا (Salination of the Earth) اور

(۷) پورے کرۂ ارض سے پانی کی سطح کا نیچے چلا جانا وغیرہ۔

(۸) وہ فساد عظیم جو عنقریب Genetically Produced Food سے پیدا ہو گا جس کے مظاہر اب مغرب میں نظر آنے لگے ہیں۔

یہی وہ صورت حال تھی جس پر حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں متنبہ کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بالآخر اللہ کا عذاب آ گیا اور پوری تہذیب فنا کر دی گئی۔ آج بھی تاریخ دانوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ اس درجے کی اعلیٰ تہذیب جو علوم، سائنس، ٹکنالوجی اور، ایجادات اور عسکری قوت میں عدیم النظیر تھی۔ بیک جنبش وقت کیسے صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ قرآن نے اس پوری صورت عال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

**ولما جاء امرنا نجينا هودا والذين آمنوا معه برحمة منا ونجينا هم من عذاب غليظ وتلك عاد جحدوا بايٰت ربهم وعصوا رسله واتبعوا امر كل جبار عنيد۔ واتبعوا فى هذه الدنيا لعنة ويوم القيامة الا ان عادا كفروا ربهم الا بعد العاد قوم هود** (ہود: ۵۸۔۶۰)

ترجمہ: اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے اور اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچا دیا ان کو ایک بھاری عذاب سے اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں کے اور نہ مانا اس کے رسولوں کو اور مانا حکم ان کا جو جبار تھے دشمن اور پیچھے سے آئی ان کو اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن بھی سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے عاد کو جو قوم تھی ہود کی۔

# دوسرا تہذیبی معرکہ : ثمود : 2700 قبل مسیح

## حضرت صالح علیہ السلام

معرکۂ خیر و شر کے مرحلۂ ششم کا دوسرا تہذیبی معرکہ قوم ثمود نے برپا کیا۔ تہذیبی معرکے میں ابلیس کی حکمت عملی کا دوسرا آلہ کار اور نمائندہ قوم ثمود بنی۔ حکمت عملی کے لحاظ سے اپنی انفرادیت اور خصوصیت کے باوجود قوم ثمود قوم عاد کا مثنیٰ تھی جو خود قوم نوح کی مثنیٰ اور وارث تھی۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق یہ تہذیب ثمود وہی تہذیب ہے جسے تاریخ میں مصر کی پہلی تہذیب یا وادیٔ نیل کی تہذیب (The Nile Valley Civilization) بلکہ مخصوص طور پر عہد اہرام (The Pyramid Age) کہتے ہیں۔ جس کا زمانہ 3200 قبل مسیح سے 2500 قبل مسیح تک ہے اور اس کا نقطۂ عروج 2700 قبل مسیح سے لے کر 2500 قبل مسیح تک ہے۔ یہ وہی تہذیب ہے جس کا دائرۂ اقتدار مصر، جزیرۂ سینا مع مغربی شمالی جزیرۃ العرب، فلسطین، شام، ایشیائے کوچک، عراق کے جنوبی ساحل تک تھا۔ اور ان ایام میں جو اس تہذیب کا نقطۂ عروج تھا اس کا نظام (Order) ساری دنیا میں قائم تھا۔ قرآن نے ان کے تعلق سے جو تصریحات کی ہیں ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی صورت حال کیا تھی؟ اس نے فساد کی طرف کیسے رخ کیا؟ کیا کیا فسادات اس نے پیدا کیے؟ اور اس تہذیب کے خدوخال کیا تھے؟ قرآن کا بیان ہے:

(۱) **هو انشاكم من الارض واستعمر كم فيها.** (ہود: ۶۱)

ترجمہ: اسی نے برپا کیا تم کو زمین سے اور بسایا تم کو اس میں۔

(۲) **واذكرو اذجعلكم خلفاء من بعد عاد وبواكم فى الارض** (الاعراف : ۷۴)

ترجمہ: اور یاد کرو جب کہ تم کو عاد کے پیچھے (زمین کا) وارث بنادیا اور زمین میں تم کو مستحکم کر دیا۔

(۳) **تتخذون من سهولها قصورا.** (الاعراف : ۷۴)

ترجمہ: سطح زمین پر تم محلات بناتے ہو۔

(۴) وتنحتون الجبال بيوتا. (الاعراف :۷۴)

ترجمہ: اور پہاڑوں کو تراش کر گھر۔

(۵) وثمود الذين جابو الصخرة بالواد. (الفجر : ۹)

ترجمہ: اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشا پتھروں کو وادی میں۔

(۶) اتتركون فی ھٰھنا آمنين. فی جنت وعيون وزروع ونخل طلعها هضيم. (الشعراء: ۱۴۶۔۱۴۸)

ترجمہ: کیا چھوڑے رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بے کھٹکے، باغوں میں اور چشموں میں اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے۔

(۷) فاذكروا آلآ الله ولاتعثوا فی الارض مفسدين.

(الاعراف:۷۴)

ترجمہ: سو یاد کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین میں فساد۔

(۸) قال الملاء الذين استكبروا من قومه. (الاعراف:۷۵)

ترجمہ: کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں۔

(۹) ولا تطيعوا امر المسرفين الذين يفسدون فی الارض ولا يصلحون. (الشعراء:۱۵۱۔ ۱۵۲)

ترجمہ: اور نہ مانو حکم بے باک لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں زمین میں اور اصلاح نہیں کرتے۔

(۱۰) قالوا يٰصٰلح قد كنت فينا مرجواً قبل هذا. (ہود:۶۲)

ترجمہ: بولے اے صالح! تجھ سے تو ہم کو (بڑی) توقعات تھیں اس سے پہلے۔

(۱۱) انی لكم رسول امين فاتقوا الله واطيعون وما اسئلكم عليه من اجر. (الشعراء : ۱۴۳۔۱۴۵)

ترجمہ: میں تمہارے پاس اصل پیغام لانے والا ہوں۔ سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور نہیں مانگتا ہوں تم سے اس پر کچھ بدلہ۔

(۱۲) للذين استضعفوا لمن آمن منهم اتعلمون ان صٰلحاً مرسل من ربه قالوا انا بما ارسل به مؤمنون قال الذين استكبروا انا بالذی آمنتم به كٰفرون. (الاعراف:۷۵)

ترجمہ: کمزور کر دیئے گئے لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اس کے رب نے بولے ہم کو تو جو وہ لے کر آیا ہے اس پر

یقین ہے۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔

(۱۳) **ویقوم هذه ناقة الله لكم آية فذروها تاكل فى الارض الله ولا تمسوها بسوء فياخذكم عذاب قريب.** (ہود:۶۴)

ترجمہ: اور اے قوم! یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لیے نشانی سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین پر اور مت ہاتھ لگاؤ اس کو بری طرح پھر تم کو آپکڑے گا عذاب بہت جلد۔

(۱۴) **كذبت ثمود بطغوٰها اذا نبعث اشقها.** (الشمس:۱۱۔۱۲)

ترجمہ: جھٹلایا ثمود نے اپنی سرکشی سے جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بڑا بدبخت۔

(۱۵) **فكذبوه فعقروها** (الشمس:۱۴)

ترجمہ: پھر انہوں نے جھٹلایا اس کو پھر اس کو (اونٹنی) کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔

(۱۶) **فعقروها فاصبحوا نٰدمين.** (الشعراء : ۱۵۷)

ترجمہ: انہوں نے اسے کاٹ ڈالا ایکا کرے۔

ان تمام تفصیلات کو دیکھنے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) ثمود کو عاد کے بعد قوت اور غلبہ ملا اور وہ لوگ تقریباً ان تمام علاقوں پر چھا گئے جن پر کل عاد کا قبضہ تھا فرق یہ تھا کہ ان کی مرکزیت مصر میں قائم تھی۔

(۲) ثمود ایک بہت بڑی سیاسی قوت اور سیاسی انفراسٹرکچر کی حامل قوم تھی۔

(۳) ان کا عسکری اسٹرکچر، عسکری قوت اور ٹکنالوجی بہت ترقی یافتہ تھی۔

(۴) سائنس اور ٹکنالوجی میں اس قوم نے حیرت ناک ترقی حاصل کرلی تھی جس کا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے اور جس کا اعتراف آج بھی کرنا پڑتا ہے۔

(۵) اس تہذیب نے High-Tech Agro-Farming اور Higth-Tech Husbandry کا نظام قائم کر رکھا تھا۔

(۶) ان کے پاس High Tech Industrial Base تھا۔

(۷) انہوں نے High Tech Earth Movers & Architecture میں درجۂ کمال حاصل کرلیا تھا۔

(۸) یہ نظام صنعتی، زرعی اور Metro polis Culture کا نمونہ بن گیا تھا۔

(۹) اس نظام میں بہت بڑا دانش ورانہ قاعدہ (Intellectual Base) قائم ہو گیا

تھا۔

(۰) یہ ساری ترقیاں فساد کی طرف مہمیز کرنے والی ضرور بنیں لیکن فساد کا اصل محرک سیاسی اصولی مفکر (Political Theorists) بنے جنہوں نے اقتدار کے نشے میں ہونے والے مظالم کو سند جواز عطا کرنے کی کوشش کی۔

(۱۱) حضرت صالح علیہ السلام ان میں نبی نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ لیکن قرآن یہاں چند اور تفصیلات سے آگاہ کرتا ہے۔

(۱) حضرت صالح سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان میں ہادی انبیاء بھیجے اور انہوں نے پوری تفصیل سے ان کو حق پر قائم فلسفۂ حیات اور فلسفۂ کائنات (World Veiw) سمجھانے کی کوشش کی چنانچہ قرآن نے فرمایا:

(۱) **واما ثمود فهديناهم** (حم السجدہ :۱۷)

ترجمہ: اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتلائی۔

لیکن اس قوم کے غالب مفکروں اور اہل اقتدار اور ملاء نے اس ہدایت کو ماننے اور ان پر عملدرآمد سے انکار کر دیا: قرآن کا ارشاد ہے:

**فاستحبوا العمى على الهدى.** (حم السجدہ:۱۷)

ترجمہ: پھر ان کو خوش لگا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے۔

تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کے انجام بد سے باخبر کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی انبیاء نذیر بھیجے۔

(۲) **فان اعرضوا فقل انذرتكم صٰعقة مثل صعقة عاد وثمود اذ جاءتهم الرسل من بين ايديهم ومن خلفهم .** (حم السجدہ :۱۳۔۱۴)

ترجمہ: پھر اگر وہ ٹلائیں تو تو کہہ میں نے ڈراوا دے دیا تم کو ایک سخت عذاب کا جیسے عذاب آیا عاد اور ثمود پر۔ جب آئے ان کے پاس رسول آگے سے اور پیچھے سے۔

لیکن ان سب کے باوجود وہ فساد سے منہ موڑنے کو راضی نہ ہوئے اور شتر بے مہار کی طرح اپنی طاقت کے نشے میں اور بھی ہٹ دھرمی پر تل گئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کو فیصل نبی نذیر کے اعتبار سے مبعوث فرمایا۔ قرآن نے اس قوم کی نبض پر انگلی رکھتے ہوئے جائزہ لیا ہے:

(ا) للذین استضعفوا لمن آمن منهم. (الاعراف:۷۵)

ترجمہ: کمزور بنا کر رکھ دیئے گئے لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیب بنیادی طور پر دو طبقوں پر مشتمل تھی۔ عوام کی کثیر تعداد غلام بنا کر رکھ دی گئی تھی اور ایک طبقہ خواہ اس کا Denomination نسلی ہو یا مذہبی، لسانی ہو یا فکری اس پر طبقاتی بنیادوں پر غالب آگیا تھا۔ اور سارا فکری و عملی نظام اسی کا چل رہا تھا۔ ممکن ہے دیگر انبیاء جو ان میں بھیجے گئے ہوں وہ ان مظلوم طبقات کے لوگ ہوں جن کو اس غالب فکری طبقے نے رد کر دیا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح کو بھیجا۔ قرآن کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت صالح مقتدر طبقے سے بلکہ کسی بہت ہی اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے فرد تھے۔ ممکن ہے خود کسی شاہی گھرانے کا شہزادہ یا ولی عہد ہی ہوں۔ چنانچہ قرآن نے بیان کیا ہے:

قالوا یٰصلح قد کنت فینا مرجوا قبل هذا. (ہود: ۶۲)

ترجمہ: بولے کہ اے صالح! تجھ سے تو ہم کو توقعات تھیں اس سے پہلے۔

لیکن حضرت صالح نے صاف صاف کہہ دیا کہ کسی بات پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں فساد سے ہٹنا ہوگا۔ قرآن کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تنبیہ کو سیاسی مفکروں اور اہل اقتدار نے مفاد کے مسئلے کے اعتبار سے HighLight کرنا شروع کر دیا چنانچہ حضرت صالح نے پھر تنبیہ کی: 'إنی لکم رسول امین'۔ یہاں لفظ امین سے ایک اور بات کا اشارہ ملتا ہے۔ 'امین' کے اصلی معنی امانت دار نہیں ہیں۔ امانت دار اصطلاحی معنی ہے۔ 'امین' کے لغوی اور اصلی معنی ہے اصل جو نقل نہ ہو۔ صحیح جو جعلی نہ ہو۔ یعنی Original، Pure اس لفظ امین کو سمجھنے کے لیے ابلیس کی ایک Methodology کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس کا استعمال تاریخ انسانی میں اس نے کئی بار کیا ہے۔ اور آج بھی الگ الگ طریقوں سے کر رہا ہے۔ اس طریقہ کار کا نام ہے نقلی و جعلی تعیین کا طریقہ Dummy Identification Methodology-

حق اور مظہر حق مثلاً کسی نبی اور آج کسی تحریک حق یا قائد حق کے اعلان حق کے ساتھ ہی ابلیس ایک طریقہ یہ بھی اپناتا ہے کہ جہاں اس فرد، فکر یا تحریک کو جھٹلانے اور اسے مبنی بر غلط ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے وہاں اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ اسی وقت اسی طرح کے

الفاظ وبیان یا نعروں یا نصب العین کے ساتھ کئی اور لوگ یا افراد کے ذریعہ تحریکیں شروع کر دی جاتی ہیں جو بیشتر جعلی اور اہل ھویٰ کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو کنفیوژ کرنا اور نفس مسئلہ کو الجھا دینا اور اہل حق یا فرد حق کی انفرادیت کو مجروح، گدلا اور دھندلا کر دینا ہوتا ہے۔

جب انبیاء مبعوث فرمائے جاتے تھے تو انہیں صرف صریح اور علانیہ مخالفوں کا ہی سامنا نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے علاوہ اور ان سے زیادہ ان متنبیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو اس وقت اسی طرح کے دعوے کے ساتھ نمودار ہوتے تھے۔ متنبی اسی طریقۂ کار کی ایک واضح مثال ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب اللہ کے انبیاء اپنی امانت Originality کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ اور نفوس قدسیہ اس اعتبار سے ممتاز ہوتے تھے کہ وہ اس فرق کو سمجھ کر بغیر کنفیوژ ہوئے حق کی اطاعت کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت صالح کو بھی اسی صورت حال کا سامنا ہوا۔ چنانچہ آپ نے اعلان فرمایا کہ میں ان دعوے داروں کے مقابلے میں اصلی رسول ہوں۔

ملتے جلتے دعوؤں کے ساتھ وہ پروپیگنڈہ جو مفادات کے اعتبار سے کیا جارہا تھا بے اصل تھا چنانچہ اس کا جواب اس طرح دیا گیا:

"وما اسئلکم علیه من اجر۔ (الشعراء : ۱۴۵)

بالآخر حالات کے ارتقاء نے پورے نظام کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جسے بحران (Crisis) کہتے ہیں۔ اور اس کا سبب تھا وہ رویہ جس پر غالب طبقہ قائم ہو گیا تھا:

قال الذین استکبروا انا بالذی آمنتم به کٰفرون۔ (الاعراف:۷۶)

ترجمہ: کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے۔

یہ بحران پوری مستکبر قوم کو وہاں لے گیا جہاں فیصلہ کن مراحل کا آغاز ہو جاتا ہے! چنانچہ حضرت صالح نے فرمایا:

"ھذا ناقة الله" یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔

یہاں اس صورت حال کے لمحہ بہ لمحہ آگے جانے کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں لہٰذا اس آخری فیصلہ کن حصے کا مختصر جائزہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ پورے نظام کی حضرت

صالح نبی نذیر سے اس آخری نقطے پر ٹھن گئی اور اس ٹکراؤ کی ساری ذمہ داری ثمود پر تھی کہ یہ زمین یہ وسائل یہ خزانے اللہ کے ہیں یا حکومت کے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ضد میں حکومت نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسے عملی اقدامات کیے جن کا مقصد یہ ثابت کرنا ہوگا کہ زمین پر ان کا حکم چلتا ہے اللہ کا نہیں۔ یعنی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری تہذیب میں Anti-Allah اقدامات کا پوری شدت سے آغاز ہو گیا جس کے تحت ہر وہ حرمت توڑ دی گئی جو اللہ نے قائم کی تھی۔ ہر وہ حلت حرمت میں بدل دی گئی جو اللہ نے قائم کی تھی۔ اور بالآخر انہوں نے نبی کو یہ چیلنج دے دیا ہوگا کہ اگر یہ زمین اس کے دعوے کے مطابق واقعی اللہ کی ہے اور یہ کہ وہ بڑا قوت والا ہے تو اللہ، دکھائے کہ ان کے تمرد کے مقابلے میں وہ کیا کر سکتا ہے؟ اور یہی وہ مرحلہ ہوگا جب حضرت صالح کو اللہ نے یہ معجزہ عطا فرمایا ہوگا۔ بات اہم یہ نہیں کہ وہ اونٹنی تھی؟ کہاں سے اور کیسے پیدا ہوئی؟ کہاں سے آئی؟ اور کتنا پانی پیتی تھی؟ یہ سب افسانے بھی ہو سکتے ہیں۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ چیلنج اللہ کے اقتدار کو دیا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔

دو لوگوں میں طاقت کی کشمکش شروع ہو جائے اور بات بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ ایک شخص اس طرح دعویٰ کرے کہ میں جو چاہوں گا کروں گا دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ دوسرا کہہ دے اور کسی بھی بے حقیقت چیز کی طرف اشارہ کر کے کہہ دے مثلاً:

(۱) ذرا ایک قدم آگے بڑھا کر تو دیکھو تمہارے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔

(۲) ذرا اس پتھر کو ہاتھ لگا کر دکھا دو۔

(۳) ذرا اس کھیت سے ایک تنکا اٹھا کر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح اللہ نے حضرت صالح کو آگاہ کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے کسی اونٹنی کو یہ کہہ کر پیش کر دیں کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ ذرا کوئی اسے بری نیت سے چھو کر تو دیکھے۔ اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ پانی پیئے گی کوئی اسے روک کر تو دیکھے۔ یہ زمین اللہ کی ہے یہ اونٹنی اس پر گھاس چرے گی اور پیئے کھائے گی اور ذرا کوئی روک کر تو دیکھے چنانچہ دراصل اس معجزہ میں عجز یہ تھا کہ وہ بظاہر ایک عام اونٹنی تھی لیکن اللہ کے رسول نے اسے اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور جبروت کا نشان اور اسکی آیت بنا کر پیش کر دیا۔

اس عہد کے کافرین نے اپنے اقتدار کے نشے میں، اپنے سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت اور اپنے وسائل اور سطوت کے بھروسے پر اسے مذاق سمجھا۔ جب کہ اللہ کے رسول نے واضح کر دیا تھا:

فیاخذکم عذاب قریب۔ (ہود:۶۴)

ترجمہ: پھر تم کو آپکڑے گا عذاب بہت جلد۔

یعنی جو بھی اسے روکے گا یا چرنے نہیں دے گا یا اسے نقصان پہنچائے گا وہ عذاب کو دعوت دے گا اور ایسا کرنے کے فوراً بعد ہی عذاب آجائے گا۔

یہ بحران دراصل ایک طرف حضرت صالح اور اہل حق اور دوسری جانب حکومت اور مقتدر طبقے کے بیچ پیدا ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک چھوٹی سے آبادی کے سوا بقیہ لوگ الناس علی دین ملوکھم کی روش کے مطابق حکومت کے ہمنوا ہوں گے چنانچہ حکومت اور حکمراں طبقے کی ہم آہنگی اور فیصلے کے نتیجے میں ایک شخص نے اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اور اس اونٹنی کا مارا جانا تھا کہ اللہ کے رسول نے خبردار کیا:

تمتعوا فی داركم ثلاثة ايام ذلك وعد غير مكذوب۔ (ہود:۶۵)

ترجمہ: (تب کہا) فائدہ اٹھالو اپنے گھروں میں تین دن یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا۔

چنانچہ اللہ کا عذاب آیا اور پوری تہذیب فنا کر دی گئی۔ یہاں نہایت لطیف پہلو یہ ہے کہ اللہ کی نصرت اس آخری لمحے میں آئی جب زمین پر اہل حق کے لیے حیات کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب یا تو اہل حق کا وہ گروہ ختم ہو جاتا یا اس کے مخالف۔ چنانچہ قرآن نے اس لطیف بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

فلما جاء امرنا نجينا صلحا والذين آمنوا معه برحمة منا ومن خزی يومئذ ان ربك هو القوی العزيز۔ (ہود:۶۶)

ترجمہ: پھر جب پہنچا ہمارا حکم بچادیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بے شک تیرا رب وہی ہے زور والا زبردست۔

'ومن خزی یومئذ' نہایت معنی خیز ہے۔ اونٹنی کے چیلنج کے بعد ظلم کی جس چکی کے چلنے کا

آغاز ہوا تھا اس کی ہیبت ناکی کا انجام کیا ہوتا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس سے بچالیا۔ اور اس عظیم فاسد تہذیب کو جو اپنے اقتدار، طاقت اور ترقی کے نقطۂ کمال پر تھی بے نشان کر دیا۔

یہ دوسری قوم تھی جو قوم نوح کے بعد اس تباہی سے دوچار ہوئی۔

# تیسرا تہذیبی معرکہ : قوم لوط : 1800 قبل مسیح

## حضرت لوط علیہ السلام

معرکۂ خیر و شر کے مرحلۂ ششم کا تیسرا تہذیبی معرکہ قوم لوط کے فساد کی صورت میں سامنے آیا۔ ابلیس نے حکمت عملی کے اس نئے لائحہ کے تحت جس پر اس نے حضرت نوح کے بعد عمل درآمد شروع کیا تھا۔ ایک بار پھر جنسی انفجار (Sexual Explosion) کا تجربہ کیا۔ اس بار یہ تجربہ بنیادی طور پر مختلف الجہات مابین انسان جنسی انفجار تھا۔

یہ جنسی انفجار ایک نظام کی صورت میں برپا کیا گیا۔ ایسا سمجھنا کہ یہ صورت حال صرف اس شہر میں تھی جسے تباہ کر دیا گیا درست نہیں۔ بلاشبہ وہ بستی تباہ کر دی گئی اور یہ بھی درست ہے کہ وہ بستی اس کا مرکز تھی لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں کہ وہ وباء صرف وہیں پھیلی ہوئی تھی۔

قرآن نے اس نئے فسادی نظام کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے اس تہذیب کے حدود اربعہ کا پتہ چلتا ہے۔ جس طرح سیاسی استعماریت کی سرحدیں سیاسی ہوتی ہیں اور معاشی استعماریت کی سرحدیں معاشی ہوتی ہیں جو سیاسی سرحدوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اسی طرح تہذیبی، ثقافتی اور فیشن کی بھی سرحدیں ہوتی ہیں جو پوری طرح سیاسی اور معاشی سرحدوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسے آج کی ایک مثال سے سمجھیں۔

آج مغرب اور اس کے نظام کی مرکزیت امریکہ میں قائم ہے۔ چنانچہ امریکہ کی ایک سیاسی سرحد ہے جسے ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہتے ہیں۔ یہ سرحدیں ساری دنیا میں جہاں جہاں پائی جاتی ہیں ان سے پرے اس کی سیاسی حکومت نہیں۔ لیکن جہاں تک امریکہ کے معاشی نظام کی سرحدوں کی بات ہے وہ اس کی سیاسی سرحدوں سے بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اور ان دونوں سے زیادہ تہذیبی، ثقافتی اور فیشن کی سرحدیں وسیع ہیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیبی ثقافتی اور فیشن کی مملکت کے اعتبار سے امریکہ کے زیر نگیں آج کا سارا جہاں ہے۔

ٹھیک اسی طرح جب قوم لوط اور عمل قوم لوط کا ذکر کیا جائے تو یہ تصور کرنا کہ وہ ایک شہر یا ضلع کا معاملہ تھا درست نہیں یہ تصور اسے سیاسی سرحدوں میں مقید کر دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ چیز اس

سیاسی سرحد میں اپنے نقطۂ عروج پر پائی جاتی ہو گی لیکن اس تہذیب اور تہذیبی چلن کی سرحدیں اس وقت کی ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔

اس مقام پر آپ اس ریفرنس کو ملاحظہ کریں جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے بیان فرمایا تھا۔ یہ ریفرنس اس کا کھلا ثبوت ہے کہ جیسے کوئی آج میکڈانل یا پاپ یا پیپسی کی مثال دے، جو امریکہ سے نکلی ہیں اور جن کا مرکز امریکہ ہے لیکن یہ ساری چیزیں آج ساری دنیا میں امریکہ کے حوالے سے ہی سہی ہر جگہ پائی جاتی ہیں اور دراصل امریکی تہذیب کی سرحدوں کا تعین کرتی ہیں۔ جہاں جہاں میکڈانل یا پاپ یا پیپسی کا چلن ہے وہ سب ممکن ہے امریکہ کے سیاسی غلام نہ ہوں لیکن اس کی تہذیبی مملکت کے زیر نگین ضرور ہیں۔

ٹھیک اسی طرح قوم لوط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

**وما قوم لوط منکم ببعید.** (ہود:۸۹)

ترجمہ: اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں۔

جب ہم سدوم بستی یا شہر یا علاقے کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو غیر ارادی طور پر ہم اس کے دائرے اور اس تہذیبی انفجار کی ہولناکی اور شناعت کو معمولی کر کے دکھانے کے مرتکب بن جاتے ہیں۔ دراصل اس تہذیب اور اس میں پیدا ہونے والے جنسی انفجار کو اس کی تہذیبی سرحدوں کی تعیین کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔ تب کہیں جا کر ہم اس صورت حال کا صحیح اندازہ لگائیں گے کہ وہ تہذیب کتنی غالب، کتنی ہمہ جہت تھی اور اس نے کتنا بڑا فساد پیدا کر دیا تھا اور وہ کیوں اور کیسے تباہ کر دی گئی؟ بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (ان کا تذکرہ ان شاء اللہ تفصیل سے اپنے مقام پر آئے گا) کے عالمی لائحہ عمل (Mega-Program) کا وہ کون سا حصہ تھا جس میں حضرت لوط علیہ السلام سدوم بھیج دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کس منصوبے کے تحت حضرت لوط کو نبی نذیر کی حیثیت سے اس علاقے میں مبعوث فرمایا۔ اور کس طرح حضرت لوط نے اس فاسد نظام پر اللہ کی حجت پوری فرما دی۔

قرآن نے دنیا میں پھیلی اس پوری تہذیب میں جنسی انفجار کا جس طرح جائزہ لیا ہے اس کی تلخیص اس طرح پیش کی جا سکتی ہے:

**(۱) ولوطاً اذ قال لقومه اتاتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد**

من العلمین۔ (الاعراف:۸۰)

ترجمہ: اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے آگے نہیں ہوا کوئی اس میں جہان میں۔

(۲) انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النسلہ بل انتم قوم مسرفون۔ (الاعراف:۸۱)

ترجمہ: تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کے علاوہ بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

(۳) اتاتون الذکر ان من العلمین۔ (الشعراء :۱۶۶)

ترجمہ: کیا تم دوڑتے ہو جہان کے مردوں پر۔

(۴) وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عدون۔ (الشعراء: ۱۶۶)

ترجمہ: اور چھوڑتے ہو جو تمہارے واسطے بنادی ہیں تمہارے رب نے تمہارے جوڑوں میں بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

(۵) کذبت قوم لوط ن المرسلین اذ قال لھم اخوھم لوط الا تتقون۔ انی لکم رسول امین فاتقوا اللہ واطیعون وماسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین۔ (الشعراء:۱۶۰۔۱۶۴)

ترجمہ: جھٹلایا لوط کی قوم نے پیغام لانے والوں کو جب کہا ان کو ان کے بھائی لوط نے کیا تم ڈرتے نہیں۔ میں تمہارے لیے اصلی پیغام لانے والا ہوں سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو اور مانگتا نہیں میں تم سے اس کا کچھ بدلہ۔ میرا بدلہ ہے اسی رب العالمین پر۔

(۶) قالوا لئن لم تنتہ یلوط لتکونن من المخرجین۔ (الشعراء:۱۶۷)

ترجمہ: بولے اگر نہ چھوڑے گا تو اے لوط! تو تو نکال باہر کیا جائے گا۔

(۷) وما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون۔ (الاعراف:۸۲)

ترجمہ: اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکال باہر کرو ان کو اپنے شہر سے یہ لوگ بڑے پاک رہنا چاہتے ہیں۔

(۸) قال انی لعملکم من القالین رب نجنی واھلی مما یعملون (الشعراء: ۱۶۸۔۱۶۹)

ترجمہ: کہا میں تمہارے کام سے البتہ بیزار ہوں۔اے رب! خلاص کر مجھ کو اور میرے لوگوں کو ان کاموں سے جو یہ کرتے ہیں۔

(۹) فلما جاء آل لوط ن المرسلون. (الحجر:۶۱)

ترجمہ: پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے۔

(۱۰) قال انکم قوم منکرون. (الحجر:۶۲)

ترجمہ: بولا تم لوگ اجنبی سے لگتے ہو!

(۱۱) ولما جاء ت رسلنا لوط سیئی بھم وضاق بھم ذرعاً وقال ھذا یوم عصیب. (ہود:۷۷)

ترجمہ: اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا ان کے آنے سے اور تنگ ہوا دل میں۔اور بولا آج دن بڑا سخت ہے۔

(۱۲) وجاء ہ قومہ یھرعون الیہ ومن قبل کانوا یعملون السیات. (ہود:۷۸)

ترجمہ: اور آئی اس کے پاس قوم اس کی دوڑتی بے اختیار اور آگے سے کر رہے تھے برے کام۔

(۱۳) قال یقوم ھولاء بناتی ھن اطھر لکم فاتقوا اللہ ولا تخزون فی ضیفی. الیس منکم رجل رشید.(ہود:۷۸)

ترجمہ: بولا اے لوگو! کیا میری بیٹیاں نہیں ہیں؟ وہ تمہارے لیے زیادہ پاک ہیں۔سو ڈرو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں میں۔کیا تم میں کوئی بھی بھلا مانس نہیں۔

(۱۴) قالوا لقدعلمت مالنا فی بنتك من حق وانك لتعلم ما نرید. (ہود:۷۹)

ترجمہ: بولے تو جانتا ہے ہم کو۔تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں۔اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں۔

(۱۵) قال لو ان لی بکم قوۃ او آوی إلی رکن شدید(ہود:۸۰)

ترجمہ: کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلے میں زور ہوتا یا جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔

(۱۶) قال یلوط انا رسل ربك لن یصلوا الیك. (ہود:۸۱)

ترجمہ: مہمان بولے۔اے لوط! ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے۔وہ

ہر گز تجھ کو نہ پہنچ سکیں گے۔

(۱۷) **قالوابل جئنك بما كانوا فيه يمترون وآتينك بالحق وانا لصٰدقون.** (الحجر:۶۳)

ترجمہ: بولے نہیں پر ہم لے کر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں وہ جھگڑتے تھے۔اور ہم لاتے ہیں تیرے پاس پکی بات اور ہم سچ کہتے ہیں۔

(۱۸) **فاسر با هلك بقطع من الليل ولا يلتفت منكم احدا الا امراتك انه مصيبها ما اصابهم ان موعدهم الصبح اليس الصبح بقريب.** (ہود:۸۱)

ترجمہ: سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں کوئی۔ مگر عورت تیری کہ اس کو پہنچ کر رہے گا جو ان کو پہنچے گا۔ان کے وعدہ کا وقت ہے صبح۔کیا صبح نہیں قریب۔

(۱۹) **فاسرباهلك بقطع من الليل واتبع ادبارهم ولا يلتفت منكم احد وامضوا حيث تؤمرون.** (الحجر:۶۵)

ترجمہ: سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات رہے سے۔اور تو چل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی۔اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے۔

(۲۰) **وقضينا اليه ذلك الأمر ان دابر هٰؤلاء مقطوع مصبحين.** (الحجر:۶۶)

ترجمہ: اور مقرر کر دی ہم نے اس کو یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے۔

(۲۱) **وجاء اهل المدينة يستبشرون.** (الحجر:۶۷)

ترجمہ:اور آئے شہر کے لوگ خوشیاں مناتے۔

(۲۲) **قال ان هٰؤلاء ضيفي فلا تفضحون واتقوا الله ولا تخزون.** (الحجر:۶۹)

ترجمہ: لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں سو مجھ کو رسوا مت کرو اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھوؤ۔

(۲۳) **قالوا اولم ننهك عن العٰلمين.** (الحجر:۷۰)

ترجمہ: بولے کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا جہاں کی حمایت سے۔

(۲۴) **قال هٰؤلاء بناتي ان كنتم فٰعلين.** (الحجر:۷۱)

ترجمہ:بولا کیا میری بیٹیاں نہیں اگر تم کو کرنا ہے۔

(۲۵) لعمرك انهم لفی سکرتهم یعمهون.(الحجر:۷۲)

ترجمہ: قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں۔

(۲۶) فاخذتهم الصیحة مشرقین فجعلنا عالیها سافلها وامطرنا علیهم حجارة من سجیل.(الحجر:۷۳۔۷۴)

ترجمہ: پھر آپکڑا ان کو چنگھاڑ نے پو پھٹتے وقت پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے ان پر پتھر کنکر کے۔

(۲۷) فلما جاء امرنا جعلنا عالیها سافلها وامطرنا علیها حجارة من سجیل منضود مسوّمة عند ربك وما هی من الظٰلمین ببعید. (ہود:۸۲۔۸۳)

ترجمہ: پھر جب پہنچا حکم ہمارا۔ کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر نیچے۔ اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے۔ تہ بہ تہ نشان کیے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور۔

(۲۸) فانظر کیف کان عاقبة المجرمین (الاعراف:۸۴)

ترجمہ: پس دیکھ لو کیسا ہوا انجام مجرموں کا۔

(۲۹) وماکان اکثرهم مومنین. (الشعراء:۱۷۴)

ترجمہ: اور ان میں سے اکثر ایمان والے نہ تھے۔

اس پوری تفصیل سے اس تہذیب، اس کے فساد اس کی خباثت، وسعت، ہولناکی اور اس کے علمبرداروں کے بے قابو ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جس کی تلخیص اس طرح کی جاسکتی ہے:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اللہ کے حکم سے حضرت لوط علیہ السلام اس تہذیب کے مرکز کو بھیجے گئے جو اس وقت کی دنیا میں جنسی انفجار کا امام بنا ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی بعثت عظیمہ کے وسیع تر لائحۂ عمل کا حصہ تھا (لہٰذا فی الواقع اس پر بحث حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عنوان کے ذیل میں ہونی چاہئے تھی لیکن بوجوہ اس کا بیان یہاں کیا جارہا ہے، تاہم اسے اس مقام پر وہاں کے Paradigm میں بھی رکھ کر دیکھنے کی ان شاء اللہ سعی ہوگی) لیکن چونکہ اس معاملے نے تباہ کن صورت حال اختیار کرلی اور بالآخر یہ تہذیب تباہ کن انجام (Disastrous Show-down) سے دوچار ہوگئی اس لیے

حضرت ابراہیم کے ذیل میں بیان ہونے کے باوجود اسے الگ مقام دے دیا گیا اور اب اس کا شمار ابلیس کے ان معرکوں میں ہوتا ہے جو تہذیبی معرکے کہلاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے ہر جگہ اسی طور اس کا ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ یہ ساری بعثت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم بعثت کا حصہ تھی اس لیے آخری فیصلہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا اور آپ نے اس پر ملائکہ سے مجادلہ فرمایا:

(۱) **ولقد جاء ت رسلنا ابراهيم بالبشرى قالوا سلما قال سلام فما لبث ان جاء بعجل حنيذ. فلما راه ايديهم لا تصل اليه فنكر هم واوجس منهم خيفة قالوا لا تخف انا ارسلنا إلى قوم لوط.** (ہود:۷۰۔۶۹)

ترجمہ: اور بے شک پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے۔ سلام۔ وہ بولا سلام ہے۔ پھر دیر نہ کی اور لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا۔ پھر جب دیکھا کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا۔ وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی۔

(۲) **فلما ذهب عن ابراهيم الروع وجاء ته البشرى يجادلنا فى قوم اوط ان ابراهيم لحليم اواه منيب.** (ہود:۷۵۔۷۴)

ترجمہ: پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اس کو خوش خبری جھگڑنے لگا ہم سے قوم لوط کے حق میں۔ البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا۔

(۳) **يا ابراهيم اعرض عن هذا انه قد جاء امر ربك وانهم آتيهم عذاب غير مردود.** (ہود:۷۶)

ترجمہ: اے ابراہیم! چھوڑ یہ خیال وہ تو آچکا حکم تیرے رب کا اور ان پر آتا ہے عذاب جو لوٹایا نہیں جاتا۔

(۲) تمام کوائف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فساد کی صحیح شکل یہ تھی کہ یہ ایک عالمی جنسی انفجار کا فساد تھا۔ جس کا مرکز وہ علاقہ تھا جو فنیقی (Phoenecia) کہلاتا تھا۔

(۳) اس فساد کی جڑ میں حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت اور اس کی بنیاد پر آئی ہوئی مالی خوشحالی تھی۔ اس خوشحالی نے جنسی بے راہ روی کے نئے نئے طریقے وضع کرائے۔ اور یہ فنیقی تجار اور اہل ثروت اس بے راہ روی کو ہر چہار طرف پھیلاتے تھے۔

(۴) یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ جنسی بے راہ روی کے چند مخصوص طریقوں سے اس تہذیب کو منسوب کرنا لاعلمی اور عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ چونکہ اس بے راہ روی اور آزاد پسندی کا محور جنس تھا اور اس کے جتنے فساد (Perversion) ہو سکتے تھے وہ سب اس کے ذیل میں آتے ہیں اسی لیے وہ سارے طریقے اس تہذیب کا لازمہ تھے۔ چنانچہ عمل قوم لوط سے محض اغلام بازی یا اس سے آگے جاکر بعض لوگوں کی تعبیر کے مطابق مساحقت سمجھنا اسے بہت سادہ (Oversimplified) بنانا ہے۔

عمل قوم لوط اس پورے جنسی انحطاط (Sexual Perversion) کو کہتے ہیں جو انسانی تصور میں آسکتا ہے۔ مثلاً اگر صرف امہات انحطاط ہی لیے جائیں جن میں فی کس بیس سے زائد قسمیں تاریخ انسانی میں رائج رہی ہیں تو وہ خود بیس سے زائد ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

(۱) Nudity: یہ فساد اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Passive، Active، Pro-active اور Aggressive قسمیں کل ملا کر 100 سے زائد تاریخ انسانی میں ابلیس نے رائج کی ہیں۔

(۲) Pornoism: یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے اور صرف یونان قدیم اور بھارت کی قدیم اور وسطی تہذیب نے اس کی بلا مبالغہ سینکڑوں قسمیں رائج کی ہیں۔

(۳) Homosexuality (M) : یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Passive، Active، Pro-Active اور Aggressive قسمیں بھی پچاس سے زائد ہیں۔

(۴) Homosexuality (F) : یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کے Passive، Active، Pro-Active اور Aggressive قسمیں پچاس سے زائد ہیں۔ Lesbianism اور Sapphism اسکی صرف دو قسمیں ہیں۔

(۵) Permissiveness : یہ فساد بھی اپنے آپ میں ایک کلیات کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بیسیوں قسمیں ہوا کرتی ہیں۔

(۶) Oral Sexuality: یہ فساد بھی ہمہ جہت اور بعض صورتوں میں جارح فساد ہے۔

(۷) Bestiality: یہ فساد بھی ہمہ جہت ہے اور بعض صورتوں میں متعدی اور جارح بھی ہو جاتا ہے۔

(۸) Child-Sexuality: اس فساد سے مراد وہ جنسی فساد ہے جس میں معصوم بچوں اور بچیوں پر ظلم ہوتا ہے۔

(۹) Necro-Sexuality: یہ اپنی نوعیت کی ایک الگ قسم ہے جس کے طرح طرح کے مظاہر ہیں۔

(۱۰) Vision Sexuality : یہ نہایت متعدی قسم کا فساد ہے جس کی ایک جارح موجودہ قسم Peeping ہے۔

(۱۱) Contact Sexuality : یہ قسم نمبر ۱۰ سے زیادہ جارح اور متعدی ہے۔

(۱۲) Fetishism : جنسی فساد کی یہ بھی ایک قسم ہے جو متعدی ہے۔

(۱۳) Opposite Sex-adaptation : جنسی بے راہ روی کی یہ متعدی، جارح اور ہمہ جہت قسم ہے جس کے چند مظاہر یہ ہیں کہ مرد عورتوں کے اور عورت مردوں کے لباس اور وضع قطع میں رہیں۔ مرد ناخن رنگین اور زیور پہنیں، عورتوں کا خوشبو استعمال کریں اور عورت مردوں کی طرح رہیں۔ عورت اس کی دوڑ میں Amazonian بن جائے اور مرد نازک اندام۔

غرض قرآن نے جب قوم لوط کا تذکرہ کیا ہے تو وہ تذکرہ کسی ایک یا دو عمل کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک جنسی انفجار کی مرتکب قوم بلکہ تہذیب اور نظام کا تذکرہ ہے۔ اور جب کسی تہذیب کی تباہی اور اس کے علمبرداروں پر حجت پوری کرنے کا ذکر کیا ہے تو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنسی طور پر انفجار کی مرتکب قوم کس درجہ متمرد ہو جاتی ہے اور اس کا رد یہ کیسا ہوتا ہے۔

(۵) قرآن کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر کن حالات میں ابلیس کے لیے کسی قوم کو جنسی انفجار میں مبتلا کرانا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور جب یہ انفجار ہو جاتا ہے تو کس طرح لوگ پاگل ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ کیسی ہی خیر خواہی کیوں نہ کی جائے اور کتنے ہی بھلے اور عقلی، منطقی، اخلاقی اور مخلصانہ طریقے سے سمجھایا ہی کیوں نہ جائے عام طور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور تباہی آکر رہتی ہے۔

(۶) وہ قوم قوم لوط اس لیے کہلائی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عالمی بعثت ہوئی تو جہاں ابلیس نے ان کے خلاف بیسیوں محاذ کھولے ان میں ایک محاذ پورے عالم میں جنسی انفجار کا بھی تھا۔ چونکہ یہ معاملہ بے حد سنگین تھا اس لیے آپ نے بطور خاص اس کی روک تھام کے لیے اور اسکے نتیجے میں آنے والی تباہی سے بچانے کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کو اس کے مرکز میں بھیجا۔ ورنہ حضرت لوط علیہ السلام تو سدوم کے رہنے والے نہ تھے۔ حضرت لوط نے وہاں جاکر لوگوں کو سمجھانے اور اس فساد سے باز رکھنے کی پوری کوشش فرمائی۔ اور ایک نبی نذیر ہونے کی پوری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے۔ ہر چند کہ اس قوم کے رویئے سے ایسا پورا پورا اندازہ ہوتا تھا کہ اب صورت حال فیصلہ کن بحران کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ان پر حجت پوری ہو گئی ہے اور وہ اب حضرت لوط کی جان کے درپے ہو چکے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا تھا۔ صورت واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام دونوں ہی اولوالعزم انبیاء ثابت ہوئے اور حتی الوسع اس سے گریز کیا کہ ان کی تباہی کی دعا فرمائیں۔ تاہم سنت الٰہی میں ان پر حجت پوری ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر لیا تھا۔

(۷) یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن نے انہیں کافر کہا ہے۔ یہ ایک قول فیصل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے باوجود بھی کسی کا ابلیس کے پیدا کردہ فساد کا علانیہ یا خفیہ علمبردار، شریک یا آلہ کار ہونا خواہ وہ مال کا فساد ہو یا جنس کا یا قوت و اقتدار کا۔ من حیث المجموع اس کو کافر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آج جو لوگ مغربی فساد فکر، فساد مال، فساد ثقافت، فساد حکومت و اقتدار، فساد جنس، فساد اکل و شرب یا فساد لباس کے علمبردار، شریک یا آلہ کار ہیں وہ خواہ عالم اسلام کی مدقوق فقہی چوکھٹے میں مومن و مسلم شمار ہوتے ہوں لیکن عنداللہ وہ شاید ہی مومن و مسلم ٹھہریں گے یہی صورت حال اداروں اور حکومتوں کی بھی ہے۔

# چوتھا تہذیبی معرکہ : قوم شعیب : 2100 قبل مسیح

## حضرت شعیب علیہ السلام

معرکۂ خیر و شر کے مرحلۂ ششم کا چوتھا تہذیبی معرکہ اپنے ماقبل دو تہذیبی معرکوں سے قدرے مختلف ہے۔ قرآن نے اس کو قوم شعیب کے نام سے پکارا ہے۔ یہ قوم شعیب کون تھی؟ چونکہ قرآن میں اس کی ترتیب اور ناموں کی یکسانیت اور سب پر مستزاد ہمارے مفسرین کی تفسیری بے اعتدالیوں نے اس قوم کے تعلق سے چند در چند غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ لہٰذا اب اس حصے کی تفسیر ایسی کی جاتی ہے جن کا سمجھنا اور کم از کم ان لوگوں کے لیے سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے جو دنیاء تاریخ سے گہری واقفیت بھی رکھتے ہوں۔

اس تہذیب میں معرکۂ خیر و شر کو پیش کرنے کے تعلق سے اس سے بہتر صورت کوئی دوسری نہیں ہو سکتی تھی جسے اللہ رب العزت نے قرآن میں اختیار کیا ہے۔ عاد اور ثمود کی طرح اسے کوئی نام دینے کے بجائے قرآن نے بہتر سمجھا کہ قوم نوح اور قوم ابراہیم کی طرح اس تہذیب کو قوم شعیب کہا جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس تہذیب کی چھوٹی سے چھوٹی اور دقیق سے دقیق پہلو پر قرآن کتنی جامعیت اور اٹل طریقے سے گرفت رکھتا ہے۔ کلام اللہ کا یہی تو اعجاز ہے جس کا ہمارے یہاں بارہ سو سالوں سے رائج علوم القرآن اور بطور خاص اصول تفسیر نے جنازہ نکال دیا ہے۔

اس عاجز کی تحقیق کے مطابق قوم شعیب دراصل اس پورے نظام کے حاملین کو کہتے ہیں جسے موجودہ تاریخ ناقص طریقے سے یونان کی تہذیب (Greek Civilization) کے نام سے پکارتی ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام پہلوؤں کی علمی اور تجزیاتی تقریر کی یہاں گنجائش نہیں لہٰذا یہاں صرف ناگزیر باتیں ہی عرض کی جا سکتی ہیں (اس کی تفصیل عالم اسلام کی منصبی اور مقصدی صورت حال میں ملاحظہ فرمائیں)

اس تہذیب کی خصوصیات میں تین باتیں داخل ہیں۔

(۱) تہذیبی تسلسل کے باوجود مقام کی بار بار تبدیلی

(۲) تہذیبی تسلسل کے باوجود غالب اقوام کی تبدیلی

(۳) تہذیبی تسلسل کے باوجود زبان و ثقافت کی تبدیلی

اس لیے اس تہذیب کو کسی مقام، قوم یا زبان سے موسوم کرنا درست نہ ہوتا۔ چنانچہ اس تہذیب کی یہی وہ نزاکت ہے کہ قرآن نے اس کے نام کو اس نبی نذیر سے منسوب کر دیا جو ان میں بھیجے گئے۔ اس صورت میں اس تہذیب کا زمانہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سرنامے پر جو تاریخ درج ہے وہ دراصل اس کی ابتدائی تاریخ ہے۔ اس تہذیب کی توسیع تقریباً 360 قبل مسیح تک ہوتی ہے۔ اور اس میں بیس سے زائد فیصلہ کن موڑ آتے ہیں۔ لہٰذا قرآن نے پوری تہذیبی صورت حال کو ایک نام دیتے ہوئے اسے ایک نبی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ہر چند کہ اس کو ظاہر کرنے کے لیے کہ تباہی کی جس صورت حال کا جائزہ قرآن لے رہا ہے وہ بعد کے ادوار سے الگ ہے واضح ہو کہ یہ تباہی ابتدائی عہد میں آئی ہے۔ اس کے ذیل میں قرآن دو ذیلی ادوار اور ایک تجزیہ کے مطابق تین ذیلی ادوار کا تذکرہ کرتا ہے۔ یعنی قرآن جس قوم کو قوم شعیب کہتا ہے اس میں دو یا تین مزید ناموں کو شامل کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) اصحاب لئکة

(۲) قوم تبع

(۳) اصحاب الحجر

جس بات نے ہمارے مفسرین کو پہلے پریشان کیا اور پھر نہ سمجھنے کی صورت میں تفسیری کہانی گڑھنے کی طرف مہمیز کر دیا وہ لفظ مدین ہے۔ یہی غلطی ہمارے مفسرین نے مدائن صالح کے تعلق سے بھی کی تھی۔ مدین سے مراد وہ جگہ نہیں جو جزیرۃ العرب میں مدین کہلاتی ہے۔ بلکہ مدین سے مراد دراصل اس تہذیب کی وہ خصوصیت ہے جسے پولس Polis کہتے ہیں جسے یونانی تاریخ میں عام طور پر City-State کہا جاتا ہے۔ یہ تہذیب دنیا میں اپنے Polis یعنی مدین یا مدینہ کے لیے مشہور تھی۔

## (۱) اصحاب لئکـــة :

قرآن کی تفسیروں اور پھر اس دروازے سے اسلامی علوم میں خرافات کے در آنے کی انتہا

وہ رویہ ہے جو آج اصول تفسیر کی شکل میں ہی نہیں بلکہ پورے علوم القرآن کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

قرآن نے اگر اصحاب لکتہ استعمال کیا ہے اور یہ بات مفسرین کی سمجھ میں کسی سبب سے نہیں آئی۔ تو بجائے اس کے کہ اسکی تفسیر کے لیے ان آیات پر جعلی واقعات کا لباس منڈھ دیا جاتا چونک جانے، غور و فکر کرنے اور تحقیق کرنے کی بات یہ تھی کہ یہ اس اللہ رب العزت کا کلام ہے جو کائنات کی ساری حقیقتوں اور تبدیلیوں کا علم رکھتا ہے۔ اس پر واقعات عالم سے جہل کا اطلاق عالم تصور میں بھی نہیں ہو سکتا لہٰذا قرآن میں مذکور کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم کائنات کے علوم اور چپے چپے کو کھنگال ڈالیں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر اللہ رب العزت نے اصحاب لکتہ ہی کیوں کہا۔ واقعات عالم اور معلوم تاریخ عالم سے قرآن سمجھنے کے بجائے طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ قرآن میں آئے ہوئے ایک ایک لفظ کو ستون مان لیا جائے جسے تھام کر ہم واقعات عالم کو سمجھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس طرح یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مخصوص زمانے میں واقعات عالم کو نہ کھنگال سکیں یا کھنگال کر حقیقت نہ پا سکیں لیکن اس بات کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے کہ تحقیق کے بجائے ذہن کے اختراع سے ایسے واقعاتی لباس تراش لیے جائیں اور قرآن کے ان تمام مقامات پر اسے منڈھ دیا جائے اور ایسا کرنے کے لیے یہاں تک جسارت کی جائے کہ اسے تفسیر بالماثور قرار دے کر اس کی تحقیق کو حرام قرار دے دیا جائے۔

چنانچہ عام طور پر جو بات اصحاب لکتہ کے تعلق سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ جھاڑیوں، درختوں یا بن کے رہنے والے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم شعیب کے تحت جن اصلی اور ذیلی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک لکتہ بھی ہے۔

لکتہ یا ائکتہ دراصل وہ قوم ہے جسے ایونی زبان (Ionic Language) میں اخائیو، اخائیون، اخائیوئے اور انگریزی میں (Achaeons) کہا جاتا ہے۔ اخائیوں ہر چند کہ یونانی کا مترادف ہے لیکن دراصل اس تہذیب اور قوم کا نام ہے۔ جو سب سے پہلے روس کے راستے سے پولینڈ (Poland)، سائیلسا (Silesia)، بوہیمیا (Bohemia)، بوئریا (Bavaria) ہوتے ہوئے یوروپ میں داخل ہونے والی قوموں کے ساتھ دراصل جنوب مشرقی یوروپ کے راستے سے شمالی یونان میں داخل ہوئی تھی یہ لوگ تاریخ میں اخائی یا اے خائی Achaean کہلائے۔

واضح ہو کہ میں نے Achaeo کو اخائی یا اے خائی لکھا ہے۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ اس لفظ

میں Ch کا درست تلفظ ایک ایسا صوتیہ ہے جو عربی کے ک، ق اور خ کے درمیان ہے نہ یہ عبرانی کی حیت کی طرح ہے نہ جرمن کے Ch کی طرح نہ ویلش Welsh کے Ch کی طرح۔

یہی اکیتہ دراصل یونانی اور یونانی تہذیب کے اوّلین نمائندہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد تہذیب میں نام، جگہ، زبان ہر چیز کی تبدیلی ہوئی۔ چنانچہ اکیتہ کے بعد دوریہ (Dorians) ان کے بعد مینویہ (Minoans) ان کے بعد ایولیویہ (Aeolians) اور پھر یونانیوں (Ionians) نے اس تہذیبی کرسی کو سنبھالا۔ ان کے بعد اس تہذیب نے وہ صورت اختیار کرلی جسے خالص مدنی، مدینی، مدینی تہذیب کہتے ہیں اور اس میں اسپارتا (Sparta)، کورنتھ (Corinth)، ایغوس وایجوس (Aegos)، ایتھنز (Athens)، تھیبس (Thebes)، افے سس (Ephesus) اور ملیٹس (Miletus) کی تہذیبیں سامنے آئیں۔

چنانچہ اس اعتبار سے قوم شعیب کا اطلاق عمومی اعتبار سے ان تمام تہذیبی سلسلوں پر ہوتا ہے جسے یونانی تہذیب کہتے ہیں۔ اور خصوصی طور پر یا تو صرف اصحاب ایکۃ پر یا پھر اس سے بھی قبل کی صورت حال پر ہوتا ہے۔ اس عاجز کا رجحان یہی ہے کہ یوں تو پوری یونانی تہذیب قوم شعیب کہلاتی ہے لیکن وہ قوم جس پر وہ عذاب آیا جس میں حضرت شعیب نبی نذیر کی طرح مبعوث ہوئے تھے اصحاب ایکۃ سے قبل کے لوگ ہی تھے۔ عذابات بعد میں بھی آئے جن کا ذکر اسی ذیل میں آتا ہے۔

## (۲) قوم تبع :

یہ دراصل تھیبن (Thebans) قوم ہے۔ جو تھیبائی (θηBai-wv-ai) (Thebes) میں رہتی تھی۔

## (۳) اصحاب الحجر :

یونانیوں کی تاریخ کے تسلسل کی یہ وہ کڑی ہے جب یونانیوں پر 546 قبل مسیح میں اہل فارس نے حملہ کردیا اور بڑی تعداد میں یونانی نقل مکانی کر کے جنوبی اٹلی اور سسلی میں آباد ہوگئے۔ اور وہاں ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی جو علوم اور فنی مہارت میں ترقی کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تہذیب تھی۔

زینوفین (Xenophanes) وہاں 545 ق م میں نقل مکانی کر کے پہنچا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب وہاں مابعد الطبیعات اور الٰہیات پر شہرۂ آفاق مباحثے شروع ہوئے۔ زینوفین کے بعد ایلیاتی مکتب فکر (Eleatic School) کے پرمینائڈس (Permanides) اس کے بعد ہیر قلیس (Heraclitus) نے اس علمی فضا کو اور مہمیز کر دیا۔ 530 قبل مسیح میں سامائی (Samian) پائتھاغورس (Pythagorus) وہاں پہنچا۔ یہاں اسی عہد میں اس عظیم الشان فن تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں ان معبدوں کی تعمیر ہونا شروع ہوئی جنہیں بطور خاص دورائی (Doric) کہا جاتا ہے۔ اس میں سے ایک جگہ اکراگاس (Acragas) یا ایگری جینٹم (Agrigentum) تھی۔ اس کے علاوہ سائیلنس (Silenus) اور پائستم (Paestum) تھی جہاں ایسے ہی شاندار فن تعمیر کے نمونے تھے۔ فن تعمیر کا یہ نمونہ اور اس جگہ قائم شہر دراصل اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے ایگری جینٹم مشہور ہوئے۔ لاطینی زبان (Latin) میں Ager, Agri کے معنی میدان اور Agger کے معنی قلعہ، اونچی جگہ، بلند ٹیلہ، بڑا بند یا کوئی بھی فلک بوس تعمیر کے ہوتے ہیں۔ اور یہ تہذیب اپنے Agger کے لیے مشہور تھی اور ان تعمیرات کو Agger کہا جاتا تھا۔

چنانچہ قرآن میں جنہیں اصحاب الحجر کہا گیا ہے وہ دراصل یہی مابعد انکہ کے یونانی تھے جن کی تہذیب ایگری تہذیب کے نام سے مشہور تھی۔

سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ کون سی جگہ ہے جہاں قرآن نے ان واقعات کی بڑی عجیب و غریب ترتیب قائم کی ہے جو خود قرآن میں کہیں اور نہیں ملتی۔ یعنی سب سے پہلے (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر (۲) پھر اسی کے ذیل میں حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر (۳) پھر ان کے ذیل میں اصحاب الایکۃ کا ذکر (۴) پھر اس کے ذیل میں اصحاب الحجر کا ذکر اور یہ بات صرف سورۃ الحجر میں پائی جاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت تدریج کے تناظر بیان میں کون لوگ ہیں؟ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جن کے لیے ان واقعات اور اسکے تسلسل میں Relevance ہو؟ بادی النظر میں آیت:۲ میں 'الذی کفروا' اور آیت:۶ میں 'قالوا یا یھا الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون' سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ یہ سورۃ قریش مکہ سے براہ راست مخاطب ہے لیکن بہت دقت نظر سے دیکھا جائے تو وہ تناظر بیان جو سورۃ الروم میں قائم کیا

گیا تھا در اصل بعد کا تناظر ہے اور اس سے ماقبل کے تناظر کا بیان یہاں ہے۔ یعنی الحجر کے تناظر کو نہ سمجھا جائے تو الروم کے تناظر کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے سامنے پوری دنیا کو ایک ہتھیلی پر رکھ کر دکھا دیا کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب قرآن کی آیات آنحضور ﷺ پر اترتی ہوں گی اور جب آپ ﷺ اس سے اصحاب کو باخبر کرتے ہوں گے اور جب نمازوں میں اس کی تلاوت ہوتی ہو گی تو ایسا لگتا ہو گا کہ ساری دنیا ان کی نظروں کے سامنے سمٹ آئی ہے۔

یہ پورا تناظر بازنطینی تناظر ہے بازنطینی سلطنت رومی سلطنت کی عیسائی وارث تھی اور وہ رومی سلطنت خود یونانی سلطنت کی وارث تھی۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ وہ عظیم یونانی تہذیب جس کا اب نام و نشان تک باقی نہیں ـــــ اور رومی جس کے وارث بنائے گئے اور اب تبدیلی مذہب کے بعد جو عیسائی رومیوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں بازنطینی کہا جاتا ہے ـــــ کیسے تباہ ہو گئی۔ کس طرح اس عظیم یونانی تہذیب نے اللہ اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی اور اپنی طاقت اور اقتدار کا استعمال ابلیس کی خدمت اور زمین پر سپر پاور بننے میں کیا۔ آج وہ تہذیب ختم ہو چکی ہے۔

چونکہ یہ تہذیب منفرد نوعیت کی تھی اور ایک تسلسل کے ساتھ طویل عرصے تک چلی اور اس دوران اس میں خیر و شر کی طویل کشمکش جاری رہی اس لیے قرآن نے اسے مخصوص اعتبار سے پیش کیا ہے۔ قرآن نے اس تہذیب کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے اور بطور خاص اس تہذیب کے اس دور کی خصوصیات سے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی اور جس میں حضرت شعیب علیہ السلام بطور نبی نذیر آئے کہ وہ کون سا عہد تھا۔ تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آخری سے پہلے کا دور ہے۔ یعنی وہ تکلیف دہ معرکۂ خیر و شر جو سن 2100 قبل مسیح سے جاری چلا آرہا تھا بالآخر اس وقت ایک بھیانک انجام کو پہنچا۔

قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرے میں بتائی گئی تفصیلات سے اس عاجز نے جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق 2100 قبل مسیح سے چلنے والا فاسد سلسلہ بالآخر 1500 قبل مسیح سے لے کر 1000 قبل مسیح کے درمیان اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ اغلب ہے کہ یہ واقعۂ عذاب وہی ہے جسے کریٹ (Crete) کے مینوآن تہذیب (Minoan Age) کا خاتمہ کہتے ہیں جو 1400 قبل مسیح کے قریب وقوع پذیر ہوا۔ تاریخ آج بھی محو حیرت ہے کہ اتنی عظیم

الشان اور اتنی خوشحال اور مال و دولت سے پر، سونے اور چاندی کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی تہذیب اور اس پر قائم ایسی سلطنت اور حکومت اچانک بلا سبب تاریخ کے نظارہ گاہ سے کیسے غائب ہو گئی۔[۴]

قرآن نے، جو تفصیلات بتائی ہیں انہیں ذیل میں اس طرح ملخص کیا جا سکتا ہے:

(۱) **فاوفوا الكيل والميزان ولا تبخسوا الناس اشياء هم ولا تفسدوا فى الارض بعد اصلاحها ذلكم خير لكم ان كنتم مومنين.** (الاعراف:۸۵)

ترجمہ: سو پوری کرو ماپ اور تول اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت فساد پیدا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

(۲) **ويقوم اوفوا المكيال والميزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشياء هم ولا تعثوا فى الارض مفسدين بقية الله خير لكم ان كنتم مومنين وما انا عليكم بحفيظ.** (ہود:۸۵۔۸۶)

ترجمہ: اور اے قوم! پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے اور نہ گھٹاؤ لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت مچاؤ زمین میں فساد جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے۔ اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان۔

(۳) **قالوا يشعيب اصلوتك تامرك ان نترك ما يعبد آباء نا وان نفعل فى اموالنا ما نشؤا انك لانت الحليم الرشيد.** (ہود:۸۷)

ترجمہ: بولے اے شعیب! کیا تیری نماز نے تجھ کو یہ سکھایا کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے قائدین چھوڑ دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں بڑھانے کے لیے تو ہی بار تا رہے نیک چلن۔

(۴) **قال يقوم ار، يتم ان كنت على بينة من ربى ورزقنى منه رزقاً حسناً وما اريد ان اخالفكم الى ما انهاكم عنه ان اريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقى الا بالله عليه توكلت واليه انيب ويقوم لا يجرمنكم شقاقى ان يصيبكم مثل ما اصاب قوم نوح او قوم هود او قوم صٰلح وما قوم لوط منكم ببعيد واستغفروا ربكم ثم توبوا اليه ان ربى رحيم ودود.** (ہود:۸۸۔۹۰)

ترجمہ: بولا اے قوم! دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے رب کی طرف سے اور اس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم

سے چھڑاؤں۔ میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بن آتا ہے اللہ کی مدد سے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔ اور اے قوم! نہ کمائیو میری ضد کر کے یہ کہ پڑے تم پر جیسا کہ پڑچکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر اور قوم لوط تو تم سے کچھ دور ہی نہیں۔ اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور رجوع کرو اس کی طرف البتہ میرا رب ہے مہربان محبت والا۔

(۵) ولاتقعدوا بكل صراط توعدون وتصدون عن سبيل الله من آمن به وتبغونها عوجاً واذكروا اذكنتم قليلاً فكثر كم وانظروا كيف كان عاقبة المفسدين۔ (الاعراف:۸۶)

ترجمہ: اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستہ سے اس کو جو کہ ایمان لائے اس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب اور یاد کرو جبکہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم کو بڑھا دیا اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔

(۶) وان كان طائفة منكم آمنوا بالذى ارسلت به وطائفة لم يؤمنوا فاصبروا حتى يحكم الله بيننا وهو خير الحكمين(الاعراف :۸۷)

ترجمہ: اور اگر تم میں سے ایک طبقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ میں بھیجا گیا اور ایک طبقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک اللہ۔ فیصلہ کرے درمیان ہمارے اور سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۷) قال الملاء الذين استكبروا من قومه لنخرجنك يٰشعيب والذين آمنوا معك من قريتنا او لتعودن فى ملتنا۔ (الاعراف:۸۸)

ترجمہ: بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں۔ ہم ضرور نکال باہر کریں گے۔ اے شعیب تجھ کو اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ ہمارے دین میں۔

(۸) قال اولوكنا كرهين۔ (الاعراف:۸۸)

ترجمہ: بولا کیا ہم بے زار ہوں تب بھی۔

(۹) قد افترينا على الله كذبا ان عدنا فى ملتكم بعد اذ نجٰنا الله منها۔ ومايكون لنا ان نعود فيها إلا ان يشاء الله ربنا وسع وبنا كل شئى علماً على الله توكلنا۔ (الاعراف:۸۹)

ترجمہ: بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے اور ہمارا کام نہیں کہ پلٹ

جائیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا۔

(۱۰) **ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق و انت خير الفتحين.** (الاعراف:۸۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۱۱) **وقال الملاء الذين كفروا من قومه لئن اتبعتم شعيباً انكم اذا لخسرون** (الاعراف:۹۰)

ترجمہ: اور بولے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو ہم بے شک برباد ہوں گے۔

(۱۲) **قالوا يٰشعيب ما نفقه كثيراً مما تقول وانا لنرك فينا ضعيفا ولولا رهطك لرجمنك وما انت علينا بعزيز.** (ہود:۹۱)

ترجمہ: بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھے۔ بہت باتیں جو تو کہتا ہے اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو تو ہم سنگسار کرا ڈالتے۔ اور ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں۔

(۱۳) **قال يٰقوم ارهطي اعز عليكم من الله واتخذتموه وراكم ظهريا ان ربي بما تعملون محيط.** (ہود:۹۲)

ترجمہ: بولا اے قوم! کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے اور اس کو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر تحقیق میرے رب کے قابو میں ہے۔ جو کچھ کرتے ہو۔

(۱۴) **ويقوم اعملوا على مكانتكم اني عامل سوف تعلمون من ياتيه عذاب يخزيه ومن هو كاذب ارتقبوا اني معكم رقيب.** (ہود:۹۳)

ترجمہ: اور اے میری قوم! کام کیے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں آگے معلوم کر لوگے کس پر آتا ہے۔ عذاب رسوا کرنے والا اور کون ہے جھوٹا اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک رہا ہوں۔

قرآن میں مذکور تفصیلات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) کریٹ میں قائم مینوان تہذیب (Minoan Civilizations) اپنے وقت کی عالمگیر طاقت تھی۔ اس کا اقتدار اس وقت بالعموم پائی جانے والی پوری انسانی دنیا پر تھا اور بالخصوص

پورے مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا، شمال مغربی افریقہ، جنوبی یوروپ اور بحیرۂ متوسط کے تمام علاقوں پر۔

(۲) مینوان تہذیب ایک معاشی سپر پاور (Economic Superpower) تھی۔

(۳) رفتہ رفتہ اس تہذیب نے معاشی استعماریت (Economic Imperialism) کی شکل اختیار کرلی تھی۔

(۴) پورا نظام بنیادی طور پر استحصالی بن گیا تھا۔ اور استحصال کے دو رخ تھے۔ خارجی اور داخلی ـــــ چنانچہ خارجی پہلو میں دیگر قوموں کا استحصال کیا جارہا تھا اور داخلی پہلو میں پورا نظام خود اپنے اندر بنیادی طور پر استحصالی ہو چکا تھا۔

(۵) اس استحصالی نظام کا انفرااسٹرکچر اپنے اندر کلی اور فردی (Macro & Micro) سطح پر پوری طرح استحصالی ہو چکا تھا۔

(۶) معاشی استحصال کے بالواسطہ اور بلاواسطہ جتنے شعبے تھے وہ سب نظام کا مستقل حصہ بن چکے تھے۔

(۷) اس استحصال کے مختلف طریقوں میں نمایاں ترین تین طریقے تھے:

(۱) سود کا نظام کے ہر شعبے میں داخل ہو کر حیات کو جکڑ لینا۔

(۲) معیشت کی آمدنی جہت (Income Side) کا کلی طور پر استحصالی ہو جانا۔

(۳) معیشت کی تقسیمی جہت (Distribution Side) کا کلی طور پر استحصالی ہو جانا۔

(۸) معیشت میں زہریلا دائرہ (Vicious Circle) کا راسخ ہو جانا اور استحصالی کے خلاف آواز اٹھانے یا اقدامات کرنے والوں کے خلاف طاقت کا استعمال ہونا۔

(۹) یہ استحصالی نظام محض داخلی اور انفرادی سطح پر نہیں بلکہ عالمی نظام کی سطح پر پھیل چکا تھا اور اس کے فساد کی شکل، رسوخ اور وسعت عالمگیر ہو چکی تھی۔

یہ تلخیص صرف اختصار کو مد نظر رکھ کر کی گئی ہے اور قرآن کی آیات کے تجزیے کا صرف حاصل پیش کر دیا گیا ہے ورنہ اگر اس کی تفصیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے اس مالی سپر پاور نظام کے ایک ایک فساد کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ اور کسی بھی غور کرنے والے پر پوری بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب روئے ارض پر کوئی معاشی استعماریت Economic Imperialism راسخ ہوتا ہے تو اس کا جبر اور استحصال کتنا ہمہ گیر اور ہولناک ہو جاتا ہے۔ قوم شعیب کی تفصیلات

جو قرآن میں بتائی گئی ہیں اس کا اندازہ کر کے آسانی سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ موجودہ Economic Order جو Globalization کے منازل تیزی سے طے کر رہا ہے جب چند سالوں کے بعد اپنی صحیح صورت میں جلوہ گر ہوگا تو اس کی ہیبت ناکی کیسی ہوگی۔

معاشی ہیبت ناکی سے الگ ہٹ کر اس تہذیب کی چند مخصوص باتیں بھی قرآن نے بتائی ہیں۔ جس کی طرف توجہ کی جانی چاہئے۔

(۱) جب اس سودی استحصالی نظام میں اسلام کی دعوت دی گئی اور اس کی بنیادوں پر معیشت کو استوار کرنے کی کوشش کی گئی تو اس استحصالی نظام سے وابستہ لوگوں نے اس کی آخری حد تک مخالفت کی۔ اور اس کے لیے جبر کا سہارا لیا۔ وہ سارے معاشی اور غیر معاشی طریقے مثلاً انتظامی، عدالتی اور تخریبی طریقے اختیار کیے گئے تاکہ اسلامی خطوط پر فلاحی کوششیں ناکام ہو جائیں۔

(۳) جو لوگ فلاحی طریقوں پر بطیب خاطر چلنا چاہتے تھے انہیں بہ جبر و تخویف مجبور کیا گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

(۴) فلاحی طریقوں پر چلنے والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ پھر سودی استحصالی کاروبار شروع کر دیں اور اس نظام کا حصہ ہو جائیں۔ معاشی اصطلاح میں فلاحی معاشی وسائل کو استحصالی مالی نظام سے الگ رکھنے کے بجائے اس قائم عالمگیر استحصالی معاشی نظام کا حصہ بنا دیئے جائیں جیسا کہ آج Globalization کے نام پر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کیا جارہا ہے۔

قرآن کے مطابق یہ صورت حال اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ استحصالی نظام کے ذمہ داروں نے فلاحی نظام اختیار کرنے والوں کے خلاف موت و حیات کی جنگ چھیڑ دی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس استحصالی نظام نے فلاحی نظام کے تمام معاشی اعمال (Economic Activities)، تمام مالی ملکیت (Economic Proprietership) اور مالی تبادلہ (Financial Exchange) کو جرم قرار دے دیا۔ اور اہل حق کے پاس کوئی صورت نہیں بچی کہ وہ زندہ بھی رہ سکیں۔ قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی بحرانی گھڑی آگئی جب اللہ کے رسول اور تمام اہل حق نے پیچھے ہٹنے، باطل سے سمجھوتہ کرنے، مداہنت کی روش اختیار کرنے، تاویل کر کے نظام باطل میں رہنے کا جواز پیدا کرنے۔ اور عرف و عادت کا سہارا لے کر باطلانہ نظام کو چور

دروازے سے اسلامی نظام میں داخل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور حق کی راہ پر ڈٹ گئے جس کے بعد نظام میں ایک ایسا بحران (Crisis) پیدا ہو گیا جہاں ایک طرف بظاہر بے بس اہل حق تھے اور دوسری طرف ہر طرح کی قہرمانی کے ساتھ نظام باطل۔ ٹھیک یہی گھڑی تھی کہ اللہ کے رسول نے دعا فرمائی۔

**ربنا افتح بيننا وبين قومنا بالحق وانت خير الفاتحين.** (الاعراف:۸۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے مابین حق کے مطابق فیصلہ فرمادے۔ بے شک تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا: قرآن کا بیان ہے:

**فاخذتهم الرجفة فاصبحوا فى دارهم جٰثمين الذين كذبوا شعيبا كان لم يغنوا فيها الذين كذبوا شعيبا كانوا هم الخٰسرين.** (الاعراف:۹۲)

ترجمہ: پھر آپکڑا ان کو زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے تباہ۔

## ابلیس کے تہذیبی معرکے کا جائزہ :

یہاں دو بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اس مختصر جائزے میں ہم نے ان چاروں تہذیبوں کا حال ان کے اطوار اور ان کا انجام دیکھا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اس عرصے میں ابلیس کی بنیادی حکمت عملی کیا رہی اور کس طرح اس نے اپنے نصب العین کے تحت طوفان نوح کے بعد اپنے مقاصد کے حصول کی کوششیں کیں۔

بہت دقت نظر سے دیکھا جائے تو ابلیس کی بنیادی حکمت عملی جہاں انسانوں اور جنوں کو الگ الگ منظم کرنے اور ان سے الگ الگ کام لینے کی رہی وہیں انسانوں سے کام لینے کے تعلق سے اس کی بنیادی حکمت عملی انتہاپسندی (Extremism) کی رہی۔

سوال یہ ہے کہ انتہاپسندی (Extremism) کیا ہے؟

ہر چیز کا ایک نام ہوتا ہے۔ عموماً یہ نام علانیہ یا غیر علانیہ طور پر اس شئے کے اندر پائی جانے والی بنیادی صفت کا عکس یا مظہر ہوتا ہے۔ مثلاً آدمی، جانور، کپڑا۔ یہی وہ بنیادی صفت ہے جو اسے

تشخص فراہم کرتی ہے۔ یعنی یہ آدمی ہے۔ یہ گھوڑا ہے۔ چنانچہ ایک ہی شخص بیک وقت گھوڑا اور آدمی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی گھوڑا آدمی اور آدمی گھوڑا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر تشخص کی حقیقت ایک صفاتی دائرے کی ہوتی ہے۔ یہ صفاتی دائرہ وہ حد ہے جس کے اندر کوئی اس تشخص کا مانا جاتا ہے مثلاً آدمی یا گھوڑا۔ آدمی کے تشخص کا ایک دائرہ ہے چنانچہ جو کوئی اس تشخص کے دائرے میں ہو خواہ وہ چھوٹا ہو یا لانبا، گورا ہو یا کالا ذہین ہو یا غبی، توانا ہو یا ناتواں، اندھا ہو یا بینا، غرض وہ کچھ بھی اور کیسا بھی ہو اگر وہ اس تشخص کے دائرہ میں ہے تو وہ آدمی کہلائے گا۔ اسی طرح گھوڑا اسی طرح کوئی بھی شئے۔

چنانچہ اس تشخص کے دائرے کا دوسرا نام 'حدود' ہے۔ چنانچہ انسان اور انسانیت کے لیے بھی حدود ہیں۔ جب اس تشخص کے دائرے کی باضابطہ شکل ہو جائے تو اسے حدود کہتے ہیں۔ یعنی 'حدود' اپنے اندر بڑی معنویت اور تعین رکھتے ہیں۔ چنانچہ حدود کے اندر کم از کم پانچ امور پائے جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) منصب (Goal)

(۲) مقصد (Purpose)

(۳) طریقۂ کار (Methodology or Way)

(۴) حد (Limit)

(۵) ضبط (Regulation)

جب کوئی تشخص کا دائرہ باضابطہ یعنی ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو اس میں یہ پانچ باتیں لازماً پائی جاتی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات میں جتنی چیزیں بشمول انسان کے پائی جاتی ہیں ان کے لیے حدود کون بناتا ہے یا بنا سکتا ہے؟

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اللہ رب العلمین کے سوا دنیا میں کوئی ایسی ذات یا وجود نہیں جو کسی شئے بشمول انسان کے حدود بنا سکے اس لیے کہ حدود کا بنانا کم از کم چھ صلاحیتوں کا متقاضی ہے:

(۱) وہ ذات جو چاہے کر سکتی ہے۔

(۲) وہ ذات سب کچھ جانتی ہے۔

(۳) وہ ذات سب کچھ سنتی ہے

(۴) وہ ذات سب کچھ دیکھتی ہے۔

(۵) وہ ذات ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

(۶) وہ ذات سب پر قدرت رکھتی ہے۔

چونکہ یہ ساری صفتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ صرف اور صرف اللہ رب العٰلمین کا اختیار خاص (Prerogative) ہے کہ وہ کائنات کی ہر شئے بشمول انسان کے 'حدود' کی تعیین کرے۔ اور اسی تعیین کا نام 'حدود اللہ' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر شئے کے حدود متعین فرمائے ہیں۔ انسان اس کی سب سے ارفع تخلیق ہے اور اس نے اس کے حدود بھی متعین فرمائے ہیں۔ یہی دین اللہ ہے۔

چنانچہ دین اللہ کے اس دائرے کے اندر کہیں بھی رہنا چاہے وہ محور سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو انتہا پسندی (Extremism) نہیں ہے۔ اصل انتہا پسندی یہ ہے کہ انسان "حدود اللہ" کو پھلانگ دے یا اس سے باہر چلا جائے۔

چنانچہ ابلیس کی بنیادی حکمت عملی اور حربہ اس حدود اللہ کو توڑنا ہے۔ بہت دقت نظر سے اگر غور کیا جائے تو اس حقیقت کو پایا جاسکتا ہے کہ اصلی انتہا پسندی تو ایک ابلیسی عمل ہے۔ اس کے برخلاف اللہ کے مومن بندوں کا 'حدود اللہ' کا پورا پورا لحاظ رکھنا اور اس کی جان کی قیمت پر بھی پابندی کرنا اور اسے کبھی نہ توڑنا انتہا پسندی نہیں بلکہ عین یہی وہ اعتدال پسندی ہے جو ایک مسلم کا شیوہ ہوتا ہے۔ مومن کبھی بھی 'حدد اللہ' کو جان بوجھ کر نہیں پھلانگتا اور اگر کبھی سہواً ہو جائے تو فوراً رجوع کرتا ہے۔ اور اس پر توبہ کرتا ہے۔ دوسری طرف شیطان کا بنیادی کام انسان کے تعلق سے اسی مقام سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا انسان ابلیس کے لیے بے کار ہے جو ہمیشہ حدود اللہ کی پاسداری کرے۔ چنانچہ ابلیس کی بنیادی ترغیب 'حدود اللہ' کو پھلانگ جانے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے بعد ابلیس نے انسانوں پر اسی بنیادی حربے کا استعمال کیا۔ اور اس نے چار ایسے نظاموں کے استوار کرنے کی ترغیب دلائی جو الگ الگ بنیادوں پر چار قسم کی انتہا پسندی (Extremism) کے حامل تھے۔

(۱) عاد : حکمرانی (سیاسی و عسکری) کی انتہا پسندی

[Administrative (Political & Martial) Extremism]

(۲) شرور : سائنسی و تکنیکی انتہاپسندی

[Sceintific & Technological Extremism]

(۳) قوم شعیب :معاشی ومالی انتہاپسندی

[Economic & Financial Extremism]

(۴) قوم لوط: جنسی واخلاقی انتہاپسندی [Sexual & Ethical Extremism]

ابلیس کی ترکیب اس انتہاپسندی کو انسانی معاشرے میں قائم کرنے کی عموماً یہ رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے فکری انتہاپسندی (Ideological Extremism) پیدا کراتا ہے۔ اور یہ فکری انتہاپسندی حکمرانی، سائنس اور ٹکنالوجی، معاشیات ومالیات یا جنس اور اخلاقیات کے شعبے میں کسی شخص یا اشخاص کے ذریعہ پیدا کروائی جاتی ہے۔ وہ شخص یا اشخاص سب سے پہلے 'حدود اللہ' کے جواز کو فکری طور پر چیلنج کرتے ہیں۔ یہ چیلنج دراصل 'اللہ' کے اختیار خاص (Prerogative) کو ہوتا ہے۔ اور دراصل وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ 'حدود' کی تعیین کا اختیار اللہ کو نہیں بلکہ مجھے، ہمیں یا میرے جیسے لوگوں کو ہے۔ تاہم ابلیس انہیں اس سوال کی طرف دیکھنے یا اس کا جواب دینے سے دور ہی رکھتا ہے کہ اس 'حدود' کے متعین کرنے والے کی صلاحیت کیا ہونی چاہئے اور حدود کو متعین کرنے والے مدعی کے پاس کم از کم چھ صلاحیتیں کیا ہونی چاہئیں اور کیا اس مدعی کے پاس وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کے فقدان میں کوئی نہ تو یہ حق رکھتا ہے کہ کسی شئے کے 'حدود' متعین کرے نہ ایسا کرنا عقلی طور پر درست ہوگا۔

چنانچہ ابلیس یہ جانتا ہے کہ اگر ایک انسان حقیقت پسند ہو کر اور کھلی آنکھ سے حقیقت کو دیکھے گا تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اسے اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک ابھارنے اور اس کا استعمال کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کی تمام چیزوں سے استفادہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ابلیس اس حقیقت تک اسے پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو انسان انفاقی علم کی طرف بڑھے گا۔ جو انبیاء کا علم ہے۔[۵] لہٰذا ابلیس انسان کو ہٹا کر اکتشافی علوم کی طرف لے جاتا ہے اور اسے باور کراتا ہے کہ اس کا سب سے اچھا استعمال اکتشافی علوم کو آگے بڑھانے میں ہے۔ چنانچہ ابلیس انفاقی حکمرانی کے علوم کے بجائے اکتشافی حکمرانی کے علوم کو پروان چڑھانے کی طرف مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی سائنس اور ٹکنالوجی کے

بجائے اکتشافی سائنس اور تکنالوجی کی طرف مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی معیشت و مالیات کے علوم کے بجائے اکتشافی معیشت اور مالیات کے علوم کو مہمیز کرتا ہے۔ انفاقی اخلاقیات کے علوم کے بجائے اکتشافی اخلاقیات کے علوم کو مہمیز کرتا ہے۔ لہٰذا جیسے ہی ان علوم میں انسانی صلاحیت لگنی شروع ہوتی ہے فساد پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور جس تہذیب میں جو شعبہ زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے اس کا فساد دیگر فسادات پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ عاد میں حکمرانی کا فساد، ثمود میں سائنس اور تکنالوجی کا فساد قوم شعیب میں معیشت و مالیات کا فساد اور قوم لوط میں جنس اور اخلاقیات کا فساد غالب تھا۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ان تہذیبوں کو غارت کر کے ابلیس کو کیوں ناکام کیا؟ کیا یہ عمل یک طرفہ (Arbitrary) نہ تھا؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اللہ کا یہ عمل قطعاً یک طرفہ نہ تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی راہ نہیں روکی۔ نہ یک طرفہ طور پر ابلیس کے خلاف آدم کی مدد کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کے بجائے اس نے ان انسانوں کو غارت کر دیا جنہوں نے 'حدود اللہ' کو نہ صرف پامال کیا تھا بلکہ اس انتہا کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ 'حدود اللہ' صرف اور صرف اللہ کا اختیار کلی ہے۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو دنیا کا کوئی بھی قانون اپنے زیر اختیار علاقے میں اس سے کمتر درجے پر حدود کو پھلانگ جانے والوں کو نہیں بخشتا بلکہ اس کا خاتمہ کر دینا ضروری سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو حدود اللہ کو پھلانگ جانے والوں پر آخری حجت پوری کر کے ہی یہ کارروائی کی۔

فرض کیا جائے کہ کوئی انسان دماغی طور پر پاگل ہو جائے اور لوگوں کو قتل کرنے لگے اور کسی طرح قابو میں نہ آئے تو دنیا کا قانون اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس پاگل کی مضرت سے معصوم انسانوں کو بچانا کیا یک طرفہ کارروائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل ان تہذیبوں کو ختم اس لیے نہیں کیا کہ وہ کوئی یک طرفہ کارروائی کر کے ابلیس کو شکست دے بلکہ یہ تہذیبیں اس لیے تباہ کر دی گئیں کہ انہوں نے ابلیسی انتہا پسندی کی راہ پر چل کر ان حدود کو پامال کر دیا تھا جن کے بعد ان کا بحیثیت انسان تشخص ہی ختم ہو جاتا ہے اور تشخص پر اعتبار کا نہیں حقیقت کا اطلاق ہوتا ہے۔

○○○

# حواشی

# Notes and References

## باب اوّل

## ضرورت عجالہ

### دوسرا سبب

(۱) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(1) Maurice Fleugel : The Humnanity, Benevolence and Charity Legislation of the Pentateuch and Talmud, Baltimore, 1908

(2) Ephraim Frisch : An Historical Survey of Jewish Philanthropy. New York 1924.

(۲) چونکہ اس عجالے میں اس کی تفصیلات میں جانے اور کسی تقابلی مطالعہ کی قطعاً گنجائش نہیں اس لیے تحقیق سے تعلق رکھنے والے قارئین کے لیے درج ذیل مصادر و منابع پیش کیے جاتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے تک بخوبی پہنچ سکتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے قیام کے لیے صدیوں سے چلی آرہی کوشش اور اب اس کی توسیع واستحکام کے پیچھے اصلی حقیقت کیا ہے:

(A) Old Testament - (1) Is $2^{2}$, $4^{5}$, $33^{20}$, 40, $65^{18}$, (2) Mic 4, (3) Jer $30^{18}$ (4) Zec2 (5) Ezk 40 (6) Am $9^{13}$ (7) Is $30^{23}$, $35^{1\,2\,7}$, $65^{17}$, $66^{22}$, (8) Hos $1^{10}$, $2^{18}$, (9) Zec $8^{12}$ (10) Ezk $34^{14\,27}$, $36^{9\,30\,35}$ (11) Ezk $^{47^{1}}$ (12)Hos $2^{18}$ (13) Is $11^{6}$, $35^{9}$, $65^{25}$ (14) Ezk $34^{25}$ (15)Is $30^{19}$, $35^{3}$, (16) Ezk $34^{16}$ (17) Is $35^{10}$, (18) Ezk $36^{26}$ (19) Zeph $3^{13}$ (20) Jer $31^{31}$

(B) (1) Gunkel : Schopfung Und Chaos, Gottingen ' 895

(2) Oesterley : Evolution of Messianic Ideas, London 1908

(3) Volz : Judaic Eschatology, Tobingen, 1903

(4) Hommel : Die Insel der Seligen im Mythus U. Sage der Vorzeit, Munich 1901

(5) Bouset : Anti-Christ, Berlin 1896

(۳) ملاحظہ فرمائیں:

(1) Basic Facts about the United Nations: DPI. 1995

(2) Charter of the United Nations and Statute of the International Court of Justice: DPI. 511.

(۴) حوالہ مذکور

(۵) ملاحظہ فرمائیں : Cecil Roth: The Jewish Contributions to the Civilization: Macmillan and Co. Ltd. London1938

(۶) ملاحظہ فرمائیں : حوالہ مذکور صفحہ: 321

(۷) ملاحظہ فرمائیں: Our Global Neighbourhood :

The Report of the Commission on Global governance; Oxford University Press, 1995 P- 333-334

(۸) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں حوالہ مذکور صفحات 335-348

(۹) ملاحظہ فرمائیں: Arnold Toynbee: A Study of History

(۱۰) ملاحظہ فرمائیں: Timothy Gartan Ash: Europe's Endangered Liberal Order; Foreign Affairs, Vol.77, No.2, March/April 1998.

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں :

(1) Jaswant Singh : The Lost Years

(2) K. Subrahmanyam :Back to Bhishma: Commonality into Indo-US Interests, The Times of India, April 3, 2000

(۱۲) ملاحظہ فرمائیں:حوالہ مذکور "Back to Bhishma" TOI, April3, 2000

(۱۳) ملاحظہ فرمائیں: سنن نسائی اور مسند احمد اور طبرانی

# دوسرا سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں : اسرار عالم :

(۱) بین الاقوامی ایجنسیوں کا تعارف اور ان کا طریقہ کار

(۲) عالم اسلام کی اقتصادی صورت حال

(۳) عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال

دار العلم، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

(۲) ملاحظہ فرمائیں: Max.I. Dimont: Jews, God and History, Chapter Seven - "United States: The New Babylon - Mentor Books 1994

(۳) ملاحظہ فرمائیں: Bernard E. Jones: Freemasons Guide and Compendium, George G. Harrap & Company Ltd. London. 1950 - P - 112 - 113

(۴) ملاحظہ فرمائیں : حوالہ مذکور صفحہ 517-521

(۵) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 516

(۶) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 526

(۷) ملاحظہ فرمائیں: Edward A. Tiryakian: American Religious Exceptionalism: A Reconsideration; Annals, AAPSS, 527, Sage Publications, Beverly Hills, London May 1993 P- 48 - 49

(۸) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 52

(۹) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ مذکور صفحہ 52-53

(۱۰) ملاحظہ فرمائیں: Dorothy Anne Lipson: Freemasonry in Federalist Connecticut, Princeton, NJ; PUP 1977-P-183

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: Lynn Dumenil : Freemasonry and American Culture 1880-1930 (Princeton, NJ,PUP1984

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں: Bruce M. Metzer & Michael D. Coogan: The Oxford Companion to the Bible; Oxford University Press,

NY. 1993

(۱۲) ملاحظہ فرمائیں : Gilles Kepel: The Revenge of God;
"Saving America"; Polity Press 1991

(۱۳) ملاحظہ فرمائیں : Hal Lindsey: The Late Great Planet
Earth; Grand Rapids, MI: Zondervan 1970

(۱۴) ملاحظہ فرمائیں: Thomas Mc Call & Zola Levitt:
Satan in the Sanctuary: Chicago, Moody, 1973

(۱۵) ملاحظہ فرمائیں: T. McCall & Z. Levitt : The Coming
Russian Invasion of Israel. Moody, Chicago. 1987

(۱۶) ملاحظہ فرمائیں : Grace Halsell: Forcing God's Hand:
Why Millions Pray for a Quick Rapture - and Destruction of Planet Earth; Crossroads International Publishing, Washington, 1999-131 PP.

(۱۷) ملاحظہ فرمائیں : (۱) غزوۂ روم: مسلم ، ابن ماجہ
(۲) الملحمۃ : ابوداؤد، ابن ماجہ
(۳) غدر روم: ابن ماجہ

## تیسرا سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں : (1) Al- Aqsa: Vol-2 No-2, April.2000
Leicester, "Seige on Al-Masjidul Aqsa-Haram Sharif.

(2) Haggai Segal: Dear Brothers : The West Bank Jewish Underground (Jerusalam): Beit Shamai, 1988

(۲) ملاحظہ فرمائیں: Gideon Aran: Jewish Zionist fundamentalism:
the bloc of the faithful in Israel
'Gush Emunim); unpublished Communications folio 5 as quoted by La Revanche de Dieu by Gelles Kepel, Editions de Deiu Sevil 1991.

(۳) ملاحظہ فرمائیں: الملحمۃ الکبریٰ یا العظمیٰ، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی

## چوتھا سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں : روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی: ۲۷ جون ۲۰۰۰ء

(۲) ملاحظہ فرمائیں : روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، ۳ جولائی ۲۰۰۰ء

## پانچواں سبب

(۱) ملاحظہ فرمائیں :

(1) Rushbrook Williams: The East Pakistan Tragedy

(2) D.N. Palit: Pakistan Cut to Size,

(3) Qutbuddin Aziz : Blood & Tears, Karachi : 1974

(4) بریگیڈیر صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی: حصہ سوم:۴۵۔۱۹۴۴، صفحات : ۱۰۔۱۲

(۳) ملاحظہ فرمائیں :

Basic Facts about the United Nations: NY 1995 P-3

(۴) ملاحظہ فرمائیں:

(1) Nuclear Weapons Data book:U.S. Nuclear Warhead Production; Vol II, Ballinger Publishing Compnay, Combridge, Massachusetts, 1984 - P-151.

(2) R.J. Lifton : Death in Life: Survivors of Hiroshima, Pelican, Harmondsworth, 1971,

(۵) ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی: روداد اجتماع دار الاسلام حصہ دوم، صفحات:۱۷۔۲۰

(۶) ملاحظہ فرمائیں :

(۱) مولانا جعفر تھانیسری : تواریخ عجیبہ

(۲) مولانا عبدالرحیم صادقپوری: تذکرۂ صادقہ

(۳) مولانا محمد علی قصوری صاحب: مشاہدات کابل ویاغستان

(۴) مولانا عبد اللہ لغاری ر غلام مصطفیٰ خاں: مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔

(۵) مولانا غلام رسول مہر: ۔۔سید احمد شہید
۔۔سرگزشت مجاہدین

(۶) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید

(۷) ملاحظہ فرمائیں : مسند احمد: روایت ابوذر الغفاری، جلد ۵، صفحہ: ۱۴۴
مطبوعہ آستانہ استانبول، ترکی

## باب دوم

(۱) ملاحظہ فرمائیں : بابلی ۔ (تلمود بابلی) باب۔ حجیجہ ۱۴ب

(۲) ملاحظہ فرمائیں: Abraham Isaac Kook, "Orot" in Arthur Hertzberg's The Zionist Idea, Garden City) N.Y. Double day, 1959.

(۳) ملاحظہ فرمائیں : تنک (عبرانی) : خوزأت قورن اروشلائم ۱۹۹۷

(۴) ملاحظہ فرمائیں :
Our Global Neighbourhood: Oxford University Press, 1995

(۵) ملاحظہ فرمائیں :
K. Rahner: Lexikon für Theologie und kirche (LTK) 1957-67,

(۶) ملاحظہ فرمائیں : .
K. FrÖr: Biblische Hermeneutik 2nd ed. 1964

(۷) ملاحظہ فرمائیں: Joseph A. Komonchak, Marry Collins & Dermot A. Lane; The New Dictionary of Theology; Publisher-Michael Glazier, Gill & Mac Millan Ltd. Dublin. 1987

(۸) ملاحظہ فرمائیں: Norman Perrin: Jesus and the Language of the Kingdom: Symbol and Metaphor in New Testament Interpretation, Philadelphia, Fortress, 1976

(۹) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:
(1) Johannes Weiss: Jesus Proclamation of the Kingdom of God, Philadelphia. 1971
(2) A. Schweitzer: The Mystry of the Kingdom of God,

The name of the Original German title: Das Messianitats und Leidensgeheimnis 1914

(۱۰) تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں C.H. Dodd: The Parables : of the Kingdom. 1935

(۱۱) ملاحظہ فرمائیں : H.B. Swete: The Apocalypse of St. John, Grand Rapids, Eerdmans 1951 P-275

(۱۲) ملاحظہ فرمائیں: Amos Elon: Jerusalem: City of Mirrors: Boston, 1989

(۱۳) ملاحظہ فرمائیں: John F. Walvoord: The Revelation of Jesus Christ, Chicago, Moody, 1966P-313

(۱۴) ملاحظہ فرمائیں: George E. Ladd: A Commentary on the Revelation of John, Grand Rapids, Eerdmans, 1972 P-276

(۱۵) ملاحظہ فرمائیں: Hanns Lilje: The Last Book of the Bible translated by Olive Wyon. Philadelphia; Muhlumberg, 1957 P-259

(۱۶) ملاحظہ فرمائیں: Martin Kiddle: The Revelation of St. John; (The Moffatt New Testament Commentary) London, Hodder & Stoughton, 1940. P-415-16

(۱۷) ملاحظہ فرمائیں: A.M. Hunter: Probing the New Testament; Richmond, VV: John Knox, 1971, P-156

(۱۸) ملاحظہ فرمائیں: احمد بن فارس (چوتھی صدی ہجری) نے لکھا ہے

تقول "سرکاتم" ای مکتوم وفی کتاب الله جل ثناؤہ" لا عاصم الیوم فی امرالله أی لا معصوم ومن "ماء دافق وعیشة راضیة" أی مرضیّ بها و "جعلنا حرماً آمناً أی مأموناً فیه"

ملاحظہ فرمائیں: الصاحبی فی فقه اللغة وسنن العرب فی کلامها لاحمد بن فارس المکتبة السلفیة، القاهره ۱۹۱۰ء

(۱۹) ملاحظہ فرمائیں: William A. Jurgens: The Faith of the Early Fathers: Back Title: Pope Paul VI Commends Patristic Studies, The Liturgical Press, Saint John's Abbey, College ville,

Minnesota 56321

(۲۰) ملاحظہ فرمائیں : Schism کی تعریف:

(1) Joseph A. Komonchak, Marry Collins & Dermot A. Lane: The New Dictionary of Theology, Dublin. 1987.

(2) Sacramentum Mundi. N.Y.

(۲۱) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، دار العلم، نئی دہلی۔ 2000

صفحات: ۲۷۔۸۰

(۲۲) ملاحظہ فرمائیں: Vatican Council: The Consiliar and Post - Conciliar Documents: Gen Ed. A. Flannery, 1975, Dublin Vol.I-P.320-85

(۲۲) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق صفحہ: 408-431

## باب سوم

(۱) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون: باب۔ ادراک کائنات، دار العلم، نئی دہلی، طبع ثانی فروری ۲۰۰۰ صفحہ ۱۹۔۲۰

(۲) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن، جلد اوّل: صفحہ: ۳۶۰، دار المعرفۃ، بیروت ۱۳۹۸ھ

(۳) ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد اور الدر المنثور روایت حضرت سفینہ

(۴) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد اوّل: صفحہ

(۵) ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق صفحہ (۱۵۹)

(۶) ملاحظہ فرمائیں: محمد الحاکم نیشاپوری، المستدرك على الصحيحين: كتاب الفتن والملاحم حدیث۔ ۱/۸۲۹۳

(۷) ملاحظہ فرمائیں: حافظ نو رالدین علی بن ابی بکر الهيثمي: بغية الرائد فی تحقیق مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: كتاب الفتن: باب ماجاء فی المسخ والقذف وارسال الشياطين والعواعق حدیث: ۱۲۵۸۵

(۸) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون: باب۔ کائنات خلق، دار العلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء

(۱۰) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون: ابواب۔ اسلام کا نظریۂ کائنات اور کائنات کا ربانی منصوبہ، دار العلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء

## باب چہارم

(۱) ملاحظہ فرمائیں: حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ: کلیات اقبال: بال جبریل: ذوق و شوق: بند ۵

(۲) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورتحال: محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون: باب کائنات کا ربانی منصوبہ: مرحلۃ الجنۃ: صفحہ ۱۰۸

(۳) ملاحظہ فرمائیں:

(1) J.D. Prince: Materials for a Sumerian Lexicon, Leipzig 1908

(2) L.A. Waddell: The Makers of Civilization in Race & History, Luzac & Co. London

(۴) ملاحظہ فرمائیں :

(1) N. Platon: Crete

(2) Woolley, L : A Forgotten Kingdom

(3) John. A. Garratey & Peter Gay: The Columbia History of the World, Harper & Row, NY. 1972

(3) J. Baikie; The Sea Kings of Crete, Mac Millan 1926.

(4) A. J. Evans: The Palace of Minos, Mac Millan 1921-1935 6 Vols.

(5) C.H. Hawes & H.B. Hawes: Crete: The Forerunners of Greece 1922.

(۵) ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال: محور اوّل: کتاب اوّل: ماکان ومایکون: باب۔ادراک کائنات۔دارالعلم، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء

○○○